جرم و سزا
انسپکٹر نواز خان کی جرم و سزا پر مبنی تفتیشی کہانیاں
پہلوان، پٹھا اور مریدنی
طاہر جاوید مغل

فہرست

پہلوان، پٹھا اور مریدنی

اس شہ زور پہلوان کا قصہ جو پنج پانیوں کی شان تھا۔ اکھاڑے کی مٹی نے اس کی کمر نہیں دیکھی تھی...... وہ جرم کے راستے پر چلا تو دہشت کی علامت بن گیا۔ اسے پکڑنا ایک چیلنج تھا...... یہ چیلنج نواز خان نے قبول کرلیا۔

امرتسر سے جالندھر کی طرف جائیں تو مین روڈ سے پندرہ بیس میل ہٹ کر ''جیون'' نامی گاؤں ہے۔ خالص دیہاتی علاقہ ہے۔ بجلی پانی تو دور کی بات ہے اُس زمانے میں وہاں سڑک کا بھی نام ونشان نہیں تھا۔ ایک نیم پختہ راستہ جسے ''پکی'' کہا جاتا تھا گاؤں سے قریباً چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یوں تو یہ ایک عام سا گاؤں تھا لیکن وہاں ایک خاص وجہ سے اردگرد کے علاقے میں اس کی بہت مشہوری ہوچکی تھی۔ یہ خاص وجہ دینو پہلوان تھا...... دینو پہلوان جس شخص کا نام تھا وہ کوئی ساڑھے چھ فٹ اونچا تھا۔ شانوں کی چوڑائی تین فٹ سے کچھ ہی کم ہوگی۔ رانوں جیسے بازو اور ستونوں جیسی رانیں، رنگ گندمی، گردن موٹی اور آنکھیں بے حد روشن۔ بڑا شاندار جسم تھا۔ دینو پہلوان کی عمر بتیس برس کے قریب ہوچکی تھی لیکن اس کی چمک دمک اب بھی چڑھتے سورج کی طرح تھی۔ ''پکی'' کے قریب ایک بہت بڑا اکھاڑہ تھا۔ ہر دو ڈھائی مہینے بعد یہاں ایک بڑا دنگل ہوتا تھا۔ اردگرد کے دیہات سے چھوٹے بڑے پہلوان پہنچتے تھے۔ ڈگا بجتا تھا اور خوب زور آزمائی ہوتی تھی۔ مجھے جیون کے تھانے میں تعینات ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے اور اس دوران میں ''پکی'' پر ہونے والے تین دنگل دیکھ چکا تھا۔ پہلا دنگل تو میں اپنی مرضی سے دیکھنے چلا گیا تھا۔ پھر مجھے مجبوراً جانا پڑا تھا۔ علاقے کے ڈی سی صاحب کشتیوں کے شوقین تھے اور اکثر دنگل ملاحظہ کرنے آتے رہتے تھے۔ وہ بتائے بغیر چپکے سے آجاتے تھے لہٰذا ڈی ایس پی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں دنگل کے موقع پر ''پکی'' پہنچ جایا کروں۔

تین دنگل دیکھنے کے بعد اب مجھے بھی کشتیوں میں مزہ آنے لگا تھا اور چیدہ چیدہ پہلوانوں کے نام مجھے یاد ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ کون کس کا پٹھا ہے۔ کس پہلوان کا تعلق کس دف سے ہے اور کون کون سے خلیفے اس اکھاڑے میں معتبر سمجھے

جاتے ہیں......اب یہ بات مجھ پر واضح ہو چکی تھی کہ دینو نہ صرف اس اکھاڑے کا بلکہ اردگرد کے کئی اکھاڑوں کا مانا ہوا پہلوان ہے اور چھوٹے بڑے تمام پہلوان اسے استاد کا درجہ دیتے ہیں۔ یوں تو دینو پہلوان کے کئی پٹھے تھے لیکن ان میں شہباز بجلی نام کا ایک نوجوان زیادہ مشہور تھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اتفاقاً ابھی تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

انہی دنوں جیون کے گلی کوچوں میں ایک گرما گرم خبر گشت کرنے لگی۔ جدھر دیکھو یہی بات ہو رہی ہے جس وقت دیکھو یہی موضوع چھڑا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ ضلع جالندھر کے ایک اُٹھتے ہوئے پہلوان وچن سنگھ نے دینو کو مقابلے کی دعوت دی ہے۔ پہلوانی زبان میں اسے ''مانگنا'' کہتے ہیں یعنی وچن سنگھ نے دینو پہلوان کو مانگا ہے۔ دینو نے بھی یہ دعوت قبول کر لی تھی اور اب فروری کے دوسرے ہفتے میں یہ کشتی ''پکی'' کے اکھاڑے میں ہونا تھی۔

کشتی ہونے میں ابھی دو ماہ باقی تھے لیکن دونوں پہلوانوں نے زور و شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ عام لوگوں میں بھی جوش و خروش کی لہر دوڑنے لگی۔ دینو پہلوان ہر صبح گاؤں کے اکھاڑے میں زور کرتا۔ ایک دن صبح سویرے میں سیر کو نکلا تو اسے دیکھنے گیا۔ وہ اکیلا تین پہلوانوں سے کشتی لڑ رہا تھا۔ تینوں بُری طرح ہانپ چکے تھے لیکن دینو تازہ دم دکھائی دے رہا تھا۔ بڑا شاندار جسم تھا اس کا۔ آدمی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ بھرپور جوانی میں وہ کیسا ہوگا۔ دینو کے مقابلے میں وچن سنگھ کم عمر تھا۔ اس کی عمر بائیس تیئس سال بتائی جاتی تھی۔ یعنی وہ دینو سے قریباً دس سال چھوٹا تھا۔ ایک طرح سے یہ تجربے اور شہ زوری کا مقابلہ تھا۔ وچن سنگھ کو دیکھنے والے بتاتے تھے کہ وہ فولادی بازوؤں والا ایک بے انتہا پھرتیلا پہلوان ہے۔ پھرتی اور طاقت نے مل کر اسے ناقابل شکست بنا دیا ہے اور ابھی تک اس نے اکھاڑے میں ایک بھی شکست نہیں کھائی۔ وچن سنگھ کے ایک دو داؤ بڑے مشہور تھے۔ ان میں ایک داؤ یہ تھا کہ وہ حریف کی گردن اپنے داہنے بازو میں کس لیتا تھا اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا تھا جب تک حریف بے دم نہیں ہو جاتا تھا۔

دھیرے دھیرے دونوں پہلوانوں کی تیاریاں عروج پر پہنچ گئیں اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کا جوش و خروش بھی انتہا کو چھونے لگا۔ دونوں پہلوانوں کے حمایتی بڑے بڑے دعوے کرنے میں مصروف تھے۔ آخر خدا خدا کر کے مقابلے کا دن آ پہنچا۔ یہ اوپن ایئر مقابلہ تھا۔ نہ سٹیڈیم نہ کوئی ٹکٹ، کھلا اکھاڑہ تھا اور تماشائیوں کا جمِ غفیر۔ سینکڑوں ہی تماشائی تھے۔ لوگوں نے چھوٹے بچوں کو کندھوں پر چڑھا رکھا تھا۔ قریبی درختوں پر بے شمار افراد چڑھے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ڈھولوں پر ''ڈگا'' لگایا جا رہا تھا اور اکھاڑے کے منتظمین لوگوں کو بڑی بڑی

قسمیں دے کر گھیرا کھلا کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ پہلے چھوٹے جوڑ ہوئے۔ لڑکوں اور نوخیز پہلوان نے اپنی طاقت کے جوہر دکھائے۔ پھر چند بڑے جوڑ ہوئے اور آخر میں دونوں نامی گرامی پہلوان میدان میں اُتر آئے۔ دیکھنے میں دونوں پہاڑ نظر آتے تھے۔ ایک تجربے اور فن کا نچوڑ، دوسرا طاقت اور ہوشیاری کا نمونہ۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بہ نفسِ نفیس تماشائیوں میں موجود تھے۔

کشتی کا آغاز ہوا۔ دونوں پہلوانوں نے ایک دوسرے کے جسم پر مٹی ملی۔ پھر ایک دوسرے کی گردن پر زوردار ہاتھ مارے۔ اسے کسوٹا مارنا کہتے ہیں۔ کسوٹے کا مقصد مقابل پہلوان کی طاقت کا اندازہ لگانا ہوتا تھا۔ کسوٹے کے بعد داؤ پیچ شروع ہوئے۔ پہلے دونوں پہلوان پھونک پھونک کر قدم رکھتے رہے۔ پھر انہوں نے دلیرانہ حملے کئے۔ ایک مرتبہ وچن سنگھ نے دینو کو اُٹھا کر پٹخا۔ دو مرتبہ دینو نے اسے منہ کے بل گرایا۔ ہر بار تماشائیوں نے فلک شگاف نعرے لگائے۔ وچن سنگھ نے ابھی تک کسی اکھاڑے میں شکست نہیں کھائی تھی۔ لہٰذا بہت سے تماشائیوں کے دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ وہ وچن سنگھ کو کشتی ہارتے دیکھیں۔ خاص طور پر مسلمان تماشائی تو دل و جان سے دینو کی فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ کشتی شروع ہونے کے دس منٹ بعد دینو نے اچانک وچن سنگھ کو آگے رکھ لیا اور اسے سینے کے زور سے زبردست رگڑے دینے لگا۔ دینو کے حمایتی ''شاوا جواناں'' اور یا علیؓ کے نعرے بلند کرنے لگے۔ دینو نے مسلسل دس منٹ تک وچن کو نیچے رکھا لیکن اسے چت نہ کر سکا اور پھر اچانک وہ بات ہوگئی جس کی کسی نے توقع بھی نہیں کی تھی۔ اپنا دفاع کرتے کرتے وچن سنگھ اچانک بجلی کی طرح تڑپا۔ دینو اس کے اوپر سے ہوتا ہوا عین اکھاڑے کے وسط میں گرا اور اس کے ساتھ ہی اس کی گردن وچن کے آہنی شکنجے میں آگئی۔ یہ وچن کی سب سے خطرناک پکڑ تھی۔ اکھاڑے کے کنارے بیٹھے تجربہ کار خلیفوں نے واہ واہ کے نعرے بلند کئے اور ان میں سے کچھ کے چہرے بُری طرح لٹک گئے۔ گردن قابو میں آتے ہی دینو نے خود کو چھڑانے کے لئے زبردست کوشش کی۔ وہ وچن کو اٹھا کر کئی گز آگے لے گیا لیکن پھر نڈھال سا ہو کر گھٹنوں کے بل گر گیا...... اگلے آدھ گھنٹے میں اس نے سرتوڑ جدوجہد کی لیکن گردن چھڑانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی حالت بڑی پتلی تھی۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ آخر وچن سنگھ نے بڑی پھرتی کے ساتھ دھوبی پٹکے جیسا ایک داؤ مارا اور دینو کو عین ڈی سی صاحب کے قدموں میں چت کر دیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ دینو کی چھاتی پر بیٹھا ست سری اکال کے نعرے لگا رہا تھا۔ اکھاڑے میں جیسے طوفان آ گیا۔ وچن

کے حمایتیوں نے ناچ ناچ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ وچن کو پھولوں کے ہاروں سے لاد کر کندھوں پر چڑھایا گیا اور اکھاڑے کے چکر لگائے گئے۔ اس جیت پر مختلف زمینداروں کی طرف سے وچن سنگھ کو انعامات بھی دیئے گئے جن میں ڈی سی صاحب کا انعام مبلغ پانچ سو روپیہ بھی شامل تھا۔

دینو کے لئے یہ دہرا صدمہ تھا ایک تو وہ کشتی ہارا دوسرے اس کی گردن بھی ناکارہ ہوگئی۔ اس کی گردن پر زبردست چوٹ آئی تھی' نیم بے ہوشی کی حالت میں اسے امرتسر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا فریکچر ہوگیا ہے۔ بروقت طبی امداد سے دینو پہلوان کی جان تو بچ گئی لیکن گردن دوبارہ سیدھی نہ ہوسکی...... پورے ایک ماہ بعد جب وہ ہسپتال سے گاؤں واپس آیا تو اس وقت بھی اس کی گردن ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔

☆======☆======☆

انہی دنوں گاؤں میں ایک تازہ خبر گشت کرنے لگی۔ یہ خبر اتنی تیزی سے ابھری اور پھیلی کہ اگلے پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا کہ بلال شاہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے کمرے میں آیا۔ چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''کچھ سنا ہے آپ نے کیا ہوا۔ دینو پہلوان کا پٹھا شہباز پہلوان گاؤں واپس آ گیا ہے اور آتے ساتھ ہی اس نے وچن سنگھ کو چیلنج کر دیا ہے۔'' بلال شاہ یہ خبر ایسی دلچسپی سے سنا رہا تھا جیسے وہ خود بھی کوئی خلیفہ رہا ہو اور وچن سنگھ کو ہرانا اس کی زندگی کا نصب العین ہو۔

میں نے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہم یہاں کشتیاں کرانے نہیں امن و امان قائم رکھنے آئے ہیں۔ لہٰذا آپ اس طرف اتنا زیادہ دھیان نہ دیں۔''

وہ بولا۔ ''خان صاحب! ماحول کا اثر تو بندے پر ہوتا ہی ہے ناں۔ خود آپ پر بھی اثر ہوا ہے۔ کتنے دنگل دیکھ چکے ہیں آپ؟''

میں نے کہا۔ ''دنگل دیکھنا میری ڈیوٹی میں آ گیا ہے۔ اس لئے چلا جاتا ہوں لیکن تمہاری کون سی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے وہاں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تم ایک نوجوان پہلوان کو اپنا پٹھا بتا رہے ہو اور کہتے پھرتے ہو کہ تم اسے دنگل لڑاؤ گے۔''

وہ شرمسار سا ہو گیا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ ''جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں خلیفہ بن کر کیا کروں گا۔ وہ تو ویسے ہی کرموں جٹ کے لڑکے کے ساتھ ہنسی مذاق ہے۔ میں اسے مذاق میں اپنا پٹھا کہتا ہوں۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''یہ شہباز پہلوان وہی ہے ناں جسے دینو کا سب

سے لائق شاگرد کہا جاتا ہے۔''

''ہاں جی۔'' بلال شاہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''بڑا سوہنا جوان ہے جی۔ قد کاٹھ بھی بالکل اپنے استاد جیسا ہے۔ رتی بھر فرق نہیں۔ ساڑھے چھ فٹ سے کم قد نہیں ہوگا اور چھاتی تو جیسے لاہور قلعے کی دیوار ہے۔ اس وقت بڑے غصے میں ہے وہ...... کہتا ہے جب تک استاد کی شکست کا بدلہ نہیں لوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ آج صبح میں نے اسے گاؤں کے اکھاڑے میں زور کرتے دیکھا ہے۔ بندے کو یوں اچھال کر پھینک دیتا ہے جیسے سنگترے کا چھلکا ہو۔ میرے سامنے اس نے چار پہلوانوں سے کشتی لڑی ہے مگر مجال ہے کہ پیروں کے علاوہ کہیں اکھاڑے کی مٹی لگی ہو اسے۔''

بلال شاہ شہباز پہلوان کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ شہباز اب تک تھا کہاں؟''

بلال شاہ بولا۔ ''کچھ پتہ نہیں جی۔ سنا ہے کہ استاد دینو پہلوان کسی بات سے اس پر ناراض تھا۔ ان میں تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ پھر شہباز گاؤں سے غائب ہو گیا۔ پچھلے چھ سات ماہ میں اس نے کوئی خاص کشتی بھی نہیں لڑی۔''

بلال شاہ نے جو اطلاع دی تھی وہ حرف بہ حرف درست نکلی۔ شہباز پہلوان نہ صرف گاؤں واپس آ چکا تھا بلکہ آتے ساتھ ہی اس نے وچن سنگھ جالندھر والے کو مقابلے کی دعوت بھی دے دی تھی۔ وچن سنگھ نے دعوت قبول کر لی تھی اور ٹھیک ایک ماہ بعد ''پکی'' کے اکھاڑے میں کشتی ہونا طے پائی تھی۔

کشتی کی تاریخ طے ہوتے ہی دونوں پہلوان تیاریوں میں جت گئے۔ لوگوں کا جوش و خروش اس دفعہ دوگنا تھا۔ ہر طرف یہ خبر پھیل گئی کہ شہباز پہلوان اپنے استاد دینو کی گردن توڑنے والے وچن سنگھ سے مقابلہ کرے گا۔ دونوں پہلوان ہر طرح جوڑ کے تھے۔ وچن سنگھ کی عمر تیئیس سال اور شہباز کی عمر قریباً چوبیس سال تھی۔ وزن بھی قریباً برابر ہی تھا۔ ہاں شہباز نکلتے قد اور متوازن جسم کا مالک تھا جبکہ وچن سنگھ گٹھے ہوئے جسم کا اور چوڑا چکلا تھا۔ وچن کے بازوؤں میں فولاد کی سی قوت تھی اور اس کے شکنجے میں آئی ہوئی گردن لیموں کی طرح نچڑ جاتی تھی۔ دوسری طرف شہباز بھی حوصلے کا پہاڑ تھا۔ اسے شہباز بجلی بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے حریف کے نیچے ہو یا اوپر ایک سی مہارت سے داؤ استعمال کرتا ہے۔ ایک دم اپنے حریف کو یوں اچھال کر دور پھینک دیتا ہے جیسے سچ مچ کرنٹ مار دیا ہو۔ میں نے ایک دو مشہور خلیفوں سے اس کے بارے میں سنا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ پہلوان

لنگوٹ کا پکا رہے اور اپنا ریاض جاری رکھے تو عنقریب پورے پنجاب میں اس کی ٹکر کا پہلوان نہیں ملے گا۔

مقابلے کے روز اکھاڑے میں دور دور تک لوگ نظر آ رہے تھے۔ حسبِ معمول شروع میں چھوٹے جوڑ ہوئے..... پھر بڑے جوڑوں نے طاقت کے جوہر دکھائے..... دل دھڑک رہے تھے اور شدت سے بڑی کشتی کا انتظار تھا لیکن ڈی سی صاحب ابھی تک نہیں پہنچے تھے اور ان کی آمد سے پہلے بڑی کشتی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کشمکش میں ساڑھے پانچ بج گئے۔ آخر خدا خدا کر کے ڈی سی کی سیاہ جیپ نظر آئی۔ ان کے ساتھ ایک ایس پی صاحب اور ایک سول جج بھی تھے۔ راستے میں جیپ خراب ہونے سے انہیں تاخیر ہو گئی تھی۔ بہرطور ان کے پہنچتے ہی بڑی کشتی شروع کرا دی گئی۔

میں نے پہلی بار شہباز پہلوان کو جانگیے میں دیکھا۔ اس کا جسم جیسے فولاد میں تراشا ہوا تھا۔ چھاتی، کندھوں اور بازوؤں پر بے تحاشا بال تھے۔ چہرے سے سخت گیر نظر آتا تھا لیکن جب بولتا تھا تو پتہ چلتا تھا کہ اس کے اندر ایک خوبصورتی یا کشش سی موجود ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں جیسے ایک خاموش طوفان پل رہا تھا۔ دونوں پہلوان آمنے سامنے ہو کر قہرناک نظروں سے ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ جسموں پر مٹی ملی گئی اور پھر کشتی کا آغاز ہوا۔ یہ دو جوان پہلوانوں کی کشتی تھی لہٰذا بڑی تیزی سے شروع ہوئی۔ چند لمحوں کے لئے کچھ پتہ نہیں چلا کیا ہو رہا ہے۔ پھر نظروں نے کام کیا تو تماشائیوں نے شہباز کو وچن سنگھ کے نیچے پایا۔ وہ اوندھا پڑا تھا اور اپنی گردن وچن سنگھ کی خونی گرفت سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کنارے پر بیٹھے خلیفہ حضرات چیخ چیخ کر اپنے اپنے پہلوان کو ہدایت دے رہے تھے۔ بازو پکڑو، ٹانگ کھینچو، پٹشک، نوندر قلع جنگ، پتہ نہیں وہ کیا کیا الفاظ استعمال کر رہے تھے..... کشتی طول پکڑ رہی تھی اور اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً شہباز نے یاعلیؓ کا نعرہ لگایا اور ایک جھٹکے کے ساتھ وچن سنگھ کے نیچے سے نکل آیا۔ بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے وچن کو اوندھا کیا اور اس کی کمر پر یوں بیٹھ گیا کہ اس کا چہرہ وچن کے پیروں کی طرف تھا۔ وچن کی دونوں ٹانگیں شہباز کے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ وہ ٹانگیں اوپر اُٹھا کر کمر پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ یہ بڑا خطرناک داؤ تھا۔ وچن سنگھ کی کمر ٹوٹ سکتی تھی۔ ایک سول جج صاحب چلاتے ہوئے اکھاڑے میں داخل ہو گئے اور وچن کو شہباز کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے لیکن شہباز فیصلہ کن داؤ لگا چکا تھا اور اب حریف کو چت کر دینا چاہتا تھا۔ شاید وچن سنگھ ہار مان لیتا اور اس موقع پر زیادہ مزاحمت نہ کرتا تو وہ حادثہ پیش نہ آتا جو آیا اور

اکھاڑے کی مٹی کو انسانی خون سے رنگین کر گیا۔ وچن سنگھ نے خطرناک داؤ میں پھنس کر بھی اندھا دھند زور لگایا نتیجے میں اس کی کمر درمیان سے گنے کی طرح ٹوٹ گئی اور وہ اکھاڑے کے عین وسط میں گر کر تڑپنے لگا۔ وہ بازی ہار چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی بازی بھی ہار چکا تھا۔ تاہم فوری طور پر کسی کو اندازہ نہیں ہوا کہ یہ چوٹ اتنی خطرناک ثابت ہو گی۔ شہباز کی جیت کے فلک شگاف نعروں کے دوران آزمودہ کار استاد آگے بڑھے اور انہوں نے لحیم شحیم وچن سنگھ کو اُٹھا کر بٹھانے کی کوشش کی۔ تکلیف کی شدت سے وچن سنگھ بے ہوش ہو گیا اور اس کا جسم بُری طرح جھٹکے کھانے لگا..... ٹھیک دو ماہ پہلے جو شخص اسی اکھاڑے میں اپنے حریف کی گردن بازو میں دبوچے بڑھکیں مار رہا تھا اب زندگی اور موت کی دہلیز پر تڑپ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وچن سنگھ کی آنکھیں تارے لگ گئیں..... وہ مر چکا تھا لیکن بہت سے لوگ ابھی اس بات سے بےخبر تھے۔ وہ وچن سنگھ کو ہسپتال لے جانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ڈی سی صاحب کی جیپ اکھاڑے کے اندر لائی گئی لیکن کئی من وزنی لاش کو اُٹھا کر جیپ میں ڈالنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اسی دوران اکھاڑے میں داخل ہونے والا سول جج ہری کرشن سنگھ زور زور سے چلانے لگا۔

"یہ قتل ہے۔ گرفتار کرو اس حرامی کو..... کہاں ہے وہ؟" پھر جج صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ ڈانٹ کر بولے۔ "تم اِدھر کھڑے کیا منہ دیکھ رہے ہو۔ اس کو پکڑو..... یہ پولیس کیس ہے..... پکڑو اسے۔"

جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ جج صاحب جالندھر سے ہی آئے تھے اور ان کا شمار وچن سنگھ کے خاص چاہنے والوں میں ہوتا تھا۔ اس دوران ایس پی نے بھی مجھے اشارہ کر دیا کہ میں مخالف پہلوان کو غائب نہ ہونے دوں۔ میں نے تیزی سے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ شہباز کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنے سب انسپکٹر اور حوالدار سے کہا کہ وہ شہباز پہلوان کو دیکھیں۔ ہم نے جلدی جلدی مجمع کو کھنگالا لیکن شہباز وہاں نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہمیں حرکت میں آتے دیکھ کر ہی وہاں سے نکل گیا ہے۔

اکھاڑے میں وچن سنگھ کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میری نگاہوں میں اب بھی کبھی کبھی وہ منظر گھوم جاتا ہے۔ جب میں نے دیوہیکل وچن کو مٹی میں ہاتھ پاؤں پھینکتے اور دم توڑتے دیکھا تھا۔ بڑا دہشت ناک نظارہ تھا۔ وچن سنگھ کی جان پہچان جالندھر کے اعلیٰ پولیس افسروں میں تھی۔ وہ خود بھی کچھ عرصہ پولیس کی نوکری کر چکا تھا۔ اس کی موت پر جالندھر کے کئی تھانوں کی پولیس حرکت میں آ گئی۔ وچن سنگھ کی موت کے تین روز بعد نہال

سنگھ نامی ایک انسپکٹر میرے پاس پہنچا۔ وہ جالندھر سے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے شہباز پہلوان کی گرفتاری پر مامور کیا گیا ہے۔ (شہباز پہلوان پر قتلِ عمد کا پرچہ پہلے روز ہی میرے تھانے میں کٹایا جا چکا تھا) میں نے انسپکٹر نہال سنگھ کو پورے تعاون کا یقین دلایا اور کہا کہ میں اور میرا عملہ ہر طرح اس کی مدد کریں گے...... مگر نہال سنگھ کا رویہ پہلے دن سے ہی مخالفانہ تھا۔

وہ ایک اکھڑ مزاج تھانیدار تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت چوڑے چوڑے تھے اور مقابلے میں سر مختصر تھا۔ وہ پنجابی مثال اس پر صادق آتی تھی "سر وڈے سرداراں دے تے پیر وڈے گنواراں دے۔" غصہ اس میں بے پناہ تھا۔ تفتیش کے پہلے روز ہی وہ شہباز پہلوان کے گھر والوں کو پکڑ کر امرتسر ہیڈ کوارٹر لے گیا۔ گھر والوں میں شہباز کی ماں کے علاوہ اس کی دو جوان بہنیں بھی تھیں۔ مردوں کی غیر موجودگی میں عورتوں کو پکڑ کر تھانے لے جانا ایک نہایت گھٹیا حربہ تصور کیا جاتا تھا لیکن نہال سنگھ جیسے تھانیدار اکثر اس بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس واقعے سے گاؤں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ گاؤں کے معزز افراد نے فیصلہ کیا کہ اگر ایک دو روز تک گاؤں کی عورتوں کو چھوڑا نہیں گیا تو انگریز ایس پی کی رہائش گاہ پر جلوس لے جایا جائے گا۔ حالات خراب ہو سکتے تھے لہٰذا اگلے ہی روز میں امرتسر پہنچا اور ہیڈ کوارٹر میں نہال سنگھ سے ملاقات کی۔ شہباز پہلوان کی والدہ اور بہنوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ کل سے انہیں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ تھانیدار نہال سنگھ ان سے فحش زبان میں باتیں کرتا ہے اور اس نے انہیں تھپڑ بھی مارے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات دس بجے کے قریب نہال سنگھ "گروالی دروازے" سے ایک نوجوان لڑکی پکڑ کر لایا ہے۔ اس لڑکی کا نام نجمہ ہے۔ نہال سنگھ کا خیال ہے کہ یہ لڑکی چوری چھپے شہباز سے ملتی تھی۔

مجھے نہال سنگھ کی تیز رفتاری پر حیرانی ہو رہی تھی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس نے نہ صرف شہباز کی محبوبہ کا سراغ لگایا تھا بلکہ اسے تفتیش میں بھی بٹھا لیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ واقعی کوئی ایسا کارنامہ انجام دے چکا ہے۔ میں اس سے ملا تو وہ بدستور لڑکی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ لڑکی کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ درمیانہ سا قد، رنگ البتہ گورا تھا۔ وہ ایک نرسنگ کالج میں پڑھتی تھی اور کالج ہی کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ نہال سنگھ کا خیال تھا کہ وہ شہباز پہلوان سے ملتی ہے اور دونوں میں ناجائز تعلقات قائم ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی شہباز پہلوان سے ملنے دو مرتبہ سپیشل لاہور جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک مرتبہ گاؤں بھی گئی تھی اور اس بات کی گواہی شہباز کی ماں اور بہن بھی دے سکتی ہیں۔ اس لڑکی کی خاطر شہباز پہلوان نے تین ماہ پہلے لاہور میں ایک

شہری غنڈے کو تھپڑ مار کر اس کا جبڑا توڑ ڈالا تھا اور یہ کیس ابھی تک عدالت میں ہے۔

میں نے حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ شکل و صورت، قد کاٹھ، بول چال غرض ہر لحاظ سے ایک معمولی لڑکی تھی۔ اس کی خاطر شہباز پہلوان جیسا آدمی لوگوں کے جبڑے توڑے گا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لڑکی کا مؤقف سننا بھی ضروری سمجھا۔ نہال سنگھ کو آنکھ مار کر میں نے تھوڑی دیر کے لئے باہر بھیج دیا اور بڑے نرم ملائم لہجے میں لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ نہال سنگھ سے بہت ڈری ہوئی تھی۔ بار بار قسمیں کھا رہی تھی کہ اس کا شہباز پہلوان سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اسی طرح اس کی عزت کرتی ہے جس طرح دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ میں نے اس سے پوری تفصیل پوچھی تو وہ بتانے لگی۔

"شہباز پہلوان کو میں نے سب سے پہلے امرتسر کے ہسپتال میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔ گجرات کے ایک گوجر پہلوان سے اس کی کشتی ہوئی تھی۔ شہباز کی دو انگلیاں چیری گئی تھیں۔ وہ مرہم پٹی کرانے ہسپتال آیا تھا۔ میں نے ہی اس کی مرہم پٹی کی تھی۔ اس کے بعد چار پانچ دفعہ اس سے ہسپتال میں ہی ملاقات ہوئی۔ میں اس کی عزت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی بات میرے دماغ میں آ ہی نہیں سکتی اور نہ شہباز پہلوان کے دماغ میں ہے۔ وہ اکثر مجھے "بہن" کہہ کر بلاتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ لاہور جانے والا کیا معاملہ ہے؟"

وہ بولی۔ "میں خاص طور پر شہباز پہلوان سے ملنے لاہور نہیں گئی تھی۔ مجھے وہاں ایک دفتری کام تھا۔ اچھرے کی طرف جانا ہوا۔ مجھے معلوم تھا آج کل پہلوان بھی اُدھر ہی ہوتا ہے۔ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ میں یونہی اس کی طرف چلی گئی۔ وہ وہاں چوہدری کریم نامی شخص کے ڈیرے پر رہتا تھا۔ ڈیرے پر دو تین آدمی اور بھی موجود تھے۔ ان کے سامنے ہی شہباز پہلوان سے سلام دعا ہوئی۔ میرا چھوٹا بھائی بھی ساتھ تھا۔ پہلوان نے ہمیں چائے وغیرہ پلوائی۔ ہم جب ڈیرے سے واپس آ رہے تھے تو ایک تنگ سی گلی میں دو لڑکوں نے مجھے چھیڑا۔ وہ صورت سے ہی چھٹے ہوئے غنڈے لگتے تھے۔ میں نے ایک لڑکے کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ وہ دونوں مجھ پر پل پڑے اور کپڑے پھاڑنے لگے۔ اتنے میں پہلوان بھی وہاں پہنچ گیا۔ پہلوان یہاں نیا نیا آیا تھا اور کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا۔ لڑکوں نے بھی نہیں پہچانا۔ ورنہ وہ اس کو گریبان سے کیوں پکڑتے۔ پہلوان غصے میں آ گیا۔ اس نے ایک لڑکے کو سر سے بلند کر کے گندی نالی میں پھینک دیا اور دوسرے کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس واقعے کے بعد لاہور میں صرف ایک مرتبہ پہلوان سے ملاقات ہوئی۔

پہلوان نے میرے لئے اتنی بڑی مصیبت مول لی تھی میرا فرض تھا کہ سوکھے منہ سے اس کا شکریہ ادا کردوں۔ لاہور میں جب دفتری کام ختم ہوا تو امرتسر آنے سے پہلے میں دس پندرہ منٹ کے لئے پہلوان سے ملنے گئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی حسنین اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔

میں نے نجمہ سے مختلف سوالات کئے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد نہال سنگھ ارنے بھینسے کی طرح دندناتا ہوا پھر اندر آ گیا۔ وہ بالکل بھینسے ہی کی طرح نتھنے پھلا پھلا کر لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوسرے کمرے میں لے آیا۔

''ہاں کیا کہتی ہے؟'' نہال سنگھ نے بے رخی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ تو بھائی بہن کا رشتہ بتا رہی ہے۔''

اس نے لڑکی کو ایک غلیظ گالی دی اور بولا۔ ''بڑے رشتے دیکھے ہیں ایسے۔ چکر دے رہی ہے اُلو کی پٹھی۔ یار ہے اس کا یار...... اور کچھ نہیں ہے۔''

''لیکن اس لڑکی میں مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی۔ عام سی شکل صورت ہے۔ پہلوان نے مرنا ہی تھا تو کسی چیز پر مرتا۔''

وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''عام سی شکل صورت ہے لیکن لڑکی تو ہے ناں۔ عورتوں والے سارے ہتھیار ہیں اس کے پاس اور جب ہتھیار پورے ہوں تو مرد کا ستیاناس کر دیتی ہے یہ عورت ذات...... اس معاملے میں تمہارا تجربہ مجھ سے بہت کم ہے۔'' میں نے دل میں کہا۔ ''اس میں شبہے والی کون سی بات ہے۔'' نہال سنگھ کھڑکی سے منہ نکال کر کسی ماتحت کو آوازیں دینے لگا۔ ''غلام بخشا...... او غلام بخشا اندر آ...... بات سن ذرا۔''

چند لمحے بعد ایک پکی عمر کا ہیڈ کانسٹیبل ڈھیلی ڈھالی وردی پہنے اندر داخل ہوا، کھٹاک سے سیلوٹ کرنے کے بعد بولا۔ ''جی صاحب۔''

نہال سنگھ بولا۔ ''اس کا نام غلام بخش ہے۔ تمہارے ہی تھانے کے پاس پکی کا رہنے والا ہے۔ پکی کے اکھاڑے کی ساری خفیہ اور ظاہر باتیں اسے معلوم ہیں۔'' پھر وہ غلام بخش سے مخاطب ہوا۔ ''بتا اوئے غلام بخشا۔ کیا بات مشہور ہے اس چڑی پہلوان کے بارے میں۔'' چڑی پہلوان سے اس کی مراد شہباز پہلوان تھا۔

غلام بخش نے نیچے لٹکی ہوئی مونچھوں کو ڈبل مروڑا دیا اور بولا۔ ''جناب! میں نے کئی بندوں سے سنا ہے کہ امرتسر میں شہباز پہلوان کی کوئی معشوق رہتی ہے۔ شہباز پہلوان اکثر

اس سے ملنے امرتسر میں آتا رہتا ہے۔ بات اتنی ہی کہوں گا جی جتنی معلوم ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں لگاؤں گا۔ پتہ نہیں وہ لڑکی سکھ ہے یا مسلمان لیکن ہے ضرور۔ تھوڑا بہت پڑھی لکھی بھی ہے۔ اس کا لکھا ہوا ایک خط پہلوان کی جیب سے گر گیا تھا اور گاؤں کی چوپال میں پرکاش مستری کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ پرکاش مستری نے ابھی ایک دو سطریں ہی پڑھی تھیں کہ پہلوان کو پتہ چل گیا۔ پہلوان نے خط چھین کر بڑے زور کا گھونسا پرکاش کو مارا تھا۔ وہ گھونسا کھا کر پرکاش کئی روز خون کی الٹیاں کرتا رہا تھا۔ ٹھیک ہوا تو گاؤں سے ایسا غائب ہوا کہ اب تک کسی کو نظر نہیں آیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ نجمہ نامی لڑکی اس کی معشوقہ ہو سکتی ہے؟''

وہ بولا۔ ''جی غائب کا علم تو خدا ہی جانتا ہے۔ بہرحال یہ کڑی بھی پڑھی لکھی ہے۔ امرتسر کی رہنے والی ہے اور پہلوان سے لاہور جا جا کر ملتی بھی رہی ہے۔ یہ جس کالج میں پڑھتی ہے وہاں کی لڑکیاں بڑی تیز طرار ہیں۔ اللہ معافی دے جی، کچھ بھی کر سکتی ہیں۔''

میں نے کہہ سن کر بڑی مشکل سے نجمہ نامی اس لڑکی کی جان انسپکٹر نہال سنگھ سے چھڑائی اور اسے واپس نرسنگ کالج کے ہاسٹل میں بھجوا دیا۔ تاہم انسپکٹر نہال سنگھ پہلوان کی والدہ اور بڑی بہن کو چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ پہلوان مفرور ہے۔ ماں بہن کی مصیبت کا سن کر ہو سکتا ہے وہ اپنی گرفتاری دے دے۔ اس نے وعدہ کیا کہ پہلوان کی والدہ اور بہن کو پولیس ہیڈ کوارٹر میں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔

میں پہلوان کی چھوٹی بہن کو لے کر گاؤں واپس آ گیا۔ لوگ کافی برہم تھے۔ میں نے گاؤں کے نمبردار، ماسٹر، پٹواری سمیت چند معزز افراد کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کریں۔ مظاہرے کرنے یا شور شرابے سے معاملہ سدھرنے کی بجائے بگڑے گا۔ شہباز کی والدہ اور بڑی (شادی شدہ) بہن پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایس پی صاحب کی زیرِ نگرانی ہیں اور ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا گیا۔

تیسرے چوتھے روز مجھے ایک اہم خبر ملی اور میری پریشانی نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ امرتسر ہیڈ کوارٹر سے آنے والے ایک محرر کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ انسپکٹر نہال سنگھ کو شہباز پہلوان کا کھوج ملا ہے۔ اس کے مخبروں نے اسے بتایا ہے کہ پہلوان اپنے ایک دوست کے پاس کپور تھلہ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اب انسپکٹر نہال ایک چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ کپور تھلہ روانہ ہو رہا ہے اور پہلوان کی ماں بہن کو بھی ساتھ لے جا رہا ہے۔

بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ نہال سنگھ کی جلد بازی سے معاملہ

بہت بگڑ جائے گا۔ نہال سنگھ ناک کی سیدھ میں چلنے والا شخص تھا۔ اس کی تفتیش کے طریقے وہی گھسے پٹے پرانے تھے۔ اس نے پہلوان کی فوری گرفتاری کو اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا اور وہ کامیابی کے لئے ہر قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈا استعمال کرنے کے لیے تیار تھا۔ اب اس سے بڑھ کر غیر قانونی ہتھکنڈا اور کیا ہوگا کہ وہ پہلوان کو گرفتار کرنے کی مہم میں اس کی ماں اور بہن کو چارے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ محرر واپس امرتسر جا رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی نہال سنگھ کے لئے ایک خط لکھا اور محرر کے حوالے کر دیا۔ اس خط میں مَیں نے محتاط لفظوں میں نہال سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور لکھا تھا کہ وہ اپنی اور ملزم کی جان خطرے میں نہ ڈالے۔ اگر پہلوان کا کھوج لگ گیا ہے تو ہم حکمت سے اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کوئی ہوشیار واردتیا نہیں جو ہمیں جُل دے کر نکل جائے۔ سیدھا سادا بندہ ہے۔ اسے ایک گولی چلائے بغیر بھی قابو کیا جا سکتا ہے۔ میں نے خط میں یہ بھی لکھا کہ میں شام سے پہلے امرتسر پہنچ جاؤں گا اور ہم اکٹھے کپورتھلہ چلیں گے۔

میرا خط دوپہر کے فوراً بعد انسپکٹر نہال کو مل گیا لیکن وہ بہت جلدی میں لگتا تھا۔ میرے خیال میں اسے خطرہ تھا کہ میں بھی چھاپہ مار پارٹی میں شامل ہو گیا تو کامیابی کا سہرا اکیلے اس کے سر نہیں بندھ سکے گا۔

میں شام کو امرتسر ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ بلال شاہ بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم ہیڈ کوارٹر پہنچے تو وہاں کچھ سراسیمگی کی حالت نظر آئی۔ سب چہرے دھواں دھواں تھے۔ یہ خبر ایک دھماکے کی طرح ہمارے کانوں میں گونجی کہ کپورتھلہ میں انسپکٹر نہال سنگھ سمیت تین پولیس والے پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گئے ہیں اور ملزم شہباز پہلوان اپنے زخمی ساتھی سمیت فرار ہو گیا ہے۔ ہم سکتے کی کیفیت میں رہ گئے۔ کتنی ہی دیر اس اطلاع پر یقین نہیں آیا۔ قدرت بھی انسان کو کیا تماشے دکھاتی ہے۔ کبھی شکار کے لئے نکلنے والے خود شکار ہو جاتے ہیں اور کبھی سازش کا تانا بانا بننے والے خود اپنی چالاکی سے مات کھا جاتے ہیں۔ اس اندوہناک حادثے کی تفصیلات جو ہمیں معلوم ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ نہال سنگھ اور اس کی پارٹی پر ایک باڑے کے اندر سے فائرنگ کی گئی۔ مویشیوں کا یہ باڑا ایک ویران جگہ پر گھنے درختوں کے اندر تھا۔ انسپکٹر نہال سنگھ نے اس مقام کی ناکہ بندی کر لی اور ملزم شہباز پہلوان کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے جواب میں اندر سے اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ ملزم باڑے کی چھت پر کھڑے تھے اور پولیس پارٹی ان کے عین نشانے پر تھی۔ فائرنگ ہوتے ہی پہلی دو گولیاں نہال سنگھ کی چھاتی پر لگیں اور وہ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے پاس ہی شہباز کی ماں اور بہن کھڑی تھیں۔

وہ چیختی ہوئی بھاگیں اور ایک بیل گاڑی کے پیچھے چھپ گئیں۔ پھر دونوں طرف سے تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ پولیس پارٹی نے ملزموں کو گھیرے میں لے لیا اور مزید کمک کا انتظار کرنے لگی۔ تاہم کمک کے پہنچنے سے پہلے پہلے پولیس کے دو اور جوان ہلاک ہو گئے۔ افراتفری کا فائدہ اُٹھا کر ملزم موقعہ سے فرار ہو گئے۔ بعد میں جائے واردات کے معائنے سے اندازہ ہوا کہ شہباز پہلوان کا ساتھی اس فائرنگ میں زخمی ہوا ہے۔

چند ہی دنوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ وہ شہباز پہلوان جو بدمعاشی کے نام سے بھی ناآشنا تھا۔ جو کسرت کرتا تھا، خوراکیں کھاتا تھا، جسم بناتا تھا اور کشتیاں لڑتا تھا۔ جس کی زندگی اکھاڑے سے شروع ہو کر اکھاڑے پر ختم ہو جاتی تھی۔ ایک بالکل ہی نئے راستے پر چل نکلا تھا۔ وہ اب ایک ہر دلعزیز پہلوان نہیں مفرور قاتل تھا۔ دیکھا جائے تو یہ حادثہ اَن گنت زمانوں سے گزرتا چلا آ رہا تھا۔ ہر دور میں کسی شہباز پہلوان اور کسی نہال سنگھ کا ٹکراؤ ہو جاتا تھا۔ پھر شریف شہریوں میں ایک کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور بدمعاشوں کی آبادی میں ایک کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی اب تک لاتعداد مرتبہ دہرائی جا چکی ہے اور ابھی معلوم نہیں کتنی مرتبہ دہرائی جائے گی۔

تین پولیس اہلکاروں کا قتل ایک سنگین واقعہ تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ شہباز پہلوان کو جلد از جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا جائے۔ ایس پی صاحب کی ہدایت پر فوراً ایک چھاپہ مار پارٹی ترتیب دی گئی۔ اس میں میرے علاوہ ایک انسپکٹر سجیت سنگھ اروڑا اور ایک سب انسپکٹر بھی شامل تھا۔ ہمارے پاس دو بڑی جیپیں تھیں۔ پارٹی میں کل اٹھارہ افراد تھے۔ یہ سب کے سب مسلح اور اپنے کام میں ماہر تھے۔ ہم رات آٹھ بجے امرتسر ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوئے اور دو بجے کے قریب اس ویران ڈیرے پر پہنچ گئے جہاں شام کو ایک خونی مقابلہ ہوا تھا۔ یہ ڈیرہ عام آبادی سے کافی ہٹ کر تھا۔ چاروں طرف گھنے درخت تھے۔ موقعہ پر پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں اور سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ہم اندر پہنچے تو گیس لیمپوں کی روشنی میں مقامی ایس ایچ او اپنی کارروائی مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ جائے واردات کا نقشہ تیار کیا جا رہا تھا اور گولیوں کے خول وغیرہ اکٹھے کئے جا رہے تھے۔ ایس ایچ او نے ہمیں وہ کمرہ دکھایا جس کی چھت پر سے ملزموں نے اندھا دھند فائرنگ کی تھی اور وہ جگہ بھی دکھائی جہاں انسپکٹر نہال سنگھ کو گولیاں لگی تھیں۔ یہاں تین مربع فٹ کی جگہ میں خون پھیلا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک کچی دیوار پر گولیوں کے بے شمار نشان نظر آ رہے تھے۔ ایس ایچ او نے ہمیں بتایا کہ ملزم جدید خودکار رائفل سے مسلح تھے جب کہ اس کے ساتھی کے پاس بارہ بور کی دونالی رائفل تھی۔ میں

نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں پہلوان کے ساتھی کو گولی لگی تھی۔ خون کی ایک لمبی لکیر چھت سے شروع ہو کر کھیتوں تک چلی گئی تھی۔ کھیتوں میں پہنچ کر پہلوان نے غالباً اپنے ساتھی کو کندھوں پر اُٹھا لیا تھا۔ یہاں سے آگے خون کی لکیر نہیں تھی۔ بس کہیں کہیں خون کا کوئی دھبہ نظر آ جاتا تھا۔ ملزم کا خون جس تیزی سے بہا تھا صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شدید زخمی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں زیادہ دور نہیں جا سکے ہوں گے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ وہ سب شش و پنج میں تھے۔ درحقیقت پولیس مقابلے کے بعد ملزم جس علاقے میں غائب ہوئے تھے وہ کسی چھوٹے موٹے جنگل سے کم نہیں تھا۔ اب کا تو پتہ نہیں لیکن ان دنوں کپور تھلہ کا یہ نواحی علاقہ بے حد غیر آباد تھا۔ نہ کوئی سڑک نہ راستہ، میلوں تک آبادی کا نشان نہیں تھا۔ مفرور ملزموں کے لئے یہ جگہ جنت سے کم نہیں تھی۔ وہ مہینوں تک یہاں حفاظت سے چھپے رہتے تھے اور موج میلہ بھی کر لیتے تھے۔ چرس، افیون، شراب اس علاقے میں عام مل جاتی تھی۔ کہیں کہیں خانہ بدوشوں کی بستیاں بھی تھیں۔ ان خانہ بدوشوں کو حرام کی چاٹ لگ چکی تھی۔ وہ چھٹانک چرس یا ایک دیسی ریوالور کے بدلے اپنی عورت کو کسی بھی غیر مرد کے ساتھ رات بھر کے لئے بھیج دیتے تھے۔

اس علاقے میں رات کے وقت دو مفرور قاتلوں کو تلاش کرنا ایک خطرناک کام تھا۔ تین اہلکاروں کو قتل کرنے کے بعد شہباز پہلوان اب کسی بھی شخص کو گولیوں کی باڑ پر رکھ سکتا تھا۔ مناسب تو یہ تھا کہ صبح کا انتظار کیا جائے لیکن یہ خطرہ بھی تھا کہ صبح تک ملزم دور نکل جائے گا۔ سوچ بچار کے بعد میں نے فوری کارروائی کا فیصلہ کیا۔ میری تیاری دیکھ کر ساتھی انسپکٹر اور سب انسپکٹر بھی تیار ہو گئے۔ ہم نے پارٹی میں سے چھ ہوشیار جوان منتخب کئے اور انہیں اپنے ساتھ اگلی صف میں رکھ لیا۔ باقی دس افراد کو نیم دائرے کی شکل میں اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ ہمارے ہاتھوں میں طاقت ور ٹارچیں تھیں مگر ایک کے سوا تمام ٹارچیں بجھا کر رکھی گئیں۔ زخمی کے خونی دھبوں کو تلاش کرتے ہوئے ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے...... ڈیرے سے قریباً تین فرلانگ آگے ہمیں ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ کچھ فاصلے پر لالٹینوں کی روشنی اور لوگوں کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ رات کے اس پہر اس ویران مقام پر یہ شور کیا معنی رکھتا تھا۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے۔ تھوڑی دیر بعد لالٹین بردار لوگ ہمارے قریب پہنچ گئے۔ ان کی تعداد پندرہ بیس سے کم نہیں تھی۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں اور چھویاں تھیں۔ پانچ چھ آدمیوں نے ایک چارپائی کندھوں پر اُٹھا رکھی تھی اور اس پر ایک شخص بے ہوش پڑا تھا...... یہ تمام افراد صورت اور لباس سے خانہ بدوش نظر آتے تھے۔ وہ سب بہت بپھرے ہوئے اور

جلدی میں تھے۔

ہمیں دیکھ کر انہوں نے چارپائی نیچے رکھ دی اور آپس میں تیز تیز لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ ان میں ایک شخص عمر رسیدہ تھا اور سب سے معتبر بھی نظر آتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بابا؟''

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ بات آپ کے سامنے دھری ہے مائی باپ۔''

اس کا اشارہ چارپائی کی طرف تھا۔ میں نے ٹارچ جلا کر غور سے دیکھا۔ چارپائی پر ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کے سفید سر پر ایک بڑی پٹی بندھی ہوئی تھی اور خون رِس رِس کر اس کی ڈاڑھی کے سفید بالوں کو رنگین کرتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو تم لوگ اور یہ زخمی کون ہے؟''

جواب میں معتبر شخص نے بتایا کہ وہ قریب ہی ایک خیمہ بستی میں رہتے ہیں اور یہ بوڑھا شخص رشتے میں اس کا بھائی ہے۔ آج شام دو ڈاکو اسے زخمی کر کے بھاگ گئے ہیں۔ میں نے اس واقعے کی تفصیل پوچھی تو مندرجہ ذیل بات کا پتہ چلا۔

زخمی ہونے والے کا نام سائیں رنگو تھا۔ وہ آج کپور تھلہ سے سودا سلف لے کر واپس آ رہا تھا۔ وہ اپنے ریڑھے پر سوار تھا اور ساتھ میں اس کی بہو بھی تھی۔ بہو اور سسر بستی سے کوئی ایک میل دور تھے جب اچانک جھاڑیوں سے دو آدمی نکل آئے۔ ان میں ایک زخمی تھا اور دوسرا بہت بھاری تن و توش والا کوئی پہلوان نما شخص تھا۔ پہلوان کے ہاتھ میں ولایتی رائفل تھی۔ اس نے رائفل تان کر سائیں رنگو کا ریڑھا رکوا لیا اور بہو سسر کو نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ سائیں کی بہو تو چیختی ہوئی فوراً نیچے اُتر آئی لیکن رنگو ریڑھے پر کھڑا رہا۔ وہ سمجھ گیا کہ دونوں افراد اس سے ریڑھا چھیننا چاہتے ہیں اور یہی ریڑھا اس کی کل پونجی تھی۔ پہلوان نے زخمی کو اُٹھا کر ریڑھے پر رکھا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا کر سوار ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کی راسیں سائیں رنگو سے چھیننے کی کوشش کی تو سائیں مزاحمت کرنے لگا۔ اسی دوران گھوڑا تیزی سے بھاگنا شروع ہو گیا تھا۔ پہلوان نے سائیں رنگو کو چلتے ریڑھے سے اُٹھا کر نیچے پھینک دیا...... سائیں کا سر ایک درخت سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی بہو ننگے پاؤں بھاگتی بستی میں پہنچی اور اس واقعے کی اطلاع دی۔ وہاں سے آٹھ دس بندے آئے اور زخمی کو اُٹھا کر بستی میں لے گئے...... ان کا خیال تھا کہ سائیں رنگو جلد ہی ہوش میں آ جائے گا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ سائیں کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ اب اس کی جان لبوں پر آ گئی تھی اور وہ اسے اُٹھا کر ہسپتال لے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مقامی تھانے میں پرچہ بھی درج کرانا

چاہتے تھے۔ بوڑھے نے پھر بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کیسا انصاف ہے مائی باپ! ہم لوگوں سے تو آپ چاقو چھریاں تک چھین لیتے ہو اور ان خونیوں ڈکیتوں کو ولایتی رائفلیں دے کر آزاد چھوڑ دیتے ہو۔ ہم کو بھی جندہ رہنے کا حق ہے۔ ہمارے ساتھ یہ جلم مت کرو۔"

میں نے خانہ بدوشوں کے اس جتھے کو سب انسپکٹر درویش علی کے ساتھ فوراً ڈیرے کی طرف روانہ کر دیا۔ ڈیرے پر تین چار جیپیں موجود تھیں۔ ان میں سے کسی ایک جیپ پر زخمی رنگو کو ہسپتال پہنچایا جا سکتا تھا۔ میں نے درویش علی کو ہدایت کی کہ وہ ہیڈ کوارٹر والی دونوں جیپیں لے کر واپس یہاں پہنچ جائے۔ سب انسپکٹر درویش علی نے میری ہدایات پر عمل کیا...... کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ ایک حوالدار کے ساتھ تین جیپیں لے کر واپس آ گیا۔ خانہ بدوشوں سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس مقابلے کے بعد پہلوان اپنے زخمی ساتھی کو لے کر شمال کی طرف گیا ہے۔ ظاہر ہے زخمی کو فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ یہ امداد اسے قریبی قصبے سے حاصل ہو سکتی تھی۔ کپورتھلہ کے اس نواحی قصبے کا نام اب میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ یہاں نہر پر ایک بڑا سائفن تھا۔ محکمہ آبپاشی کی چند عمارتوں کے علاوہ ایک ہسپتال بھی تھا۔ میں نے ساتھی انسپکٹر سجیت سنگھ اروڑا سے مشورہ کیا اور فیصلہ ہوا کہ فوراً ہسپتال کا رخ کیا جائے۔ عین ممکن تھا کہ ساتھی کی جان خطرے میں دیکھ کر شہباز اسے کسی طرح ہسپتال پہنچا گیا ہو، یا ویسے ہی ہسپتال کے دروازے پر ریڑھا کھڑا کر کے غائب ہو گیا ہو۔

ہم جیپوں پر حتی الامکان رفتار سے ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ فاصلہ تقریباً پانچ میل کا تھا لیکن راستہ ناہموار اور درختوں سے اٹا ہوا تھا۔ ایک جگہ ہماری جیپ گیلی زمین میں دھنس گئی۔ سب نیچے اُتر کر اسے دھکا لگانے لگے۔ انسپکٹر اروڑا دھکا لگانے کے ساتھ ساتھ جیپ کو ماں بہن کی گالیاں بھی دے رہا تھا۔ گالیاں دیتے دیتے اور دھکا لگاتے لگاتے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

"یار! اِدھر پار ہی ایک ڈاکٹر کا دواخانہ بھی تو ہے۔ کہیں وہ بدبخت اُدھر ہی نہ چلا گیا ہو۔"

انسپکٹر سجیت سنگھ اروڑا اس علاقے میں دو تین سال تعینات رہا تھا۔ کافی کچھ جانتا تھا یہاں کے بارے میں۔ اگر وہ کہہ رہا تھا کہ یہاں قریب ہی کوئی دواخانہ ہے تو یقیناً ہو گا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، پہلے وہاں دیکھ لیتے ہیں۔"

ہم نے پھنسی ہوئی جیپ کو وہیں چھوڑا اور سات آٹھ جوانوں کے ساتھ دوسری جیپوں میں سوار ہو کر دواخانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ دواخانہ واقعی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہ ایک نیم پختہ راستہ تھا جو دو تین برساتی نالوں کے اندر سے گزرتا ہوا کپورتھلہ پہنچتا تھا۔ اس راستے کے کنارے ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ چالیس پچاس کچے مکانات تھے اور ایک گرجا تھا۔ گرجے کے قریب ہی ایک کرسچین ڈاکٹر نے کلینک کھول رکھا تھا۔ پوری بستی میں یہی واحد عمارت تھی جو اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ عمارت کی پیشانی پر داؤد کلینک کے الفاظ لکھے تھے۔ بستی میں ہُو کا عالم تھا۔ در و دیوار تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہماری جیپیں کلینک کے عین سامنے رکیں۔ میں نے نیچے اُتر کر دروازے پر دستک دی۔ دستک دیتے ہوئے میری ٹارچ کی روشنی دروازے کے رنگ دار تختوں پر پڑی اور یک لخت رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ہم شاید صحیح جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ دروازے کے تختے پر ایک جگہ مجھے خون کے نشانات نظر آئے۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے خون آلود ہاتھ سے دروازے پر دستک دی ہے۔ اتنے میں اندر سے ایک ڈری سہمی آواز آئی۔ "کون ہے؟" یہ کسی ادھیڑ عمر مرد کی آواز تھی۔

"پولیس ہے...... دروازہ کھولو۔" میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

چند لمحے اندر سناٹا طاری رہا۔ پھر کسی نے قریبی کھڑکی میں سے جھانک کر باہر کا جائزہ لیا۔ کھڑکی بند ہوتے ہی قدموں کی چاپ ابھری اور دروازہ کھول دیا گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں میرے سامنے پینتیس برس عمر کا ایک دبلا پتلا شخص کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی جگہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور گردن پر خراشیں تھیں۔ اس کے پیچھے ایک عورت کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بھی درمیانی عمر کی تھی لیکن جسمانی بناوٹ کی وجہ سے جواں سال نظر آتی تھی۔ اس کے لمبے بالوں کا ڈھیلا ڈھالا جوڑا کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ عورت کی حالت مرد سے بھی بُری تھی۔ اس کا بیشتر لباس پھٹا ہوا تھا۔ "ضروری مقامات" اس نے چادر سے ڈھانپ رکھے تھے۔ اس کی ایک آنکھ سوج کر نیلی ہو چکی تھی۔ نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو دبلا پتلا مرد جو یقیناً اس کلینک کا ڈاکٹر تھا کچھ اور بھی ہراساں نظر آنے لگا۔ "کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا اس کا حلق اتنا خشک ہے کہ وہ بول نہیں سکتا۔ عورت تیزی سے آگے آئی اور بھڑک کر بولی۔ "یہ کیا بتائیں گے میں آپ کو بتاتی ہوں انسپکٹر صاحب۔ یہ دیکھئے میرا حال۔" اس نے ایک لمحے کے لئے چادر اپنے بالائی جسم سے ہٹائی اور روتے ہوئے بولی۔ "ہمیں بہت بُری طرح مارا ہے اس ظالم نے۔ وہ

انسان نہیں تھا کوئی بے رحم وحشی تھا۔ اسے دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ گاڈ کو ہماری زندگی منظور تھی ورنہ اس وقت ہماری لاشیں پڑی ہوتیں یہاں۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اندر برآمدے میں ڈالی۔ یہاں گھریلو استعمال کی کئی چیزیں ٹوٹی پھوٹی نظر آئیں۔ یوں لگتا تھا کافی دھینگا مشتی ہو چکی ہے یہاں۔ میں نے تفصیلات پوچھیں۔ عورت آہوں اور سسکیوں کے ساتھ بتانے لگی۔

''یہ ڈاکٹر داؤد میرے ہسبنڈ ہیں۔ گاڈ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ یہ کسی بھی بڑے سے بڑے شہر میں کلینک چلا سکتے ہیں لیکن لوگوں کی خدمت کا جذبہ ہے جس نے مجبور کر کے انہیں اس گاؤں میں رکھا ہوا ہے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا ہے۔ بُرے لوگ بھی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے لہٰذا وہ پسند چاہے نہ کریں لیکن ان کی عزت ضرور کرتے ہیں...... آخر ہم پیسہ کمانے کے لئے تو یہاں نہیں بیٹھے ہوئے۔ لوگوں کے دکھ بانٹ رہے ہیں۔ پھر ہم سے ایسا سلوک کیوں؟ اب ہم کیوں رہیں گے یہاں۔ کیوں خواہ مخواہ اپنا سکھ تباہ کریں گے اور جان خطرے میں ڈالیں گے؟''

میں نے عورت سے کہا کہ وہ اصل بات بتائے۔ انہیں کس نے مارا ہے اور کیوں مارا ہے؟ جواب میں وہ بولی۔ ''میرے دونوں بچے ماموں کے گھر لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ہم میاں بیوی گھر میں اکیلے تھے۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ یہ بھی جاگ چکے تھے۔ انہوں نے دروازے پر جا کر پوچھا کہ کون ہے؟ جواب ملا مریض ہوں۔ سخت تکلیف میں ہوں یسوع مسیح کے نام پر دروازہ کھول دیں۔ انہوں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ ایک قوی ہیکل شخص اپنے کندھے پر ایک زخمی کو اُٹھائے ہوئے تھا۔ زخمی ایک درمیانی عمر کا شخص تھا۔ پہلوان نما شخص اسے بار بار بابو کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ بابو کی دائیں ران میں دو گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ پہلوان نے ان سے کہا کہ یہ گولیاں نکال دیں۔ میرے شوہر نے جواب دیا کہ یہ پولیس کیس ہے مریض کو ہسپتال پہنچانا ہوگا۔ ہسپتال کا نام سن کر پہلوان بدک گیا اور اصرار کرنے لگا کہ گولیاں کلینک میں ہی نکال دیں۔ میرے شوہر نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا میں فزیشن ہوں سرجن نہیں۔ نہ ہی میرے پاس سرجری کے اوزار ہیں اور اوزار ہوتے بھی تو میں یہ کام نہ کرتا کیونکہ غیر قانونی کام میں ملوث ہونا مجھے پسند نہیں۔ پہلوان طیش میں آ گیا اور اس نے انہیں دھکے دیئے۔ میں برداشت نہ کر سکی اور اس کا ہاتھ روکنا چاہا۔ وہ تو جیسے پہلے سے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ بھوکے بھیڑیئے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ کپڑے پھاڑ دیئے اور گھونسے ٹھوکریں

مار مار کر لہولہان کر دیا۔ اس میں کسی جن کی سی طاقت تھی۔ حیران ہوں کہ اب تک زندہ کیسے ہوں۔ میرے شوہر نے مجھے بچانا چاہا تو انہیں بھی سخت چوٹیں سہنا پڑیں۔ ہم نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر اس موذی سے اپنی جان بچائی۔ میرے شوہر نے خواب آور دوا کھلا کر زخمی کی ٹانگ میں سے دونوں گولیاں نکالیں اور مرہم پٹی کی۔ مرہم پٹی کے دوران پہلوان ہمیں مسلسل دھمکاتا اور گالیاں دیتا رہا۔ اس کے پاس دو بھری ہوئی رائفلیں تھیں۔ ایک دو نالی تھی اور دوسری فوجی گن کی طرح۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں قتل کر کے آیا ہوں اور میرے سر پر خون سوار ہے۔ مجھ سے الجھو گے تو بُری طرح پچھتاؤ گے۔'' مرہم پٹی کروانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ گھر میں کھانے کے لئے کچھ ہے۔ میں نے کہا دودھ ہے۔ وہ بولا لے آؤ۔ تین چار سیر دودھ تھا۔ اس میں سے ایک ڈیڑھ پاؤ زخمی بابو نے پیا باقی سارا پہلوان نے ایک سانس میں چڑھا لیا۔ وہ بابو کو ایک ریڑھے پر لاد کر لایا تھا۔ اسی ریڑھے پر لاد کر وہ اسے واپس لے گیا۔

ڈاکٹر داؤد کی اہلیہ کا نام مریم تھا۔ اس کی کہی ہوئی روداد ہمارے لئے بے حد اہم تھی۔ ہم بالکل صحیح راستے پر جا رہے تھے لیکن فرق یہ تھا کہ شہباز پہلوان ہم سے کچھ آگے تھا۔ ہم جہاں پہنچتے تھے وہ وہاں سے نکل چکا ہوتا تھا۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر کی اہلیہ نے بتایا کہ ملزمان کو وہاں سے نکلے قریباً ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ ہماری اس تمام گفتگو کے دوران ڈاکٹر داؤد خاموش ہی رہا تھا۔ وہ کم گو شخص نظر آتا تھا اور پریشانی کے سبب کچھ اور کم گو ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ترس آ رہا تھا بلکہ دونوں میاں بیوی کی حالت قابلِ رحم تھی۔ پہلوان نے اپنی خداداد طاقت کا بہت غلط استعمال کیا تھا۔ واقعی میاں بیوی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک منہ زور طوفان کی زد میں آ کر بھی زندہ بچ گئے تھے۔

انسپکٹر سجیت اروڑا نے ڈاکٹر داؤد سے بھی چند سوالات پوچھے جن کے اس نے بجھے دل سے مختصر جوابات دیئے۔ وہ بہت اکھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ بہت حساس شخص تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس حادثے کی خبر پوری بستی کو ہو چکی ہوتی لیکن ڈاکٹر داؤد نے خود پر گزرنے والی قیامت کی خبر اپنے تک ہی محدود رکھی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے میاں بیوی کو تسلی دینے کی کوشش کی اور ضروری کارروائی کر کے ان کے گھر سے نکل آیا۔ انسپکٹر اروڑا اور سب انسپکٹر درویش علی بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم جیپ میں بیٹھے اور واپس غیر آباد علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میاں بیوی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ پہلوان اپنے زخمی ساتھی کو لے کر واپس اُدھر ہی گیا ہے جدھر سے آیا تھا۔

انسپکٹر اروڑا والی جیپ آگے تھی۔ ہم پیچھے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر داؤد کے کلینک سے بمشکل دو فرلانگ دور آئے تھے کہ قریب بیٹھے بلال شاہ نے میرا کندھا دبایا۔ ''خان صاحب، جیپ رکوائیں۔'' اس نے تیزی سے کہا میں نے ڈرائیور کو جیپ ٹھہرانے کی ہدایت کی۔ بلال شاہ کے کان کچھ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے جیپ کا انجن بند کر دیا۔ چند لمحے بعد سناٹے میں گھوڑے کی مدھم ہنہناہٹ ابھری۔ بلال شاہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ یقیناً اس کے کان اسی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ ہم سب کے لئے یہ آواز دلچسپی کا باعث تھی۔ یہاں قرب و جوار میں جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا نہ ہی کوئی کھیت کھلیان دکھائی دے رہا تھا۔ گھوڑے کی آواز دائیں جانب ایک گھنے جھنڈ کے اندر سے آئی تھی۔ میں اور بلال شاہ جیپ سے اُتر کر درختوں کی طرف بڑھے۔ بلال شاہ کے ہاتھ میں ٹارچ اور میرے ہاتھ میں 38 بور کا ریوالور تھا۔ جنتر اور کیکر کی شاخوں میں سے راستہ بناتے ہم جھنڈ کے اندر پہنچے تو ٹارچ کی روشنی ایک ریڑھے پر پڑی۔ ریڑھے کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا اور اس کے منہ پر خشک چارے والا تھیلہ چڑھا ہوا تھا۔ ریڑھے اور گھوڑے کو دیکھتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ خانہ بدوش رنگو سائیں کا ریڑھا ہے...... میں نے بلال شاہ کی طرف دیکھا اور اس نے میری طرف...... ایک سنسنی سی ہمارے جسموں میں دوڑ گئی۔ ریڑھے کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ دونوں مفرور یہیں کہیں موجود ہیں۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی پن ہٹا کر اسے بالکل تیار حالت میں کر لیا۔ محتاط قدموں سے ہم ریڑھے کی طرف بڑھے۔ اس میں سائیں رنگو کا سامان ابھی تک لدا ہوا تھا۔ آٹے دال کی دو بوریاں تھیں۔ چاولوں کا تھیلا تھا۔ ایک نئی لالٹین تھی اور مٹی کے تیل کا کنستر تھا۔ ان میں کئی چیزیں خون سے رنگین نظر آتی تھیں۔ یقیناً اس خون کا تعلق پہلوان کے زخمی ساتھی بابو سے تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ پہلوان اور بابو قرب و جوار میں موجود نہیں۔ تو پھر وہ کہاں گئے؟ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ کلینک سے واپس آنے کے بعد پہلوان نے اتنی جلدی ریڑھا کیوں چھوڑ دیا۔ کیا اسے کوئی اور سواری مل گئی تھی۔ اگر سواری ملی تھی تو اردگرد کی زمین پر ٹائروں اور پہیوں کے نشان ہونے چاہئیں تھے لیکن ایسا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور میں بُری طرح چونک گیا۔ کلینک میں ہونے والی گفتگو کے دوران ڈاکٹر داؤد بے حد خاموش رہا تھا کہیں اس کی خاموشی کا کوئی خاص سبب تو نہیں تھا۔

میں نے بلال شاہ سے کہا۔ ''شاہ جی! ہمیں واپس کلینک جانا ہو گا۔''

''لیکن کیوں؟'' بلال شاہ نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ...... پہلوان اور بابو ابھی کلینک میں ہی ہیں۔''

بلال شاہ حیرت سے اچھل پڑا۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر جیپ تک لے آیا۔ ایک ہوشیار ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے حکم دیا کہ وہ چوکسی سے ریڑھے کا پہرہ دے اور خود جیپ میں بیٹھ کر واپس کلینک روانہ ہو گیا۔ سب انسپکٹر درویش علی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے جیپ کلینک سے کچھ فاصلے پر رکوائی۔ میرے ساتھ کل چار سپاہی تھے۔ ان میں سے دو کے پاس رائفلیں تھیں۔ میرے اور سب انسپکٹر کے پاس ریوالور تھے۔ میں نے عملے کو ہدایت کی کہ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ کلینک کی ناکہ بندی کر لیں اور اگر کوئی حملہ آور ہو یا فرار ہونے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دیں۔ بلال شاہ کے پاس اس کا اپنا دیسی پستول تھا۔ میں نے اسے کلینک کی عقبی دیوار کے پاس ایک تناور درخت کی اوٹ میں کھڑا کیا اور باقی عملے کی طرح اسے بھی ''شوٹ'' کرنے کی ہدایت کر دی۔

عقبی دیوار پر چڑھائی کر کے میں اندر صحن میں اُترا اور تاریکی میں رینگتا ہوا برآمدے تک پہنچ گیا۔ ایک مفرور قاتل کی گرفتاری کے لئے چھاپہ مارنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بات وہی سمجھ سکتا ہے جو اس تجربے سے گزر چکا ہو۔ قاتل کے سر پر خون سوار ہوتا ہے اور پھانسی کا پھندا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنی گردن بچانے کے لئے کسی کی جان بھی لے سکتا ہے۔ میں برآمدے میں پہنچا تو میرا یہ شک پختہ یقین میں بدل گیا کہ شہباز پہلوان اور بابو اندر موجود ہیں۔ ایک قریبی کمرے سے باتوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ میں کھڑکی سے قریب تر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر داؤد اپنی اہلیہ سے کہہ رہا تھا۔

''تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی نہیں آئے گا یہاں۔ یہ لو گولی پانی کے ساتھ کھا لو۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں لرزش تھی۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت گھبرایا ہوا ہے اور بیوی سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ ڈاکٹر کی اہلیہ کو واقعی معلوم نہیں تھا کہ مجرم ابھی تک گھر میں ہیں۔ ڈاکٹر نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے یہ بات اس سے چھپا رکھی تھی۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' ڈاکٹر کی اہلیہ منمنائی۔ ''میں تو آپ کو دیکھ دیکھ کر نروس ہو رہی ہوں۔ آپ بھی لیٹ جائیے ناں۔''

''اچھا اچھا لیٹتا ہوں، تم تو لیٹو۔''

میں کھڑکی کے قریب سے گزر کر راہداری میں آیا۔ یہاں ایک استری اسٹینڈ الٹا پڑا تھا۔ پاس ہی کچھ کراکری ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہاں ایک کمرے میں لالٹین روشن تھی اور اس کی

مدھم روشنی کھڑکی کی ایک جھری میں سے پھوٹ رہی تھی۔ میں نے جھری سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ عین اس وقت ''چیں'' کی نہایت باریک آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا...... اور...... شہباز پہلوان مجھے صرف دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا نظر آیا۔ ہم دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ میں وردی میں تھا۔ پہلوان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس کی رائفل کندھے سے لٹکی تھی لیکن میرا ریوالور ہاتھ میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ رائفل سیدھی کرتا میں نے ریوالور اس پر تان لیا۔

''خبردار۔'' میں نے غرا کر کہا۔ ''حرکت کی تو شوٹ کر دوں گا۔'' میری انگلی لبلبی پر تھی اور ایک ذرا سا دباؤ پہلوان کے چوڑے چکلے سینے میں سوراخ کر سکتا تھا۔ پہلوان کے لئے مناسب یہی تھا کہ وہ بے حرکت کھڑا رہتا لیکن اس نے ہٹ دھرمی دکھائی اور تیر کی طرح میری طرف آیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو پہلوان کی لاش دروازے کی دہلیز پر تڑپتی نظر آتی لیکن پورا اختیار ہونے کے باوجود میں اس پر گولی نہ چلا سکا۔ شاید ابھی اس کے لئے ہمدردی کا تھوڑا بہت جذبہ میرے اندر موجود تھا۔ پہلوان کسی مست ہاتھی کی طرح مجھ سے ٹکرایا اور میں اس کی ٹکر سے اچھل کر دور جا گرا۔ میرے گرنے سے ایک کونے میں رکھی ہوئی لالٹین بھی گر گئی اور ایک دم برآمدے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اندازے سے ایک فائر کیا...... نشانہ خطا گیا۔ قدموں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پہلوان بھاگ رہا ہے۔ سامنے والے کمرے سے ڈاکٹر اور اس کی بیوی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں صحن میں پہنچا تو پہلوان کہیں نظر نہیں آیا۔ میں بھاگ کر بیرونی دروازے پر پہنچا۔ سب انسپکٹر درویش علی بھاگتا ہوا مجھ سے آ ٹکرایا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ درویش علی کے اندر آنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ پہلوان بیرونی دروازے سے باہر نہیں نکلا۔ میں نے صحن کے اندر سے پکار کر کہا۔ ''بلال شاہ ہوشیار۔'' اس نے چلا کر جواب دیا۔ ''ہاں جی ہوشیار۔'' ٹارچیں روشن کر کے ہم نے بڑی سُرعت کے ساتھ مکان کی تلاشی لی۔ ایک کمرے میں نیم بے ہوش بابو کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا۔ تب میری نگاہ برآمدے کے ایک کھڑکی نما دروازے پر پڑی۔ یہ دروازہ کھلا پڑا تھا...... شہباز پہلوان یہاں سے نکل چکا تھا۔ اس طرف گرجے کی دیوار تھی۔ پہلوان باہر نکلتے ہی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ یوں کچھ فاصلے پر کھڑا بلال شاہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ یہ زبردست ٹریجڈی ہوئی تھی۔ اس دروازے کا علم پہلے سے ہوتا تو پہلوان بھاگ نہیں سکتا تھا۔ ہم جیپ لے کر فوراً اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ گھنے

درخت اور جنتر کے پودے یخ بستہ ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ہم نے قریباً ایک گھنٹے میں دس میل جیپ چلائی لیکن پہلوان کا سراغ کہیں نہیں ملا...... طلوعِ آفتاب کے وقت ہم بستی میں واپس لوٹے۔ یہاں ڈاکٹر کے مکان کے سامنے لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ خانہ بدوش سائیں رنگو کا چوری شدہ ریڑھا بھی مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر گہری دلچسپی کے آثار تھے۔ انہیں دو گھنٹے پہلے ہی اس واقعے کی خبر ہو چکی تھی۔ جب میں نے اندھیرے میں گولی چلائی تو اس کی آواز پوری بستی میں گونجی تھی اور کئی افراد ڈاکٹر داؤد کی خیریت دریافت کرنے اس کے مکان پر آ موجود ہوئے تھے۔ انسپکٹر اروڑا بھی راستے میں میرا انتظار کرنے کے بعد کلینک واپس آ چکا تھا اور میرے آنے تک اس نے آٹھ دس افراد کے بیان بھی قلم بند کر لئے تھے۔

میں نے سب سے پہلے شہباز کے ساتھی بابو سے ملاقات کی۔ اسے ہتھکڑی لگ چکی تھی اور وہ ہتھکڑی سمیت بستر پر لیٹا تھا۔ اس کی ران پر بندھی پٹی سے مسلسل خون رِس رہا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھی۔ نیلی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ خالص دیہاتی بندہ نظر آتا تھا معلوم نہیں اس کا نام ''بابو'' کس نے ڈال دیا تھا۔ بابو کے بارے میں انکشاف ہوا کہ وہ مشہور بدمعاش اور مفرور ٹیک سنگھ کا بندہ ہے۔ ٹیک سنگھ کا گروہ اس علاقے میں اچھی طرح جانا پہچانا جاتا تھا۔ یہ لوگ مانے ہوئے قانون شکن تھے۔ ہر بُرے سے بُرا کام یہ لوگ کر چکے تھے اور کر رہے تھے۔ بابو کی شناخت ہونے کے بعد میرے لئے یہ جاننا مشکل نہیں رہا تھا کہ پہلوان یہاں سے فرار ہونے کے بعد کہاں گیا ہو گا۔ یقیناً اس کی منزل ٹیک سنگھ کا ڈیرہ تھی اور ٹیک سنگھ کا ڈیرہ کوئی ایک نہیں تھا۔ شہر، گاؤں اور ویرانے میں اس کے کئی ایک ٹھکانے تھے۔ اس کے اپنے خاص کارندوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ٹیک سنگھ آج کی رات کہاں گزارے گا۔ میں نے بابو کے ساتھ کئی گھنٹے تک مغز ماری کی۔ وہ صرف اتنا بتا سکا کہ ٹیک سنگھ ان دنوں پورن کچھ کے علاقے میں بڑے ڈیک نالے کے اس پار ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ پہلوان کے ساتھ مل کر اس نے پولیس مقابلہ کیا تھا اور یہ بھی مانا کہ وہ اس وقت پہلوان کو لے کر پورن کچھ جا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ ٹیک سنگھ پورن کچھ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟''

وہ بولا۔ ''معلوم تو ہے لیکن میں آپ کو وہاں پہنچا نہیں سکتا۔ اب تک ٹیک سنگھ کو میری گرفتاری کی اطلاع ہو چکی ہو گی اور اگر نہیں ہوئی تو آج شام تک ہو جائے گی۔ ہمیں پورن

کچھ تک پہنچتے پہنچتے رات تو ہو ہی جائے گی۔ ہم جتنے آدمی وہاں پہنچیں گے ان میں سے کوئی ایک بھی واپس آجائے تو وہ بڑا بھاگوان ہوگا...... ہم سے کیا پوچھتے ہو آپ جانتے ہی ہو صاحب پچھلے برس انگریز کپتان، فوج کی پوری کمپنی لے کر گیا تھا۔ ان میں سے کتنے بچے تھے اور جو بچے تھے ان میں کتنوں کے ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔''

بابو کچھ ایسا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ علاقہ جرائم پیشہ افراد کی جنت تھا۔ یہاں گھس کر کسی بھی شخص کو گرفتار کر لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ اب تو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اس طرف سے ویسے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں...... بہر طور شہباز پہلوان جو کچھ کر چکا تھا اس کے بعد لازمی ہوگیا تھا کہ اسے گرفتار کیا جائے۔ کیسے کیا جائے؟ یہ سوچنا ہمارا کام تھا۔ اعلیٰ افسران کو تو بس حکم دینا تھا اور ''لائن حاضری'' کی دھمکیاں دینی تھیں۔

ہمارے اگلے آٹھ ہفتے سخت بھاگ دوڑ میں گزرے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس دوران بقر عید بھی آئی مگر نہ تو ہم گھر جا سکے اور نہ عید پڑھ سکے۔ ہم کپورتھلہ سے قریباً چالیس میل دور دریائے ستلج کی طرف ایک دشوار گزار علاقے میں تھے۔ اس علاقے کو کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جن میں سے ایک پورن کچھ بھی ہے۔ یہاں امرتسر کے ایک بڑے زمیندار کا ریسٹ ہاؤس تھا۔ اس ریسٹ ہاؤس میں بجلی پانی کا اپنا انتظام تھا اور چاروں طرف باڑ لگا کر اسے جنگلی جانوروں سے ہر طرح محفوظ کیا گیا تھا۔ زمیندار دھنی رام سنگھ ان دنوں ریسٹ ہاؤس میں ہی تھا۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے شکار پر نکلا ہوا تھا۔ ساتھ نوکروں کی فوج تھی۔ آٹھ دس عربی گھوڑے تھے اور تازی کتوں کا غول تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی خوبصورت چیز بھی دھنی رام کے پاس تھی اور یہ ایک سولہ سترہ سالہ گجراتی لڑکی تھی۔ عمر کے لحاظ سے یہ لڑکی دھنی رام کی بیٹیوں سے بھی چھوٹی تھی مگر رشتے کے لحاظ سے بیوی تھی۔ بہترین نسل کے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دھنی رام سنگھ کو حسین عورتوں کا بھی شوق تھا۔ شکاری تو وہ تھا ہی اس لئے شکار تک پہنچنا اس کے لئے قطعی مشکل نہیں تھا...... سننے میں آیا تھا کہ یہ اس کی چوتھی بیوی ہے۔ بہر حال یہ تذکرہ یوں ہی درمیان میں آگیا۔ میں شہباز پہلوان کی رُوپوشی اور اپنی دربدری کا ذکر کر رہا تھا۔ دھنی رام سنگھ نے پولیس پارٹی کو اپنے ریسٹ ہاؤس میں ہی ٹھہرا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ شہباز کی گرفتاری کے سلسلے میں بھی پولیس کی مدد کر رہا تھا۔ اسے شہباز سے کوئی دشمنی تھی اور نہ قانون سے کوئی ہمدردی وہ ہم سے تعاون صرف اس لئے کر رہا تھا کہ وہ ایک بڑا زمیندار تھا اور ایسے زمیندار اپنی ''رعایا'' پر اثر ڈالنے کے لئے پولیس سے تعلقات

رکھا ہی کرتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس میں پولیس پارٹی کی خوب ٹہل سیوا ہو رہی تھی اس کے علاوہ دھنی رام سنگھ کا ملازم خاص ''بجرنگ'' مختلف ایسے لوگوں کو ہمارے پاس لاتا رہتا تھا جن سے پہلوان یا ٹیک سنگھ کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

اب تک کی تفتیش سے ہمیں اندازہ ہوا تھا کہ نہ صرف شہباز پہلوان ٹیک سنگھ کے پاس پہنچ چکا ہے بلکہ اس کا چھوٹا بھائی ایاز عرف ایازی بھی جو شہباز کے ساتھ ہی مفرور ہوا تھا ٹیک سنگھ کے ٹھکانے پر موجود ہے...... ٹیک سنگھ کا ٹھکانہ بھی ہماری نظر میں آگیا تھا مگر وہاں چھاپہ مار کر شہباز کو گرفتار کرنا درندے کی کچھار میں اس کا شکار چھیننے کے برابر تھا۔ جوں جوں اعلیٰ افسران کی طرف سے دباؤ بڑھ رہا تھا ہماری بھاگ دوڑ بھی شدت پکڑ رہی تھی لیکن فوری طور پر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کسی وقت بیٹھے بٹھائے مجھے انسپکٹر نہال سنگھ پر سخت غصہ آنے لگتا۔ وہ خود تو دو گولیاں کھا کر ''سورگ'' پدھار گیا تھا اور ہماری جان مصیبت میں ڈال گیا تھا۔ اس نے اناڑی شکاری جیسا کردار ادا کیا تھا جو اپنے غلط نشانے سے شیر کو آدم خور بنا دیتا ہے اور اَن گنت زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ نیم گرم ہوا خودرَو پودوں سے اٹھکیلیاں کرتی گزر رہی تھی۔ انسپکٹر اروڑا اندر کمرے میں سو رہا تھا۔ میں لان میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ بلال شاہ کے علاوہ دو سپاہی بھی وہاں موجود تھے۔ وہ تینوں ایک تین دن پرانے اخبار پر جھکے ہوئے اپنے اپنے مطلب کی خبر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک مین گیٹ کی طرف گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ میں نے سمجھا دھنی رام سنگھ کا کوئی شکاری ہوگا۔ یہ لوگ صبح سویرے اکثر مرغابی کے شکار سے واپس آتے تھے۔ خون آلود تھیلوں میں مرغابیاں یا جنگلی خرگوش بھرے ہوتے تھے یا پھر کوئی فربہ اندام سؤر گھوڑے پر لدا ہوتا تھا لیکن اس وقت جو گھڑ سوار مین گیٹ پر نظر آیا وہ شکاری نہیں تھا نہ ہی میں نے پہلے اسے دیکھا تھا۔ وہ چوڑے چکلے سینے اور بے حد مضبوط جسم والا ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھا۔ رنگ گورا چٹا تھا۔ ڈاڑھی ابھی بھر کر نہیں آئی تھی۔ نوجوان کی ریشمی قمیص گریبان سے پھٹی ہوئی تھی اور چہرے پر بائیں آنکھ کے عین نیچے چوٹ کا تازہ نشان تھا...... وہ گھوڑے سے اُتر کر سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس کی چال میں پہلوانوں کی سی شان و شوکت تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام...... بیٹھو۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بھانپ چکا تھا کہ نوجوان کے لباس میں پستول، ریوالور وغیرہ موجود ہے۔

نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے انکشاف کیا کہ وہ شہباز پہلوان کا بھائی ایاز عرف ایازی ہے۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بلاشبہ وہ شہباز کا بھائی تھا۔ سخت حیرت کی بات تھی کہ وہ اس وقت یہاں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی حالت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی سے مارا ماری کر کے آیا ہے۔ اس نے اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور تہبند کی ڈب میں سے ایک ریوالور اور پندرہ بیس گولیاں نکال کر میرے سامنے تپائی پر رکھ دیں۔ وہ بولا۔

''تھانیدار صاحب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اگر کوئی جرم ہے تو صرف یہ کہ میں اپنے بھائیے (بھائی) کے ساتھ آٹھ دس ہفتے ٹیک سنگھ کے ڈیرے پر رہا ہوں...... اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں جناب...... مجھے اچھے بُرے کی پہچان ہوگئی ہے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کون کیا ہے؟'' آخری الفاظ کہتے کہتے ایازی کا گلا رندھ گیا۔

میں سمجھ گیا کہ ایاز عرف ایازی چوٹ کھا کر آیا ہے۔ میں نے اس کا اسلحہ قبضے میں لیا...... منہ ہاتھ دھلوایا اور لسی پانی کا انتظام کیا۔ ساتھ ساتھ ایازی سے باتیں بھی ہوتی رہیں۔ وہ شہباز پہلوان کے خلاف غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ شہباز کے علاوہ اسے ٹیک سنگھ سے بھی شدید رنج پہنچا تھا۔ اس دوران انسپکٹر اروڑا بھی آنکھیں ملتا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ میں نے اس کی نیند پوری طرح بھگانے کے لئے ایازی کا تعارف اس سے کرایا...... اس کی نیند سچ مچ بھاگ گئی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایازی کو دیکھنے لگا۔ ایازی کی آمد ہمارے لئے بہت خوش کن تھی تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہمیں چوکس رہنے کی بھی ضرورت تھی۔ یہ کسی سازش کا تانا بانا بھی ہو سکتا تھا۔ جس علاقے میں ہم گھسے ہوئے تھے یہاں ہر قدم پھونک کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ ایازی سے طویل گفتگو اور پوچھ گچھ کے بعد ہمیں جو کچھ معلوم ہوا اس کا لبِ لباب یہ ہے۔

''ایازی کل دو ماہ ٹیک سنگھ کے ڈیرے پر رہا تھا۔ گھنے جنگل میں یہ بالکل عارضی سا ڈیرہ تھا۔ کچے کوٹھے بنے ہوئے تھے۔ وہاں ٹیک سنگھ کے علاوہ پندرہ بیس بندے اور بھی تھے۔ وہ سب مفرور، ڈکیت اور قاتل تھے۔ ڈیرے میں شراب نوشی کی محفلیں جمتی تھیں اور جواء کھیلا جاتا تھا۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ اس کا نام صفیہ تھا۔ صفیہ کے بارے میں ایازی کو پتہ چلا تھا کہ وہ امرتسر کی رہنے والی ہے۔ اس کے والدین ایک حادثے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ وہ بے آسرا ہے اور علاقے کا ایک خانوں نامی بدنام غنڈہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ اس غنڈے کے خلاف لڑکی کی مدد کرتا۔ ٹیک سنگھ نے اس کی مدد کی اور پناہ کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ اب وہ لڑکی [illegible]

ٹیک سنگھ کے ساتھ رہتی ہے اور اسے بھائی کہتی ہے...... نوجوان ایازی کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ پہلی نگاہ میں ہی لڑکی کے تیرِ نظر کا شکار ہو گیا تھا۔ لڑکی بھی اس کی طرف مائل تھی اور اس خطرناک ماحول سے نکل جانا چاہتی تھی۔ علاقے کے بدنام ترین بدمعاش جب اکٹھے ہو کر شراب پیتے تھے، فحش گالیاں دیتے تھے اور برہنہ ڈانس کرتے تھے تو وہ بیچاری ڈر سہم کر کسی کونے میں دبکی رہتی تھی۔ اگر پورن کچھ سے باہر اسے شہری غنڈے خانوں کا خوف نہ ہوتا تو وہ ایک پل بھی یہاں رکنا پسند نہ کرتی۔ ایازی کو بھی یہ ماحول ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ وہ بھائی کی محبت میں سب کچھ چھوڑ کر اس ویرانے میں چلا آیا تھا لیکن یہاں آ کر وہ دیکھ رہا تھا کہ بھائی دن بدن بدلتا جا رہا ہے۔ وہ جو سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا تھا اب شراب پیتا تھا۔ گالیاں بکتا تھا اور بازیاں لگاتا تھا...... اور ایک روز پہلے تو حد ہی ہوگئی۔ ایازی نے اپنے بھائی کو صفیہ کے ساتھ غیر حالت میں دیکھ لیا۔ اس کا خون کھول اُٹھا۔ وہ بھائی جسے وہ باپ کی جگہ سمجھتا تھا کتنی بے دردی سے اس کے دل کا خون کر رہا تھا۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ وہ صفیہ کو چاہتا ہے اور اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔ شہباز اس کو اپنی بانہوں میں بھر رہا تھا۔ یہ نظارہ کسی طور ایازی کے لئے قابلِ برداشت نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں بھر گئیں۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ کمرے میں گھس گیا۔ اس کی آمد نے شہباز کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ خجل نظروں سے ایازی کی طرف دیکھنے لگا...... لیکن پھر اس نے سنبھالا لیا۔ اس کے چہرے پر ہراس کی جگہ غصے کی سرخی نظر آنے لگی۔ یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا معاملہ ہو گیا۔ شہباز غصے سے بولا کہ وہ بغیر پوچھے اندر کیوں گھس آیا ہے۔ ایازی بھی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کے منہ سے کیا بات نکلی کہ شہباز آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ خون آشام جانور کی طرح ایازی پر جھپٹا اور اسے مارنے لگا۔ ایازی نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی تھا شہباز طاقت میں اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ وہ ایک بھرپور جوان تھا جب کہ ایازی کا جسم ابھی بھر رہا تھا اور زور پکڑ رہا تھا۔ شہباز نے لمحوں میں اسے دھنک کر رکھ دیا۔''

بھائی کے سلوک نے ایازی کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ کل رات ہی اس نے ٹیک سنگھ کا ڈیرہ چھوڑ دیا اور ڈیک نالہ پار کر کے کھلے علاقے میں آ گیا۔ یہیں پر اسے معلوم ہوا کہ شہباز پہلوان کی تلاش میں آنے والی پولیس پارٹی نے پچھلے کئی ہفتوں سے دھنی رام سنگھ کے ریسٹ ہاؤس میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ غصے میں بھرا ہوا تھا اس نے سیدھا ریسٹ ہاؤس کا رخ کیا اور ہمارے پاس پہنچ گیا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ایاز کی آمد ہمارے لئے نہایت نیک شگون تھی۔ اب یہ ہمارا کام تھا کہ اس شگون کو زیادہ سے زیادہ ''نیک'' کیسے بنایا جائے۔ شہباز کی گرفتاری کے سلسلے میں ایازی ہمیں بہت مفید مشورے دے سکتا تھا۔ وہ دو ماہ ٹیک سنگھ کے ڈیرے پر رہا تھا اور وہاں کی ہر اونچ نیچ سے واقف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دل و جان سے بھائی کے خلاف ہو چکا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے اپنے کیئے کی قرار واقعی سزا ملے۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں ایازی نے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی بھائی سے سارے ناتے توڑ چکا ہے اور پوری نیک نیتی کے ساتھ پولیس سے تعاون پر آمادہ ہے۔ (ایازی کی مایوسی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پچھلے دو تین ماہ میں شہباز پہلوان گمراہی کے راستے پر بڑی تیزی سے آگے بڑھا ہے) ایازی نے ہمیں ایک نہایت کارآمد بات بتائی۔ اس نے کہا۔ ''دو ہفتے بعد دیوالی ہے اور ٹیک سنگھ کا ارادہ ہے کہ دیوالی امرتسر جا کر دیکھی جائے۔ ایک روز رات کو وہ اپنے ایک ساتھی ہاشو خان سے یہ بات کر رہا تھا۔ میں نے کسی طرح یہ باتیں سن لی تھیں۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اگر وہ لوگ دیوالی پر گئے تو شہباز بھی ان کے ساتھ جائے گا اور وہاں وہ اسے ''پہلی دھار'' کی خاص شراب پلائیں گے۔'' مجھے امید کی کرن دکھائی دینے لگی۔ ہمیں کسی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہم دس پندرہ روز تو کیا دس پندرہ ہفتے بھی انتظار کر سکتے تھے۔ شام کو دھنی رام سنگھ سے بھی اس سلسلے میں بات ہوئی۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ خطرناک علاقے میں گھس کر جانیں مصیبت میں ڈالنے کی بجائے دس پندرہ روز انتظار کر لینا مناسب ہے۔

سری امرتسر کی دیوالی دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ قرب و جوار کے دیہات سے لوگ جوق در جوق یہاں پہنچتے تھے۔ دربار صاحب کے اندر اور باہر میلہ سا لگ جاتا تھا۔ کئی شوقین مزاج دو روز پہلے یہاں ڈیرے ڈال لیتے تھے اور خوب موج میلہ کرتے تھے۔ دربار صاحب کے باہر والے بازاروں میں بڑی دھوم ہوتی تھی۔ کھلی جگہوں پر کھیل تماشوں کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ ہم امرتسر پہنچے تو دیوالی میں ابھی ایک روز باقی تھا لیکن رش دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ آج ہی دیوالی ہے۔ دربار صاحب کے اندر باہر روشنیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ اکالی تخت میں ہتھیاروں کی نمائش تھی اور ہر مندر میں ماتھا ٹیکنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ پولیس پارٹی میں بلال شاہ، انسپکٹر اروڑا، انسپکٹر درویش علی، سب انسپکٹر راجندر اور دو کانسٹیبل شامل تھے۔ ہم سب دیہاتیوں کے بھیس میں تھے۔ امرتسر پہنچتے ہی ہم سیدھے دربار صاحب آئے تھے اور دربار صاحب آتے ہی ہجوم میں تتر بتر ہو گئے تھے۔ (تا کہ ملزمان کو شناخت کیا جائے)

پہلوان شہباز ڈیل ڈول کے لحاظ سے ایسا آدمی تھا کہ سینکڑوں کے مجمعے میں بھی نظر پر چڑھ سکتا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ اگر وہ دربار صاحب کی دیوالی میں پہنچا ہے تو بچ کر نہیں جا سکے گا۔

دربار صاحب میں گھومتے ہوئے ہی مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کل ایک قریبی احاطے میں کشتیوں کے مقابلے بھی ہوں گے۔ اردگرد کے کئی نامور پہلوان ان مقابلوں میں حصہ لے رہے تھے۔ ہمارے تھانے جیون کے دو پہلوان بھی اس دنگل میں اُتر رہے تھے۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ اگر شہباز پہلوان یہاں موجود ہے تو وہ کل کی کشتی دیکھنے ضرور آئے گا۔ چاہے تھوڑی دیر کے لئے ہی آئے۔ کشتی کا سن کر بلال شاہ بھی بڑے جوش و خروش کا اظہار کرنے لگا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ گاؤں میں اس نے اپنا ایک پٹھا تیار کر رکھا تھا۔ یہ پٹھا بھی دیوالی میلے پر آیا ہوا تھا اور بلال شاہ سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ بلال شاہ نے اس کی تیاری دیکھ کر اعلان کر دیا تھا کہ وہ بھی اپنے پٹھے کا جوڑ کرائے گا۔ غالباً اس نے سوچا تھا کہ گاؤں سے دور امرتسر کے میلے میں پٹھا ہار بھی گیا تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ پولیس پارٹی کو پتہ چلے گا یا چند گنے چنے افراد اس ہار سے باخبر ہوں گے اور پھر اس نے کون سا خود کشتی لڑنی تھی اپنے پٹھے کو ہی لڑانی تھی...... اسے پتہ نہیں تھا کہ کیا مصیبت اس کے گلے پڑنے والی ہے۔

اگلے روز دوپہر کو کشتیوں کا آغاز ہوا۔ پہلی ایک دو کشتیاں تو صاف طور پر نورا نظر آ رہی تھیں۔ پھر کچھ صحیح کشتیاں بھی ہوئیں۔ دھیرے دھیرے دنگل میں گرمی پیدا ہوتی گئی۔ ڈھول زور و شور سے بج رہے تھے۔ بھنگڑے ڈالے جا رہے تھے اور جیتنے والے پہلوانوں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور ہو رہی تھیں۔ اس تماشے کے اردگرد پولیس پارٹی کے ارکان سادہ کپڑوں میں موجود تھے اور ہر مشکوک شخص پر نظر رکھے ہوئے تھے...... کشتیاں ہوتی رہیں اور تھوڑی دیر بعد بلال شاہ کے پٹھے کی باری بھی آ گئی۔ اس نوجوان کا نام اسد تھا۔ یہ ایک سابقہ نمبردار کرموں جٹ کا بیٹا تھا۔ اچھے جسم کا مالک تھا لیکن قد کچھ چھوٹا تھا۔ اوپر سے اسے بلال شاہ جیسا پیر استاد ملا ہوا تھا۔ کشتی شروع ہوئی تو مخالف پہلوان نے اسے پہلا داؤ ہی ایسا مارا کہ وہ پانچ فٹ ہوا میں اچھل کر بلال شاہ کے قدموں میں جا گرا۔ چت ہونے میں بس تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی۔ حریف پہلوان نے اسے دبوچ لیا اور سینے کے زور سے رگید رگید کر چاروں شانے چت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پٹھے سے زیادہ بلال شاہ کا اپنا زور لگ رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اسے داؤ بتا رہا تھا۔ کبھی اکڑوں بیٹھتا تھا، کبھی اپنا سر زمین سے لگا دیتا تھا، کبھی بے بسی سے

ہماری طرف دیکھنے لگتا تھا۔ داؤ بتاتے بتاتے اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اکھاڑے میں پاؤں رکھ دیا۔ اس بات پر مخالف پہلوان کا خلیفہ بھڑک اُٹھا۔ اس نے چلا کر بلال شاہ سے کہا کہ وہ اتنا ہی سانڈ ہے تو خود میدان میں آجائے۔ بلال شاہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے دیا۔ مخالف پہلوان کے خلیفے نے اسی وقت بھڑک کر قمیص اُتار پھینکی پھر دھوتی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور ران پر ہاتھ مار کر بولا۔

''میں تجھ سے دس پندرہ سال بڑا ہوں لیکن ابھی ان ہڈیوں میں اتنی طاقت ہے کہ تجھ جیسے بندگو بھی کا عرق نکال سکوں۔ باپ کا ہے تو ابھی آ میدان میں۔''

بلال شاہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے لیکن باپ کی گالی درمیان میں آ گئی تھی وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ بہت سے لوگ بلال کی طرف دیکھ کر شور مچانے لگے۔ ''اُٹھ جاؤ خلیفہ جی...... اتار دیو کپڑے...... ہو جائے ہتھ جوڑی۔'' بلال شاہ کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پاس جا کر کہا۔ ''دودھ جلیبیاں اور ادھ رڑ کے حرام مت کرو۔ خلیفہ بنے ہو تو بن کے دکھا دو۔ ہو جانے دو جو ہوتا ہے۔'' لوگ دائیں بائیں سے بلال شاہ کو دھکیلنے لگے اور عمر رسیدہ افراد نے ہمت افزائی کے لئے تھپکیاں دینا شروع کر دیں۔ اس دوران بلال شاہ کے پٹھا صاحب بھی اکھاڑے میں چاروں شانے چت ہو گئے۔ لوگوں نے شور مچا دیا۔ سب انسپکٹر درویش علی نے بلال شاہ کے کان میں کہا۔ ''شاہ جی ہن تے تہاڈی کشتی بن دی اے۔ تخت تے بیٹھ جاؤ یا تختہ ہو جاؤ۔''

مخالف خلیفے نے اکھاڑے میں داخل ہو کر ایک ٹانگ پر رقص کیا اور بلبلی مار دی۔ اب معاملہ بلال شاہ کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اس نے بھی قمیص اتار پھینکی۔ مخالف خلیفے کی طرح دھوتی بھی اتار پھینکی لیکن سب سے نیچے اس نے جانگیہ نہیں پہن رکھا تھا۔ ایک پہلوان نے اپنا سرخ جانگیہ یعنی لنگوٹ بلال شاہ کو پیش کیا۔ ہم سب نے مل ملا کر لنگوٹ بلال شاہ کو کسایا۔ بس کچھ نہ پوچھیں لنگوٹ میں بلال شاہ کیسا لگ رہا تھا۔ اب بھی منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ لنگوٹ نہ اسے باندھنا آتا تھا نہ ہمیں۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ ابھی کھلا ابھی کھلا۔ تھل تھل کرتی خمیرے آٹے جیسی توند نے سامنے سے لنگوٹ کو مکمل طور پر چھپا رکھا تھا۔ چھاتی ڈھلکی ہوئی تھی اور کندھے آگے کو جھکے ہوئے تھے۔ اکھاڑے میں پہنچ کر بلال شاہ نے اپنے حریف کی طرح پنجوں پر اچھلنے کی کوشش کی لیکن ایسا کرنے سے اس کی توند اور چھاتیاں ایسے بے ڈھنگے طریقے سے ہلیں کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ بلال شاہ کا حریف عمر میں بڑا ضرور تھا لیکن تھا پہلوان۔ بلال شاہ کی طرح جعلی خلیفہ نہیں تھا۔ وہ خاصا

با اعتماد دکھائی دیتا تھا اب بلال شاہ کو لنگوٹے میں جلوہ گر دیکھ کر اس کا اعتماد کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ منصف نے کشتی شروع کرائی۔ حریف پہلوان اکو نے کس کر بلال شاہ کی گردن پر کسوٹا مارا۔ بلال شاہ چکر کھا کر اکھاڑے سے باہر گرا لیکن گرتے ساتھ ہی تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ بلال شاہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کرنا جانتا تھا۔ بندے کو ایسا جن جھپا مارتا تھا کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ مگر یہ کشتی تھی لڑائی نہیں تھی اور کشتی بھی ایک تجربہ کار پہلوان سے۔ اس نے بلال شاہ کی گردن پر ہاتھ رکھا اور ایسا کھینچا مارا کہ وہ بیچارہ دو تین قلابازیاں کھا گیا۔ لوگوں نے شور کر کے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ بلال شاہ اُٹھتا اکو نے اسے جا دبوچا۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیں۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ وہاں جو کچھ بلال شاہ سے ہوا یادگار تھا۔ اس کم بخت نے بلال شاہ کو اُٹھا اُٹھا کر پٹخا اور پیچ پیچ کر اُٹھایا۔ ہوش ہی نہیں آنے دی اس نے۔ ہمیں ہر گھڑی یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ کہیں بلال شاہ کا لنگوٹ بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ یہ آخری کسر بھی نکل جاتی تو وہ یقیناً خودکشی کے بارے میں سنجیدہ ہو جاتا۔ مخالف پہلوان واقعی استاد تھا۔ وہ بلال شاہ کو رگید تو رہا تھا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں وہ چت نہ ہو جائے کیونکہ وہ چت ہو جاتا تو کھیل ختم ہو جاتا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ بلال شاہ خود چت ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ چت نہیں ہونے دیتا تھا...... پھر اچانک وہی بات ہوئی جس کا مجھے خطرہ تھا۔ بلال شاہ کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی اور یہ کشتی سیدھی سادی لڑائی میں بدل گئی۔ خود کو حریف پہلوان سے چھڑا کر بلال شاہ اکھاڑے سے باہر لپکا۔ اندر سے صاف ظاہر تھا کہ پختہ اینٹ یا ایسی ہی کوئی اور چیز ڈھونڈنے نکلا ہے...... بلال شاہ کو قابو کرنے کے لئے میں اور درویش علی اس کی طرف بھاگے اور اس وقت میری نگاہ شہباز پہلوان پر پڑی...... شہباز پہلوان...... جو اب پہلوان نہیں تھا۔ ایک خونی قاتل اور ڈکیت تھا۔

پہلوان نے پگڑی باندھ رکھی تھی۔ پگڑی کا پلو ٹھوڑی کے نیچے سے گزار کر بائیں کان میں اڑسا ہوا تھا۔ اس طرح ڈھاٹا سا بن گیا تھا اور شہباز پہلوان کی صورت آدھے سے زیادہ چھپ گئی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے اردگرد سفید کپڑوں میں پولیس والے موجود ہیں۔ جب بلال شاہ اپنے مخالف پہلوان کو گالیاں دیتا اکھاڑے سے باہر بھاگا تو شہباز پہلوان نے اسے دبوچ لیا۔ ایک ہاتھ بلال شاہ کی بغلوں کے نیچے سے گزار کر اس نے بلال شاہ کو یوں اُٹھا لیا جیسے چیل چوزے کو اُٹھاتی ہے۔ بلال شاہ شہباز پہلوان کی گرفت میں بُری طرح مچل رہا تھا۔ شہباز پہلوان نے مزاحیہ انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ بلال شاہ کو پچکار رہا تھا۔

"بس جانے دو خلیفہ جی۔ کشتی میں غصہ اچھا نہیں ہوتا...... ویسے بھی تمہارا لنگوٹ ڈھیلا ہوگیا ہے۔ کہیں گر ہی نہ جائے۔"

بلال شاہ تو جیسے غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ اگر اسے شہباز پہلوان نے نہ پکڑا ہوتا تو یقیناً وہ اب تک خود کو چھڑا چکا ہوتا اور اپنے حریف پہلوان سے اس کی کھلم کھلا جنگ ہوگئی ہوتی۔ ایک دم ہی شہباز پہلوان اور بلال شاہ کے گرد لوگوں کا ہجوم ہوگیا۔ بلال شاہ کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور طیش کے عالم میں جو اس کی زبان پر آ رہا تھا کہتا چلا جا رہا تھا۔ اکھاڑے میں تو وہ مخالف پہلوان سے مات کھا گیا تھا لیکن زبانی کلامی اس نے اپنے حریف کی سات پشتوں کو وہ رگڑے دیئے کہ خدا کی پناہ۔ ایک دو بزرگ پہلوانوں نے پوچھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ وہ کیوں اتنا سیخ پا ہو رہا ہے۔

بلال شاہ گرج کر بولا۔ "اس حرامی نے مجھے ماں بہن کی گالیاں دی ہیں۔"

یہ سراسر الزام تھا۔ اصل بات میں اچھی طرح جانتا تھا، یقیناً دوسرے لوگ بھی جان گئے ہوں گے۔ دراصل حریف پہلوان نے بلال شاہ کو جان بوجھ کر خوار کیا تھا۔ بلال شاہ پر حاوی ہونے کے باوجود وہ کشتی کو طول دیتا رہا۔ پھر ایک موقع ایسا آیا تھا کہ بلال شاہ خود چت ہو جانا چاہتا تھا تاکہ اس کی جان چھوٹے لیکن وہ اسے چت بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا کہ بلال شاہ زور لگا کر اپنے دونوں کندھے زمین سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا اور حریف پہلوان اسے اوندھا کرنے کی فکر میں ہے۔ بڑی دلچسپ کشتی ہوئی تھی یہ اب کشتی سے بھی بڑھ کر دلچسپ لڑائی ہو رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو یقیناً ہم اس لڑائی بھڑائی سے بہت لطف اندوز ہوتے لیکن اب شہباز پہلوان ہمیں نظر آ چکا تھا اور اس خونی پر قابو پانے کا چیلنج ہمارے سامنے تھا۔ میں نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا سرکاری ریوالور نکال لیا اور لوگوں کے درمیان راستہ بناتا شہباز پہلوان کی طرف بڑھنے لگا۔ سامنے سے انسپکٹر اروڑا بھی آہستہ آہستہ شہباز کی طرف آ رہا تھا۔ میری نگاہیں شہباز پہلوان کے اردگرد ٹیک سنگھ کو تلاش کر رہی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ شہباز یہاں ہے تو ٹیک سنگھ بھی آس پاس موجود ہوگا...... اور پھر میں نے ٹیک سنگھ کو دیکھ لیا۔ وہ شہباز کی بائیں جانب کھڑا تھا۔ اس نے ایک گرم چادر پگڑی کے اوپر سے گزار کر گردن کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ رنگ سانولا اور آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ نظر آتی تھیں۔ ابھی میں اور انسپکٹر اروڑا شہباز سے آٹھ دس فٹ دور ہی تھے کہ اچانک بجلی سی لپک گئی۔ شہباز کے پیچھے سے سب انسپکٹر راجندر برآمد ہوا اور ست سری اکال کا نعرہ لگا کر اس نے شہباز کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ سب انسپکٹر راجندر کافی لحیم شحیم نوجوان تھا۔ کبڈی کھیلتا

تھا اور اس کی گرفت بڑی مشہور تھی لیکن اس نے جسے پکڑا تھا وہ شہباز پہلوان تھا اور شہباز پہلوان کو جھپا ڈالنے کی کوشش کو "غلطی" کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا تھا۔ میں نے شہباز پہلوان کو تیزی سے گھومتے دیکھا، چند لمحوں کے لئے راجندر نے شہباز پر گرفت قائم رکھنے کی کوشش کی پھر پسلیوں میں ایک زوردار کہنی کھائی اور اچھل کر دور جا گرا۔ اتنے میں سب انسپکٹر درویش علی بھی شہباز پر جا پڑا۔ اس نے پیچھے سے آکر بڑی پھرتی سے اپنی پگڑی شہباز کے گلے میں ڈال دی اور کھینچا مار کر اسے کمر کے بل گرانے کی کوشش کی۔ شہباز تھوڑا سا لڑکھڑا کر ایک بار پھر سنبھل گیا۔ شاید درویش علی کا دوسرا جھٹکا اسے گرا ہی دیتا لیکن اس دوران ٹیک سنگھ حرکت میں آ گیا۔ درویش علی ٹیک سنگھ کی موجودگی سے بالکل بے خبر تھا۔ ٹیک سنگھ نے اپنی چادر کے نیچے سے کاربین نکالی اور اس کا دستہ بڑے زور سے درویش علی کی گردن پر مارا۔ درویش علی کے ہاتھ سے پگڑی چھوٹ گئی اور وہ لہرا کر اوندھے منہ اکھاڑے میں جا گرا۔ ایک دم شہباز نے بھی اپنے لباس کے اندر سے ولایتی ریوالور نکال لیا۔ ٹیک سنگھ اور شہباز اندھا دھند ہوائی فائرنگ کرتے مخالف سمت میں بھاگے۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں فائر نہیں کر سکتا تھا۔ چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی اور گولی کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ انسپکٹر اروڑا نے چند ہوائی فائر کئے اور چلا چلا کر شہباز کو رکنے کا حکم دینے لگا۔ اس چیخ و پکار کا بھلا کیا اثر ہونا تھا۔ ہم آگے پیچھے بھاگتے اکھاڑے سے کوئی ایک فرلانگ آگے نکل آئے۔ یہ دربار صاحب کا پچھواڑا تھا۔ یہاں ایک چھوٹے چوک سے تین گلیاں مختلف سمتوں میں نکلتی تھیں۔ درمیان والی گلی میں خاکی رنگ کی ایک کھٹارہ جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ شہباز، ٹیک سنگھ اور ان کا ایک ساتھی بھاگتے ہوئے جیپ میں سوار ہوگئے۔ جیپ کا رخ ہماری طرف تھا۔ اس کے اندر ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔ ڈرائیور نے پھرتی سے جیپ ریورس کی۔ وہ اسے واپس موڑنا چاہتا تھا لیکن گلی تنگ تھی۔ جیپ کا رخ مڑتے مڑتے ہم بھاگنے والوں کے سر پر پہنچ سکتے تھے۔ میرے دل میں امید کی کرن روشن ہوئی کہ شاید ہم شہباز اور ٹیک سنگھ کو گھیر لیں لیکن پھر ہماری آنکھوں نے طاقت کا ایک زبردست مظاہرہ دیکھا۔ شہباز پہلوان جست لگا کر جیپ سے اُترا۔ جیپ کے پچھلے بمپر پر ہاتھ ڈالا اور دونوں پہیے اُٹھا کر جیپ کو گھما ڈالا۔ رخ مڑتے ہی جیپ کمان سے نکلے تیر کی طرح بڑی سڑک کی طرف گئی۔ میں نے شہباز پہلوان کو بھاگ کر جیپ میں کودتے اور اوجھل ہوتے دیکھا۔ اس وقت جیپ سے میرا فاصلہ بیس گز کے قریب تھا۔ اس موقع پر میں نے بڑی احتیاط سے جیپ کے ٹائروں پر تین گولیاں چلائیں لیکن نشانہ خطا گیا۔ جیپ شور مچاتی اور دھول اُڑاتی بڑی سڑک کی طرف نکل گئی۔

☆======☆======☆

سری امرتسر کی دیوالی سے شہباز اور ٹیک سنگھ کا نکل بھاگنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ واقعہ یوں کچھ اور سنگین ہو گیا تھا کہ جیپ میں فرار ہوتے وقت ملزموں نے بڑی سڑک کے موڑ پر ایک سائیکل سوار کو بھی روند ڈالا تھا۔ سائیکل سوار بُری طرح زخمی ہوا تھا اور سائیکل کے کیریئر پر بیٹھی ہوئی ایک گڑیا سی لڑکی موقع پر جاں بحق ہو گئی تھی۔ دربار صاحب سے فرار ہو کر شہباز ایک بار پھر اپنی کمین گاہ یعنی پورن کچھ میں گھس چکا تھا۔ ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے دوبارہ زمیندار دھنی رام کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ یہ ریسٹ ہاؤس کپورتھلہ سے چالیس میل دور دریائے ستلج کی جانب ایک دشوار گزار علاقے میں واقع تھا۔ پہلے بھی ہم شہباز کے تعاقب میں اس ریسٹ ہاؤس سے آگے نہیں جا سکے تھے، اب پھر وہی مسئلہ درپیش تھا۔ ریسٹ ہاؤس سے آگے ڈیک نالہ تھا اور نالے سے آگے گھنا جنگل تھا جہاں قدم رکھنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ایک برس پہلے اسی علاقے میں انگریز کپتان کی کمپنی تباہ و برباد ہوئی تھی۔ دھنی رام سنگھ ابھی تک ریسٹ ہاؤس میں موجود تھا۔ وہ سارا دن شکار کھیلتا، شام کو مے نوشی کرتا اور رات کو اپنی عمر سے آدھی بیوی کے ساتھ خواب گاہ میں گھس جاتا۔ پچھلی دفعہ بلال شاہ بھی ہمارے ساتھ تھا اور وہ ادھیڑ عمر دھنی رام کی نوعمر بیوی پر بڑے چٹ پٹے تبصرے کیا کرتا تھا مگر اس دفعہ بیچارا امرتسر میں تھا اور اپنی ناک کی چوٹ کا علاج کرا رہا تھا۔ یہ چوٹ اسے کشتی کے دوران ہی آئی تھی اور کافی خون بہا تھا۔ پھر سوجن اس کی آنکھوں کو چڑھ گئی تھی اور دو گھنٹوں میں چہرہ نیلا کچ ہو گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں ہمیں چھٹا ساتواں دن تھا جب ایک ضروری کام سے مجھے واپس اپنے تھانے جیون جانا پڑا۔ میں نے اپنے عملے کو ضروری ہدایات دیں اور دو دن میں واپس آنے کا کہہ کر پورن کچھ سے براستہ امرتسر جیون پہنچ گیا۔ تھانے پہنچا ہی تھا کہ بلال شاہ آدھمکا۔ اس کی سوجن اُتر چکی تھی اور چہرے کا رنگ بھی تقریباً ٹھیک تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی بتایا کہ میرے لئے اس کے پاس ایک اہم خبر ہے۔ میں نے کہا۔ ”سناؤ۔“ وہ بولا۔

”مجھے یقین ہے خان صاحب، نجمہ کا اب بھی شہباز پہلوان سے رابطہ ہے۔“ نجمہ کا نام میرے ذہن سے اُتر چکا تھا۔ میں سوالیہ نظروں سے بلال شاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔

”وہی نرس نجمہ جناب، جو شہباز کو بھائی کہتی ہے اور اس سے ملنے لاہور جاتی رہتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا شک ہوا ہے تمہیں اس پر؟“

وہ بولا۔ ”شک نہیں جناب، یقین ہوا ہے۔ میں نے خود نجمہ کے پاس ایک خط دیکھا

ہے اس پر شہباز احمد کا نام لکھا ہوا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”لیکن تم اس نرس سے کہاں ملے تھے؟“

وہ اپنی زخمی ناک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”امرتسر ہسپتال میں اسی سے مرہم پٹی تو کرواتا رہا ہوں میں۔“ اب پوری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے بلال شاہ سے تفصیل پوچھی کہ وہ پہلوان اور نجمہ کے رابطے میں کیا جانتا ہے۔ اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”پرسوں کی بات ہے ڈریسنگ روم میں نجمہ میری پٹی اتار رہی تھی کہ ایک ڈاکٹر گھبرایا ہوا اندر آیا۔ اس نے نجمہ سے کوئی ٹیکہ مانگا جو کسی بے ہوش مریض کو لگایا جاتا تھا۔ یہ ٹیکہ ڈریسنگ روم کی الماری میں رکھا تھا۔ الماری کی چابی نجمہ کے پاس تھی۔ اس نے اپنے سفید کوٹ کی جیبوں میں چابی ڈھونڈی لیکن وہ ملی نہیں۔ ڈاکٹر اسے جھڑکنے لگا۔ نجمہ پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی اور گھبرا گئی۔ وہ جلدی جلدی اپنی جیبیں اور میز کے دراز وغیرہ دیکھنے لگی۔ گھبراہٹ میں اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس نے اپنی جیب سے کچھ چیزیں نکال کر سامنے میز پر رکھ دی ہیں۔ ان میں جیبی رومال، روپے اور کاغذات وغیرہ تھے۔ انہی کاغذات میں مجھے ڈاک کا ایک لفافہ نظر آ گیا۔ اس پر امرتسر کے گروالی دروازے کا پتہ لکھا تھا اور نیچے لکھنے والے کا نام شہباز احمد لکھا ہوا تھا۔ میرا جی چاہا کہ نظر بچا کر یہ لفافہ اُٹھا لوں مگر موقع نہیں ملا۔ اسی دوران نجمہ کو چابی مل گئی اور اس نے سارے کاغذات وغیرہ اُٹھا کر واپس جیب میں رکھ لئے۔“

مجھے بلال شاہ کی اطلاع میں کوئی چونکا دینے والی بات نظر نہیں آئی۔ ڈاک کے لفافے پر شہباز احمد لکھا ہوا تھا ممکن تھا یہ کوئی دوسرا شہباز ہو، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بلال شاہ کو نام پڑھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔ وہ جتنا پڑھا لکھا تھا مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ سوائے چھٹی کی عرضی کے وہ کوئی خط خود نہیں لکھ سکتا تھا۔ چھٹی کی عرضی میں بھی وہ بخدمت کو ”بخدمط“ اور عرض ہے کو ”ارض“ ہے لکھنا اس کا پرانا مشغلہ ہے۔ میں نے کہا۔ ”شاہ جی! ہو سکتا ہے یہ کوئی اور شہباز احمد ہو یا پھر......“

بلال شاہ کی آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی۔ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”آپ تو خواہ مخواہ ٹھنڈے دودھ پر پھونکیں مار رہے ہیں۔ اتنی اہم اطلاع آپ کو دے رہا ہوں اور آپ کو قدر ہی کوئی نہیں ہے، اس خط والی بات کی تو اب پوری تصدیق ہو گئی ہے۔ ایک فیصد بھی شک نہیں رہا ہے اس میں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا ’’دیکھیں خان صاحب۔ ذرا غور کریں بات پر۔ پرسوں میں نے نجمہ کے پاس وہ خط دیکھا ہے اور آج صبح مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ اپنے بھائی حسنین کے ساتھ دیپالپور جا رہی ہے۔‘‘

دیپالپور کا نام سن کر میری دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ کپورتھلہ سے قریباً پینتیس میل دور پورن کچھ کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں ایک پولیس چوکی اور سکھوں کی ایک چھوٹی سی زیارت بھی تھی۔ اس دور دراز قصبے میں نرس نجمہ کا جانا کیا معنی رکھتا تھا۔ اگر نجمہ واقعی جا رہی تھی تو یہ معاملہ اہم ہو جاتا تھا۔ میں نے بلال شاہ سے پوچھا کہ نجمہ کب روانہ ہو رہی ہے۔ وہ بولا ’’کل صبح۔‘‘

میں نے پوچھا ’’صرف چھوٹے بھائی کے ساتھ جا رہی ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ بلال شاہ نے اپنا ’’کدو‘‘ نفی میں ہلایا۔ ’’نجمہ کا بہنوئی بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس کا نام عاقل ہے۔ وہ ہائیکورٹ میں پیش کار ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ بڑا ہوشیار بندہ ہے۔ نجمہ نے میرے سامنے دو تین مرتبہ اس کا ذکر کیا ہے۔‘‘

میرے اور بلال شاہ کے درمیان کافی دیر یہ گفتگو ہوتی رہی۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ دو ہوشیار مخبر نجمہ کے پیچھے لگا دیئے جائیں اور وہ چوبیس گھنٹے اس پر نگاہ رکھیں۔

جیون تھانے میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد میں پھر پورن کچھ روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ بلال شاہ بھی میرے ساتھ تھا۔ کپورتھلہ سے قریباً تیس میل آگے بڑی سڑک سے ایک چھوٹی سڑک اس قصبے کی طرف جاتی تھی جہاں نجمہ کو جانا تھا۔ دیپالپور نامی یہ قصبہ صرف چار میل کے فاصلے پر تھا لیکن ہمارا وہاں جانا ٹھیک نہیں تھا۔ ویسے بھی دو مخبر سائے کی طرح نجمہ اور اس کے بہنوئی کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ ہم وہاں جا کر اور کیا تیر مار لیتے۔ ان دونوں مخبروں کے پاس دھنی رام سنگھ کے ریسٹ ہاؤس کا مکمل پتہ موجود تھا۔ کوئی اہم اطلاع ہوتی تو وہ فوراً ہم سے رابطہ قائم کر سکتے تھے...... شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم واپس ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

ریسٹ ہاؤس کی رات بڑی افسانوی قسم کی ہوتی تھی۔ ہوا ویران درختوں میں خراٹے بھرتی ہوئی گزرتی اور رات کے سناٹے میں میلوں دور سے جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔ کبھی کبھی کوئی گیدڑ ریسٹ ہاؤس کے بالکل نزدیک چلا آتا اور اچانک چیخ کر سونے والوں کا سکون درہم برہم کر دیتا۔ جب کبھی ایسا ہوتا تو چوکیداری کرنے والے کتے زور زور سے بھونکنے لگتے اور اصطبل کی پختہ دیواریں گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے گونج اُٹھتیں۔ گھوڑوں کا انگریز سائیس رابرٹ انہیں چپ کرانے کے لئے زور زور سے آوازیں نکالتا اور

اس کی آواز اصطبل کے روشن دانوں سے نکل کر ریسٹ ہاؤس کے ہر کمرے میں پہنچ جاتی۔ وہ رات بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ ہلکی بوندا باندی نے سردی میں کچھ اور اضافہ کر رکھا تھا۔ میں، بلال شاہ، انسپکٹر اروڑا اور سب انسپکٹر راجندر ریسٹ ہاؤس کے ایک کشادہ کمرے میں موجود تھے۔ انسپکٹر اروڑا اور راجندر تو بالترتیب چھ اور چار پیگ پی کر سرِشام ہی سو گئے تھے۔ صرف میں اور بلال شاہ جاگ رہے تھے۔ بلال شاہ آج کافی ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔ اس میں ایک بڑی اچھی عادت تھی۔ چھوٹی موٹی غلطیاں وہ تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن جب کوئی بڑی غلطی ہو جاتی تھی تو فوراً تسلیم کر لیتا تھا۔ امرتسر کی دیوالی میں جو غلطی ہوگئی تھی اسے بھی اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ دنگل کے آدھ پون گھنٹے بعد جب اس کا غصہ اُتر گیا تھا تو وہ خود مخالف پہلوان کے پاس گیا تھا اور اس سے بغل گیر ہو کر صلح صفائی کی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ وہ شغل شغل میں اکھاڑے میں اُتر آیا تھا ورنہ اسے پہلوانی کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہے۔

ہم اپنے اپنے بستر پر لیٹے ہوئے دیوالی کی باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی گھوڑے کی تیز ٹاپیں سنائی دیں۔ پھر کوئی مین گیٹ کے سامنے رک کر اونچی آواز میں چوکیدار سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے لحاف میں سے ہاتھ نکال کر کمرے کی کھڑکی ذرا سی کھولی اور باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ مجھے دکھائی تو کچھ نہیں دیا مگر سنائی دے گیا۔ اس ٹھٹھرتی ہوئی شب میں دس بجے کے قریب جو شخص چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا وہ میرے مخبر صلاح الدین عرف صلو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ صلو ان دو افراد میں سے ایک تھا جنہیں صرف ایک روز پہلے ہم نے نرس نجمہ پروین کے پیچھے لگایا تھا۔ اگر وہ دیپالپور سے دس میل کا فاصلہ طے کر کے ریسٹ ہاؤس ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا تھا تو یقیناً کوئی خاص بات تھی...... اتنی دیر میں بلال شاہ بھی صلو کی آواز پہچان چکا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی اچھل کر لحاف سے باہر آیا۔ ہم دروازہ کھول کر برآمدے میں نکلے اور وہاں سے صحن میں پہنچ گئے۔

’’چوکیدار! یہ اپنا آدمی ہے۔‘‘ میں نے بلند آواز میں کہا۔

چوکیدار نے مڑ کر میری طرف دیکھا پھر صلو کو راستہ دے دیا۔ صلو گھوڑے کو کھینچتا ہوا ہمارے قریب لے آیا۔ وہ اور گھوڑا دونوں ہانپ رہے تھے۔ میں نے ایک شیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صلو سے کہا کہ وہ گھوڑا وہاں باندھ دے۔ صلو بے قراری سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

’’نہیں ہجور اتنا وقت نہیں ہے۔‘‘ اس نے میواتی لہجے میں سرگوشی کی۔ ’’آپ بس کھڑے کھڑے نکل چلیں میرے ساتھ۔ اس سالے کا کھوج لگا لیا ہے ہم نے۔‘‘

"کس کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پریشانی سے پوچھا۔

"شہباج پہلوان کی ہجور۔ وہ خانہ بدوشوں کی ایک بستی میں ہے، وہ کیا نام ہے اس حرامجادی کا...... نجمہ اور اس کا بہنوئی بھی اسی بستی میں ہے۔ آپ جتنی بھی ہو سکے پولیس فورس ساتھ لے لیں اور گھیر لیویں بستی کو۔ چھوٹی سی بستی ہے۔ جیادہ سے جیادہ بیس پچیس گھر ہوویں گے۔"

صلو کی بات پر یقین کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ہوش مند مخبر تھا۔ نشہ وغیرہ بھی نہیں کرتا تھا۔ اسے کیا ضرورت تھی غلط اطلاع دینے کی۔ میں نے پوچھا۔ "بستی کتنی دور ہے یہاں سے؟"

وہ بولا۔ "یہی کوئی چھ میل کا راستہ ہووے گا۔ میں ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ آپ دعا کریں وہ لوگ ابھی وہیں پر ہوں۔"

میرے اشارے پر بلال شاہ نے ریسٹ ہاؤس میں فوراً غل غپاڑہ مچا دیا۔ انسپکٹر اروڑا اور سب انسپکٹر راجندر سمیت وہاں موجود ہر ذی روح جاگ گیا۔ یہاں تک کہ دھنی رام سنگھ بھی اپنی دھوتی کا پلو درست کرتا اور بڑبڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔ دس منٹ کے اندر اندر عملے نے بھاگ دوڑ کر وردیاں پہنیں۔ اسلحہ سنبھالا اور چھاپے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس علاقے میں گاڑی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صرف گھوڑوں پر سفر کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے پاس بھی گھوڑے تھے۔ چھاپہ مار پارٹی کل پندرہ افراد پر مشتمل تھی۔ راستہ دیکھنے کے لئے ہمارے پاس تین ٹارچیں تھیں۔ ریسٹ ہاؤس سے بھی دو لالٹینیں لے لی گئیں۔ یوں کیل کانٹے سے لیس ہو کر ہم صلاح الدین عرف صلو کی رہنمائی میں خانہ بدوشوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں مَیں صلو سے مسلسل پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ نرس نجمہ پروین اپنے بہنوئی عاقل پرویز کے ساتھ آج شام چار بجے کے قریب دیپالپور کے قصبے میں پہنچی تھی۔ صلاح الدین اور اس کا ساتھی مہتاب سنگھ مسلسل اس کے تعاقب میں تھے۔ دیپالپور پہنچ کر نجمہ اور عاقل کسی کے گھر میں نہیں گئے تھے، نہ ہی وہ کسی سے ملے۔ عاقل نے قصبے کی ایک دکان سے نان پکوڑے خریدے۔ پھر کھیتوں میں بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر وہاں ستانے کے بعد پیدل ہی ڈیک نالے کی طرف چل دیئے۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا ہوا تو عاقل نے ایک ٹارچ جلالی۔ اس کے کندھے سے دونالی بندوق بھی لٹک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دونوں پوری تیاری کر کے آئے ہیں۔ انہوں نے ایک دو راہ گیروں سے راستہ بھی پوچھا اور شام آٹھ بجے کے قریب خانہ بدوشوں کی ایک بستی میں پہنچ

گیے۔ انہیں بستی میں گئے ابھی پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ڈیک نالے کی طرف سے پانچ گھڑسوار نمودار ہوئے۔ وہ صلو اور مہتاب کے بالکل پاس سے ہو کر بستی میں داخل ہوئے۔ ان میں سے تین مسلح دکھائی دیتے تھے اور اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ صلو نے ان میں سے شہباز پہلوان کو صاف پہچان لیا۔ اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے وہ سب سے الگ نظر آ رہا تھا۔ جونہی شہباز پہلوان بستی میں گھسا صلو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ریسٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا۔

صلو سے تفصیل پوچھتے پوچھتے ہم خانہ بدشوں کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ بونداباندی رک گئی تھی لیکن درختوں میں سرسراتی نہایت ٹھنڈی ہوا جسم پر چھریاں چلا رہی تھی۔ بستی واقعی چھوٹی سی تھی۔ اسے گھیرے میں لینا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ ہم گھوڑے سے اُتر آئے اور بڑے محتاط طریقے سے ناکہ بندی کر لی۔ چوتھی طرف ایک بڑا سا جوہڑ تھا اور اس جانب سے کسی کے بھاگنے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مخبر مہتاب سنگھ نے بتایا کہ پہلوان اور اس کے ساتھی ابھی تک بستی میں ہی ہیں۔

صلو کے مطابق شہباز کے ساتھیوں کی کل تعداد چار تھی۔ جب کہ مخبروں سمیت ہم کل سترہ افراد تھے۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی وافر مقدار میں تھا۔ قوی امید تھی کہ آج شہباز ہم سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ شہباز پہلوان کے لئے شروع شروع میں میرے دل میں جو ہمدردی تھی وہ اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس کے چھوٹے بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ٹیک سنگھ کے ساتھ رہ کر شہباز بھی ٹیک سنگھ ہی بن گیا ہے۔ چند روز پہلے اس نے امرتسر کی دیوالی میں جس طرح اندھا دھند گولیاں چلائی تھیں اور خود کو بچاتے ہوئے جس طرح ایک پھول سی بچی کو جیپ تلے روندا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بے رحم بدمعاش کے روپ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ اب شواہد سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے نرس نجمہ کو خط لکھ کر یہاں بلایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نجمہ کو یہاں بلانے کا کیا مقصد ہے۔ کبھی کبھی یہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ شاید سورگ باشی انسپکٹر نہال سنگھ کی بات درست ہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بھائی بہن کا تو بس چکر ہی ہے ورنہ نجمہ اور شہباز میں عشق معشوقی کا معاملہ ہے۔ پہلے نجمہ شہباز سے ملنے لاہور جاتی تھی اب ویرانے میں چلی آئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ بہنوئی کو بھی اصل معاملے کی خبر نہ ہو اور یہاں پہنچ کر نجمہ شہباز کے ساتھ نو دو گیارہ ہو جائے۔ رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ جو شخص چھوٹے بھائی کے پیار پر ڈاکہ ڈال سکتا ہے وہ کسی بھی رشتے کی دھجیاں بکھیر سکتا ہے۔

چھاپہ مار پارٹی کے ارکان نے محفوظ جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اس کے بعد

فیصلہ یہ ہوا کہ میں اور سب انسپکٹر راجندر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر جائیں گے اور شہباز پہلوان سے ہتھیار رکھوانے کی کوشش کریں گے۔ ابھی ہم اس منصوبہ بندی میں مصروف تھے کہ دائیں جانب جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ پھر ایک ساتھ کئی دھماکے ہوئے اور گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر گئیں۔ ایک گولی سب انسپکٹر درویش علی کے پیٹ میں لگی اور وہ تڑپ کر زمین پر جا گرا۔ ہم نے بھاگ کر درختوں کے پیچھے آڑ لینا چاہی تو پہلو کی طرف سے بھی گولیاں چلنے لگیں۔ چند لمحوں کے لئے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گولیاں بستی کی طرف سے نہیں ڈیک نالے کی طرف سے آ رہی تھیں، فائرنگ ایک دم شروع ہوئی تھی اور اتنی شدت سے ہوئی تھی کہ پولیس پارٹی تتر بتر ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بستی کی طرف سے بھی اکا دکا فائر ہونے لگے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون کس پر گولی چلا رہا ہے۔ ڈیک نالے کی طرف سے گاہے گاہے ست سری اکال کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک عورت کے للکارے تھے جو چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی میں اور بلال شاہ گیلی زمین پر اوندھے گر گئے تھے۔ گولیاں ہمارے اوپر درختوں اور شاخوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ دھماکوں اور شور و غل سے سارا جنگل گونج رہا تھا، رہی سہی کسر خانہ بدوشوں کے کتوں نے پوری کر دی تھی۔ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اُٹھا رہے تھے......صورت حال ابھی واضح نہیں تھی تاہم آثار سے یوں لگتا تھا کہ نشے میں مخمور سکھوں کے کسی جتھے نے خانہ بدوشوں کی بستی پر حملہ کیا ہے۔ دفعتاً چند گز دور مجھے ایک ہیولا نظر آیا۔ میں نے ٹارچ روشن کی تو ایک ادھیڑ عمر سکھ روشنی میں نہا گیا۔ وہ اپنی دو نالی بندوق میں کارتوس بھر رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ جالندھر کا سول جج ہری کرشن سنگھ تھا۔ یہ وہی کرشن سنگھ تھا جو جالندھر سے وچن سنگھ پہلوان کے ساتھ آیا تھا اور جب وچن سنگھ اکھاڑے میں شہباز کے ہاتھوں مارا گیا تو ہری کرشن سنگھ نے چلا چلا کر مجھے شہباز کو گرفتار کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اب یہ جج صاحب قانون اپنے ہاتھ میں لئے ان تاریک درختوں میں کھڑے تھے اور میں انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

''خبردار'' میں نے گرج کر کہا۔

میرا ریوالور ٹارچ کے آگے تھا اور جج ہری کرشن سنگھ اسے صاف دیکھ سکتا تھا وہ چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا......اس دوران فائرنگ ایک دم رک گئی تھی۔ میں اُٹھ کر ہری کرشن سنگھ کے پاس پہنچا۔ ''جج صاحب، آپ یہاں؟''

اب وہ بھی مجھے پہچان چکا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس کے چہرے پر پریشانی کے سائے

لہرائے لیکن پھر فوراً ہی افسرانہ سج دھج واپس آ گئی۔ وہ بارعب لہجے میں بولا۔ ''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ہم تو یہاں شہباز کی گرفتاری کے لئے آئے تھے۔''

وہ بولا۔ ''ہم کو بھی یہی اطلاع ملی تھی......''

''لیکن پولیس پارٹی پر حملہ کیا گیا ہے۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

وہ قدرے حیرت سے بولا۔ ''یہ میں تم سے ہی سن رہا ہوں کہ یہاں کوئی پولیس پارٹی بھی موجود ہے۔''

بستی کے اندر سے بلند ہونے والی گرج دار آوازوں نے ہماری گفتگو کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم بستی کی طرف بڑھے تو یہاں مسلح سکھوں کا جمگھٹا سا نظر آیا۔ ان کی تعداد بیس سے کم نہیں تھی۔ سب کے سب رائفلوں، کلہاڑیوں اور ریوالوروں سے مسلح تھے۔ ان میں ایک ہٹی کٹی عورت بھی تھی۔ اس نے مردوں کی طرح کمر سے گولیوں کی پٹی باندھ رکھی تھی اور اکڑ اکڑ کر چل رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہلاک ہونے والے پہلوان وچن سنگھ کی بڑی بھاوج تھی۔ اس نے سوگند کھا رکھی تھی کہ شہباز پہلوان سے اپنے دیور کی موت کا بدلہ ضرور لے گی۔ ان لوگوں کو بھی کل شام ہی پتہ چلا تھا کہ شہباز پہلوان اپنی ایک رشتے دار سے ملنے بدھ کی رات دیپالپور کے قریب خانہ بدوشوں کی بستی میں آئے گا۔ بجائے اس کے کہ اس بات کی اطلاع پولیس کو دی جاتی وچن سنگھ کے رشتے داروں نے خود ہی شہباز سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ پوری تیاری کے ساتھ یہ لوگ یہاں پہنچے اور بستی پر ہلہ بول دیا لیکن نشے میں چور ان حملہ آوروں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ یہاں پہلے سے پولیس پارٹی گھات لگائے بیٹھی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندھیرے میں وہ پولیس پارٹی سے ہی ٹکرا گئے۔ یعنی ان سکھوں نے رات کے بارہ بجے کے قریب پورا پورا سکھوں والا کام کیا تھا۔ اس ہنگامے کا جو نتیجہ نکلا وہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ افراتفری کا فائدہ اُٹھا کر شہباز اور اس کے ساتھی با آسانی بستی سے فرار ہو گئے۔ یعنی دو ملوانوں میں مرغی حرام ہو گئی۔ جب ہم بستی میں پہنچے تو وہاں شہباز تھا نہ اس کے ساتھی اور نہ نجمہ۔ اس کے علاوہ ہنگامے میں سب انسپکٹر درویش علی اور وچن سنگھ پہلوان کے دو رشتے دار بھی زخمی ہوئے۔

بستی کے سانسی سردار تلکو رام سے پوچھ گچھ کی گئی۔ وہ چرس اور تاڑی کا رسیا ایک بھیانک صورت والا شخص تھا۔ اس کی تین بیویاں تھیں۔ اس نے بتایا کہ ٹیک سنگھ علاقے کا خطرناک ترین شخص ہے۔ اس سے دشمنی مول لینا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ پولیس کی صورت

تو یہاں کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتی ہے جب کہ ٹیک سنگھ ہر وقت پورن کچھ میں دندناتا رہتا ہے۔سردار تلکورام نے کہا۔

”مائی باپ! پرسوں ٹیک سنگھ کا آرڈر آیا تھا۔اس نے بستی سے دو جوان لڑکیاں منگوائی تھیں۔ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ بدھ کی رات کو میرے کچھ مہمان تمہارے پاس آئیں گے ان کی اچھی طرح خاطر تواضع کرنا اور مہمانوں میں جو لڑکی ہوگی اسے حفاجت سے دیپالپور تک چھوڑ آنا......“

سردار تلکورام بڑا مسکین بن رہا تھا۔مجھے معلوم تھا وہ جتنا مسکین بن رہا ہے اتنا ہے نہیں۔اگر اس نے ٹیک سنگھ کے موج میلے کے لئے بستی کی لڑکیاں بھیجی تھیں تو ضرور ٹیک سنگھ سے کچھ لیا بھی ہوگا۔یہاں کے سارے خانہ بدوش، ڈاکو اور مفرور وغیرہ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کرتے تھے۔مل جل کر قانون کی دھجیاں اُڑاتے تھے اور جب کوئی ایک پکڑا جاتا تھا تو سارا الزام دوسرے پر دھر دیتا تھا۔میں نے سردار سے پوچھا کہ جو لڑکیاں پرسوں بھیجی گئی تھیں وہ اب کہاں ہیں؟ اس اچانک سوال پر سردار گڑبڑا گیا۔پہلے اس نے جھوٹ بولنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔مریل سی آواز میں بولا۔”وہ شہباز پہلوان کے ساتھ ہی واپس آئی ہیں۔اس وقت دوسرے خیمے میں ہیں۔“

میں نے کہا۔”انہیں بلاؤ۔“ ایک شخص سردار کے اشارے پر لڑکیوں کو لینے چلا گیا۔

مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ابھی کچھ دیر پہلے مخبر صلو نے اطلاع دی تھی کہ شہباز پہلوان بستی میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ چار گھڑسوار تھے۔اب سردار بتا رہا تھا کہ دو لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ شہباز کے ساتھ چار نہیں دو آدمی تھے۔دوسرے دو گھوڑوں پر لڑکیاں تھیں۔تھوڑی ہی دیر میں لڑکیاں ہمارے سامنے آ گئیں۔ان کی عمریں اٹھارہ اور بائیس برس کے درمیان تھیں۔رنگ سانولے اور صورتیں بھی واجبی سی تھیں۔شاید کسی وقت وہ خوبصورت رہی ہوں گی لیکن ٹیک سنگھ جیسے مردوں کے ساتھ راتیں کالی کر کے ان کا رنگ روپ اُڑ چکا تھا۔انسپکٹر اروڑا نے ایک علیحدہ خیمے میں لے جا کر لڑکیوں سے پوچھ گچھ کی......قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ باہر نکلا۔اس دوران میں دوسرے لوگوں کے بیان لیتا رہا تھا۔انسپکٹر اروڑا نے بتایا کہ لڑکیوں سے اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی کہ سردار تلکورام نے ”دوراتوں“ کے بدلے ٹیک سنگھ سے آدھ سیر چرس اور ریشمی کپڑے کے دو تھان لئے تھے اور یہ چیزیں اس وقت بھی تلکورام کے خیمے میں موجود ہوں گی۔لڑکیوں نے بتایا تھا کہ انہیں ٹیک سنگھ کے ڈیرے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔انہیں آنکھوں پر پٹی باندھ

کر وہاں لے جایا گیا تھا اور واپسی کے وقت ویسے ہی اندھیری رات تھی۔ڈیرے میں لڑکیوں کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو شرابی مردوں کے جمگھٹے میں دو اجنبی لڑکیوں کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ وہ اڑتالیس گھنٹے ”آن ڈیوٹی“ رہی تھیں۔

لڑکیوں کے بیان کے بعد تلکورام کے خیمے کی تلاشی لی گئی تو چٹائی کے نیچے سے ایک زمین دوز جستی ٹرنک برآمد ہوا۔اس ٹرنک میں ریشمی کپڑے کے کم از کم پندرہ تھان، دس سیر چرس اور دس تولے کے طلائی زیورات تھے۔یہ ساری حرام کی کمائی تھی جو اس سانسی سردار نے بستی کی عورتوں کو شرابی مردوں کے آگے ڈال ڈال کر جمع کی تھی۔اعانتِ جرم اور جسم فروشی کے الزام میں سردار تلکورام کو گرفتار کر لیا گیا اور ہم زخمی درویش علی کو چارپائی پر ڈال کر دیپالپور کی طرف روانہ ہو گئے۔وچن سنگھ کے رشتے داروں نے بھی اپنے زخمیوں کو اُٹھایا اور دیپالپور چل دیئے۔

طبی امداد ملنے سے سب انسپکٹر درویش علی کی جان بچ گئی لیکن اس واقعے نے مجھے بہت بددل کر دیا۔میں بالکل غیر جانبداری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اور قانون کا محافظ بن کر قانون کے مجرم کو ہتھکڑی لگانا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف پہلوان وچن سنگھ کے لواحقین اسے ”سکھوں کا مسئلہ“ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ان کے دماغ میں یہ بات گھسی ہوئی تھی کہ مسلمان پہلوان نے سکھ پہلوان کو قتل کیا ہے۔اب مسلمان پہلوان کو انجام تک پہنچانا سکھوں کی ذمے داری ہے اور تو اور سول جج ہری کرشن جیسا شخص بھی بندوق ہاتھ میں لئے دندناتا پھر رہا تھا۔بجائے اس کے کہ وہ پولیس کی مدد کرتا اس نے اپنی جلد بازی سے بنا بنایا کام بگاڑ دیا تھا۔اب شہباز پہلوان پھر آزاد تھا اور ڈیک نالہ پار کر چکا تھا۔سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ خود کو اس کیس سے الگ کر لوں۔مجھے شہباز سے کوئی ہمدردی تھی نہ وچن سنگھ کے رشتے داروں سے کوئی بیر۔اس معاملے میں الجھ کر میں خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا ہو رہا تھا۔جو کام میں کر رہا تھا وہ کوئی اور پولیس انسپکٹر بھی کر سکتا تھا......اور اگر کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا تو وچن سنگھ کے رشتے دار تو کر ہی سکتے تھے۔

میں نے ایس پی صاحب کے نام ایک درخواست لکھ دی کہ تھانے میں کام کی زیادتی کے سبب میرا جیون میں رہنا ضروری ہے لہٰذا وچن سنگھ قتل کیس کے معاملے میں انسپکٹر اروڑا کے ساتھ کسی دوسرے انسپکٹر کو اٹیچ کر دیا جائے......جس روز میں نے ایس پی کے دفتر یہ درخواست بھیجی اس سے اگلے روز ڈاک کے ذریعے مجھے ایک خط موصول ہوا۔یہ خط جیون تھانے کے ایڈریس پر تھا۔میں نے لفافہ کھولا اور یہ جان کر حیران رہ گیا کہ خط لکھنے والا شہباز

پہلوان ہے یعنی وہ اشتہاری ملزم جس کی خاطر ہم کئی ہفتے پورن کچھ کی خاک چھانتے رہے تھے۔ یہ خط شہباز پہلوان نے اپنے کسی پڑھے لکھے ساتھی سے لکھوایا تھا۔ تاہم خط کے آخر میں اس نے اپنے انگوٹھے لگائے ہوئے تھے۔ خط کا مختصر مضمون اس طرح تھا۔

''انسپکٹر نواز خان، میں مجرم نہیں تھا۔ سیدھا سادا پہلوان تھا۔ اگر آج میں قاتل ہوں تو اس میں سارا قصور تم پولیس والوں کا ہے۔ اب تم میری تلاش میں چھاپے مار رہے ہو، میری گرفتاری کے لئے بے گناہوں کو پکڑ رہے ہو اور تکلیفیں دے رہے ہو۔ یاد رکھو جو بو رہے ہو وہ کاٹنا پڑے گا۔ اسی طرح جیسے نہال سنگھ کو کاٹنا پڑا ہے......''

میں نے اس مختصر خط کو کئی بار پڑھا۔ تحریر کچھ جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ بڑی نرمی کے ساتھ لمبے لمبے حرفوں میں لکھا گیا تھا۔ اچانک میں نے تحریر شناخت کر لی۔ یہ سو فیصد نرس نجمہ کی لکھائی تھی۔ (نرس نجمہ نے مقتول انسپکٹر نہال سنگھ کو لکھ کر دیا تھا کہ شہباز پہلوان سے اس کا کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وچن سنگھ کی موت کے بعد اس سے ملا ہے۔ یہ اعتراف نامہ ابھی تک میرے پاس موجود تھا) میں نے دونوں تحریروں کا موازنہ کیا اور مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ خط اصلی ہے اور شہباز نے نجمہ سے لکھوا کر بھیجا ہے جو اپنے بہنوئی کے ساتھ اب اس کے ڈیرے پر ہے۔ خط پر کپورتھلہ کے ایک ڈاک خانے کی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا اس ڈاک خانے میں جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے خط کو لاپرواہی سے دراز میں پھینک دیا۔

اسی شام میں گھومنے کے لئے باہر کھیتوں میں گیا تو شہباز پہلوان کے چھوٹے بھائی ایاز عرف ایازی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ان دنوں قصبے میں ہی تھا۔ اکھاڑے میں زور کر کے آ رہا تھا۔ سارا جسم مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ بھائی کی طرح اس کا قد کاٹھ بھی اچھا تھا۔ دیکھنے میں دیو نظر آتا تھا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

بولا۔ ''آپ ہی کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بڑی ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔''

میں نے کہا۔ ''اس حالت میں میری طرف آ رہے تھے کیا بہت پسوڑی والی بات ہے؟''

شرمندہ ہو کر بولا۔ ''جی نہیں۔ ابھی تو کنوئیں پر جا رہا تھا۔ وہاں سے نہا کر سیدھا آپ ہی کی طرف آنا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے نہا آؤ۔ میں بھی اتنی دیر میں چکر لگا کر واپس آ جاتا ہوں۔''

میں تھوڑی سی ہوا خوری کر کے واپس آیا تو ایازی تھانے میں آیا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تھانیدار جی، مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ شہباز والے کیس سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''ابھی ایسا ہوا تو نہیں لیکن ہو بھی جائے تو تمہیں اس میں کیا اعتراض ہے؟''

کہنے لگا۔ ''جناب! مجھے اتنی جرأت نہیں کہ اعتراض کر سکوں۔ میں تو صرف درخواست ہی کر سکتا ہوں اور میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس معاملے سے پیچھے نہ ہٹیں۔ آپ ہٹ گئے تو ہم سب کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''پہلیاں نہ بجھواؤ۔ جو بات ہے کھل کر بیان کرو۔''

جواب میں ایازی نے کہا۔ ''لالہ شہباز اتنا بدل گیا ہے کہ اب اسے لالہ کہتے بھی شرم آتی ہے۔ غیر تو غیر اب وہ اپنوں کو بھی جان سے مارنے کی دھمکیاں دینے لگا ہے۔ ہمارا ایک ماماں بالکل سیدھا سادا اور بھلا مانس آدمی ہے۔ لالے نے ایک دفعہ اپنے ایک یار کے لئے مامے کی لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔ زبانی کلامی بات ہو گئی تھی لیکن پھر معاملہ خراب ہو گیا۔ یہ رشتہ جوڑ کا نہیں تھا اس لئے مامے نے انکار کر دیا۔ اب اس لڑکی کی شادی ہوئے بھی تین چار مہینے ہو چکے ہیں۔ لالے نے مامے کو پیغام بھجوایا ہے کہ وہ بیٹی کو طلاق دلا کر اس کا رشتہ پہلی جگہ پر کر دے ورنہ بڑا فساد ہوگا۔ اسے بیٹی اور داماد دونوں سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اب وہ میاں بیوی چھپتے پھر رہے ہیں۔ مامے کو الگ اپنی فکر پڑی ہوئی ہے۔ وہ بیچارا پرانا مریض ہے۔ اب بالکل چارپائی سے لگ گیا ہے۔ لالے نے ماں کو بھی دھمکی دی ہے کہ وہ اس معاملے میں بالکل نہ آئے ورنہ اسے بھی پچھتانا پڑے گا۔''

ایاز احمد نے پوری تفصیل سے یہ بات بتائی پھر رو دینے والے لہجے میں بولا۔ ''تھانیدار جی! آپ اس معاملے میں بالکل ڈھیل نہ ڈالیں۔ لالے اور اس کتے ٹیک سنگھ کو پکڑنا بس آپ ہی کے بس کا روگ ہے......''

میں نے ایازی کے خیالات پوری توجہ سے سنے۔ وہ شہباز کے خلاف غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس غم و غصے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ شہباز نے اس کی محبوبہ پر نہ صرف ناجائز قبضہ جمایا تھا بلکہ اسے بُری طرح مارا پیٹا بھی تھا۔ جہاں تک ماموں والی بات کا تعلق ہے مجھے اس میں زیادہ وزن محسوس نہیں ہوا۔ شاید ایازی مجھے ہوشیار کرنے کے لئے یہ واقعہ بیان کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تھوڑی بہت بات ہو اور ایازی نے اسے بڑھا چڑھا کر میرے سامنے پیش کر دیا ہو۔ جب تک میں اس واقعے کے اصل کرداروں سے نہ ملتا کوئی

معتبر رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے ایازی کو سمجھایا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی بات نہ کرے۔ میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ پھر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں اس کے ماموں سے ملوں گا اور اگر کوئی ڈر خطرے والی بات ہوئی تو اس کا سدِباب کروں گا۔

میں نے ماموں سے ملنے کا ذکر کیا تو ایازی بوکھلا سا گیا۔ کہنے لگا۔ ''نہیں، جتنی بات تھی وہ میں نے بتا دی ہے۔ مامے نے ہی مجھے آپ کی طرف بھیجا تھا۔ وہ کافی بیمار ہیں، ہلنا جلنا بھی مشکل ہو رہا ہے ان کے لئے۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ لڑکے نے بات کا بتنگڑ بنایا ہے۔ وہ چند الٹی سیدھی باتیں کر کے میرے پاس سے چلا گیا...... لیکن پھر صرف دو روز بعد ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ مجھے وہی کرنا پڑا جو ایازی چاہتا تھا۔ یہ واقعہ اتنا سنگین تھا کہ مجھے ایک بار پھر پوری تندہی کے ساتھ شہباز کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ اس دفعہ اس تلاش میں فرضی شناسی کے ساتھ ذاتی غم و غصہ بھی شامل تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ شہباز سامنے ہو اور میں اسے گولی سے اُڑا دوں۔ اس روز مجھے تھانے میں ضروری کام تھا اس لئے عشاء کی اذان دفتر میں ہی ہو گئی۔ آٹھ بجے کے قریب میں اُٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ایک سنتری ہانپتا ہوا اندر آیا۔ اس نے کہا۔ ''جناب! سنا ہے آپ کے کوارٹر میں آگ لگ گئی ہے۔'' پھر اس نے جلدی سے کمرے کی کھڑکی کھولی اور باہر جھانکنے لگا۔ یہ کھڑکی باہر کی گلی میں کھلتی تھی اور قصبے کے مکان کافی دور تک نظر آتے تھے۔ سنتری نے باہر نظر دوڑائی اور پکار کر بولا۔ ''وہ دیکھئے جی۔ لالی نظر آرہی ہے، دھواں بھی اُٹھ رہا ہے۔'' میں بھی لپک کر کھڑکی پر پہنچا۔ سنتری نے جو کہا حرف بہ حرف درست تھا۔ قصبے میں کسی مکان کو آگ لگی ہوئی تھی اور عین ممکن تھا کہ یہ میرا ہی رہائشی کوارٹر ہو۔ دماغ چکرا کر رہ گیا۔

میں اور عملے کے چند ارکان افراتفری کی حالت میں کوارٹر تک پہنچے۔ اس بات کی تصدیق راستے میں ہی ہو گئی کہ آگ میرے کوارٹر میں لگی ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ منظر میں نے آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر بلال شاہ کی تھی۔ وہ اس وقت میرے کوارٹر میں سو رہا تھا۔ پتہ نہیں اس پر کیا گزری تھی۔ پورا کوارٹر دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ لوگ قریبی جوہڑ سے برتنوں میں پانی بھر بھر کر آگ پر پھینک رہے تھے لیکن شعلوں کے تیور دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ آگ سب کچھ جلا کر ہی بجھے گی۔ میں نے پاس کھڑے لوگوں سے بلال شاہ کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ باہر نکل آیا ہے۔ چھت پر چڑھ کر اس نے کوارٹر کے پچھواڑے

چارے کے ڈھیر پر چھلانگ لگا دی تھی۔ میں لوگوں کے ہجوم میں بلال شاہ کو ڈھونڈنے لگا۔ جلد ہی وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ ایک قریبی گلی میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اردگرد محلے والے موجود تھے۔ کوئی اس کی ہتھیلیوں پر مالش کر رہا تھا، کوئی پانی پلا رہا تھا۔ دھوئیں کی وجہ سے بلال شاہ کا دم بُری طرح اکھڑ گیا تھا۔ جلد ہی میرے تھانے کا عملہ بھی آگ بجھانے میں مصروف ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ کی سخت کوشش کے بعد شعلے سرد پڑ گئے۔ کوارٹر کی صرف دو تین دیواریں ہی بچ سکی تھیں۔ باقی چھت اور ساز و سامان سمیت ہر چیز راکھ ہو گئی تھی۔ مجھے زیادہ افسوس ان کاغذات کا تھا جو میری الماری میں رکھے تھے۔ ان میں چند ضروری فائلوں کے علاوہ میری ذاتی ڈائری بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ میرے اہلِ خانہ کی نادر تصویروں کا ایک البم تھا جس کا نقصان مجھے تازندگی نہ بھول سکے گا۔ بلال شاہ کی بھی قسمت اچھی تھی جو بچ گیا تھا ورنہ کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ وہ بڑی پکی بلکہ ''لوہے توڑ'' نیند سوتا تھا۔ سرہانے چھوٹا موٹا بم بھی پھٹ جائے تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جب آگ لگی تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ پھر کمرے میں دھواں بھر گیا اور دم گھٹنے سے بلال شاہ اُٹھ بیٹھا۔ اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلاتا وہ دروازے تک پہنچا۔ خوش قسمتی ہی تھی کہ اس کا ہاتھ سیدھا چٹخنی پر پڑا اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ برآمدے کی چھت کا ایک جلتا ہوا حصہ اس کے بالکل قریب گرا۔ وہ سانس روکے روکے سیڑھیوں تک پہنچا اور بھاگتا ہوا چھت پر آ گیا۔ کمرے کی چھت کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پچھواڑے میں چارے کے ڈھیر پر چھلانگ لگا دی لیکن یہاں اس کی قسمت نے تھوڑا سا دغا دیا۔ چارے کے قریب ہی لکڑی کی کھرلی پڑی تھی۔ بلال شاہ کا ایک پاؤں چارے پر اور دوسرا کھرلی پر پڑا۔ کھرلی پر پڑنے والے پاؤں میں چوٹ آئی تھی۔ بیچارے کے بُرے دن آئے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ ماہ پہلے وہ سائیکل سے گر گیا تھا۔ پھر امرتسر کی دیوالی میں جہاندیدہ پہلوان نے اسے ادھ مواء کیا۔ اب کھرلی میں گر کر بیچارے کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا۔

کوارٹر میں آگ لگنے کی اطلاع سنتے ہی میرے ذہن میں جو سب سے پہلا نام آیا وہ شہباز کا تھا۔ صرف دو روز پہلے وہ خط کے ذریعے مجھے دھمکی دے چکا تھا کہ میں جو کچھ بو رہا ہوں وہ کاٹنا پڑے گا۔ موقعے کے گواہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ میرے کوارٹر کو آگ لگانے والا شہباز ہی ہے۔ میرے پڑوسیوں میں سے ایک نے آگ لگنے کے فوراً بعد پٹرول کی بو سونگھی تھی۔ وہ بھاگ کر گلی میں آیا تو کوارٹر کے اندرونی دروازے دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ اس نے دو ڈھاٹا پوش گھڑ سواروں کو دیکھا جو تیزی سے گھوڑے بھگاتے ہوئے گلی کا موڑ

مڑ گئے۔ ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں اور ایک اپنے جثے سے پہلوان نظر آ رہا تھا۔ قصبے کے پرچون فروش تایا پرشاد نے بھی تصدیق کی کہ دکان بند کرنے سے پہلے اس نے دو گھڑسواروں کو دیکھا تھا۔ وہ کوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک گھڑسوار کا گھوڑا کافی بڑا تھا اور وہ خود بھی بہت صحت مند نظر آتا تھا۔ دونوں سواروں نے چہرے پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے اور لگتا تھا دور سے سفر کرتے آئے ہیں۔ سب سے اہم بیان نائی کرم دین کا تھا۔ کرم دین آگ لگنے کے کوئی دو گھنٹے بعد قصبے میں پہنچا۔ میرے جلے ہوئے کوارٹر کو دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔ ''مجھے یقین تھا قصبے سے کوئی خیر کی خبر نہیں ملے گی۔'' وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ شام سے کچھ ہی دیر بعد اس کی مڈبھیڑ مفرور ٹیک سنگھ اور شہباز سے ہوئی تھی۔ وہ تقریباً آٹھ گھڑسواروں کے ساتھ روہی کی طرف جا رہے تھے۔ نائی کرم دین نے کہا۔ ''مجھے دیکھ کر انہوں نے گھوڑے روک لئے۔ شہباز پہلوان نے پوچھا کدھر سے آ رہا ہے کرموں؟ میں نے بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں ایک شادی کا شگن دینے جا رہا ہوں۔'' شہباز پہلوان نے کہا۔ ''ایک شگن میں نے بھی دینا ہے جیون میں لیکن دل کرتا ہے کہ خود ہی جاؤں۔'' اس کے لہجے سے میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی خطرناک دھمکی دے رہا ہے۔ میں نے بات وہیں پر ٹھپ کر دی۔ شہباز پہلوان نے ولایتی شراب کی ایک بوتل میری طرف اچھال دی اور نشے میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''دوسروں کی شادیاں کراتے مر جاؤ گے۔ تمہاری اپنی شادی تو ہونی نہیں...... کچھ اور نہیں تو اس لال پری کو ہی ہونٹوں سے لگا لیا کرو۔'' پھر وہ سب گھوڑے بھگاتے جیون کی طرف چلے گئے۔

اب یہ بات ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ آگ لگنے سے چند گھنٹے پہلے شہباز اور ٹیک سنگھ اس علاقے میں موجود تھے اور کسی خطرناک ارادے سے جیون کی طرف آ رہے تھے۔ اب وہ ارادہ پورا ہو چکا تھا۔ میرا گھر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا اور راکھ کے اس ڈھیر میں سے بلال شاہ نے بمشکل اپنی جان بچائی تھی...... اس واردات کی خبر بارہ گھنٹے کے اندر اندر امرتسر اور جالندھر تک پھیل گئی۔ اگلے روز ایک مقامی اخبار میں چھوٹی سی خبر بھی لگ گئی۔ سرخی تھی۔ ''اشتہاری ملزم کی طرف سے پولیس انسپکٹر کو زندہ جلانے کی کوشش۔ سرکاری کوارٹر جل کر راکھ ہو گیا۔''

یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شہباز اور ٹیک سنگھ کی گرفتاری کے لئے ایک بار پھر تندہی سے کوشش شروع ہو گئی۔ انگریز ایس پی صاحب نے اسی روز مجھے امرتسر بلایا۔ تسلی تشفی دینے کے بعد کہا۔ ''گاڈ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ ہم ملزم کے خلاف ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اب اس نے اوچھا وار کر کے ہمیں ہوش دلایا ہے۔ اب وہ گرفتار ہو کر رہے گا۔ ہم اسے گرفتار کریں

گے چاہے اس کے لئے کتنا بڑا قربانی بھی دینا پڑے۔ اٹ از انڈرسٹوڈ ناؤ۔ تمہیں جس طرح کا ہیلپ چاہیے ملے گا۔ تم اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس لئے ہم تمہاری درخواست نامنظور کرتے ہوئے تمہیں اس جاب پر برقرار رکھنا چاہتا ہے۔''

میں اب خود بھی اس جاب پر برقرار رہنا چاہتا تھا۔ اس شخص یعنی شہباز پہلوان کے ساتھ شروع شروع میں مجھے کچھ ہمدردی ضرور تھی لیکن پھر اس کا رویہ دیکھ دیکھ کر یہ ہمدردی کم ہوتی گئی اور اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مسلمان تھا اور جالندھر کی ایک سکھ برادری اس کی دشمن ہو رہی تھی لیکن اس دشمنی کو ہوا دینے میں وہ برابر کا قصوروار نظر آ رہا تھا۔ دوست اور دشمن کی پہچان اس میں ختم ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ خونی رشتے بھی اس کے لئے بے کار ہو گئے تھے۔

☆======☆======☆

وہ فروری کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ میں ایک بار پھر پورن کچھ جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ محمود غزنوی کے سترہ حملوں کی طرح میرا بھی پورن کچھ پر یہ چوتھا حملہ تھا۔ جیون سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایازی سے بات چیت کی۔ وہ پولیس پارٹی کے ساتھ پورن کچھ جانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ شہباز کے خلاف کارروائی میں بھرپور حصہ لے۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! تم یہاں رہ کر میری جتنی مدد کر سکتے ہو وہ پورن کچھ جا کر نہیں کر سکتے۔ میں چاہتا ہوں تم یہاں رہو اور جو کام میں تمہارے ذمے لگاؤں اسے ٹھیک طریقے سے کرو۔''

''کون سا کام؟'' اس نے نیم دلی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ شہباز کی کوئی محبوبہ ہے جو امرتسر میں رہتی ہے اور شہباز کو رقعے وغیرہ بھی لکھتی رہی ہے۔'' ایازی اقرار میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا۔ ''اس لڑکی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ مجھے یقین ہے وہ لڑکی ہاتھ آ جائے تو شہباز زیادہ دیر آزادی کے مزے نہیں لوٹ سکے گا۔ تم کسی طرح اس لڑکی کا کھوج لگا لو تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہو گا اور مجھے یقین ہے تم یہ کام کر بھی سکتے ہو۔ شہباز تمہارے گھر کا بندہ تھا۔ اس کے ملنے جلنے والے سارے تمہاری نظر میں ہوں گے۔ پوچھ گچھ کرو گے تو کوئی تم پر شبہ بھی نہیں کرے گا۔''

بات کچھ کچھ ایازی کی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ چہرے پر الجھن بھی تھی۔ کہنے لگا۔ ''تھانیدار جی! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ نرس نجمہ ہی وہ لڑکی ہے۔ دیکھیں ناں اب

وہ ٹیک سنگھ کے ڈیرے پر ہے اور مزے سے وہاں رہ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔''یہ تمہاری سوچ ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے یقین ہے شہباز کی محبوبہ کوئی عام شکل صورت والی لڑکی نہیں ہوگی اور تم نے دیکھا ہی ہے نرس نجمہ بالکل معمولی لڑکی ہے۔ وہ بڑے دعوے سے شہباز کو 'بھائی' بھی کہتی رہی ہے۔'' ایازی جز بز نظر آنے لگا۔

میں نے اس کی خاموشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔''تم اپنے دماغ سے یہ بات نکال دو کہ نرس نجمہ ہی وہ لڑکی ہے۔ بس یہ سمجھو کہ وہ لڑکی اس وقت امرتسر میں ہے اور تمہیں اسے ڈھونڈ کر سامنے لانا ہے۔''

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے ایاز کو اس کام کے لئے تیار کرلیا اور وہ مجھ سے رخصت ہو کر اسی وقت امرتسر روانہ ہوگیا۔ وہ ابھی تھانے سے نکل کر چند گز دور ہی گیا ہوگا کہ میری نگاہ اس کرسی پر پڑی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں سرخ رنگ کا ایک بٹوہ پڑا تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہ بٹوہ ایازی کی جیب سے گرا ہے۔ میلوں ٹھیلوں سے ملنے والا یہ ایک سستا سا بٹوہ تھا۔ شوقین لڑکے ایسے بٹوؤں میں ایکٹرسوں کی تصویریں بھی لگا لیتے تھے۔ ایازی نے کھلے بازوؤں والی ریشمی قمیص پہن رکھی تھی۔ ایسی قمیضوں کے پہلو میں جیب ہوتی ہے۔ غالباً جیب سے کوئی چیز نکالتے ہوئے غلطی سے اس نے بٹوہ کرسی پر گرا دیا تھا۔ میں نے بٹوہ پکڑ کر کھولا اور سنتری کو پکارنے کے ارادے سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مقصد یہ تھا کہ سنتری بٹوہ ایازی کو دے آئے لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ بٹوہ کھولتے ہی میری نظر ایک تصویر پر پڑی تھی۔ یہ تصویر کسی ایکٹرس کی نہیں تھی۔ ایک نوجوان لڑکی تھی جو کسی دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ دوپٹے پر تھا۔ لگتا تھا لڑکی کو بتائے بغیر تصویر اتار لی گئی ہے۔ بڑی مدھم سی تصویر تھی۔ غور کیا تو پتہ چلا کہ لڑکی کے پیچھے ایک گھوڑے کی گردن اور لکڑیوں کا گٹھا بھی نظر آرہا ہے۔ تصویر کے پیچھے دل بنا کر اس میں سے تیر گزارا گیا تھا اور بڑے دردناک شعر لکھے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہی لڑکی ایاز کی محبوبہ صفیہ ہے اور اسی کی وجہ سے بڑے بھائی کے ساتھ اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ تصویر ٹیک سنگھ کے ڈیرے پر ہی کہیں اتاری گئی ہے۔ میں کچھ دیر لڑکی کے خدوخال پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر شعر پڑھنے لگا۔ ان شعروں میں جہاں محبوب کی جدائی کا رونا تھا وہاں اس خونی رشتے سے گلہ بھی تھا جس نے پیار کرنے والوں کے دلوں پر آرے چلائے تھے اور ہوس میں اندھا ہو کر مہکتی کلیوں کو بے رحمی کے کانٹوں میں پرو دیا تھا۔ اس تصویر اور تصویر پر لکھے شعروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ صفیہ نام کی وہ لڑکی ایازی کے دل پر گہری لگی ہوئی ہے۔ وہ رات دا...

اس کی جدائی میں تڑپتا ہے اور بڑے بھائی کے سلوک کا ماتم کرتا ہے۔ بٹوے میں اور کوئی چیز میرے کام کی نہیں تھی۔ میں نے سنتری کو بلا کر بٹوہ اسے دے دیا اور کہا کہ وہ اسے ایازی کے گھر پہنچا دے۔

اسی شام ہم براستہ کپورتھلہ پورن کچھ پہنچ گئے۔ ایک بار پھر وہی ریسٹ ہاؤس ہمارا مورچہ تھا جہاں ہم اس سے پہلے کئی ہفتے گزار چکے تھے۔ ایک طرح سے اس ریسٹ ہاؤس تک پہنچ کر ہماری دوڑ ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے ڈیک نالہ تھا اور نالے کے پار وہ خطرناک جنگل میلوں تک پھیلا ہوا تھا جہاں داخل ہونا موت کو دعوت دینا تھا۔ ہماری بدقسمتی تھی کہ پچھلے دو ماہ میں شہباز تین چار دفعہ اس جنگل سے باہر آیا تھا لیکن ہم اسے گھیر نہیں سکے تھے۔ اب ہمیں خود اس جنگل میں گھسنا تھا یا پہلے کی طرح ایک بار پھر منہ لٹکا کر اس کا انتظار کرنا تھا۔ گھوم پھر کر میری سوچ ہر مرتبہ شہباز کی گمنام محبوبہ کی طرف چلی جاتی تھی۔ اس لڑکی کا کھوج لگ جاتا تو شہباز کو کسی نہ کسی بہانے اس پناہ گاہ سے باہر نکالا جا سکتا تھا۔ مگر وہ گدھے کی سر سے سینگوں کی طرح غائب تھی اور کوئی ایسا قریبی رشتے دار بھی نہیں تھا جس کے ذریعے شہباز پر دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ دو ہفتے پہلے شہباز کی والدہ بھی اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر کہیں رُوپوش ہو چکی تھی۔ غالباً وہ پولیس کی کھینچا تانی سے بچنا چاہتی تھی۔ ویسے وہ رُوپوش نہ بھی ہوتی تو مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ یہ میرا طریقہ کار ہی نہیں تھا۔ کسی بے گناہ سے زیادتی کر کے یا اس کی زندگی خطرے میں ڈال کر ایک ملزم کو پکڑنا میرے نزدیک فرض شناسی نہیں ہے۔

شہباز کے چھوٹے بھائی ایازی نے ہاتھ سے لکیریں کھینچ کر ہمیں ایک نقشہ بنا دیا تھا۔ اس نقشے میں ٹیک سنگھ کے مرکزی ڈیرے تک پہنچنے کے مختلف راستے دکھائے گئے تھے۔ ساتھ ساتھ ان ٹھکانوں کی نشاندہی بھی کی تھی جہاں مسلح آدمیوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ ایسا ہی ایک نقشہ ہمارے پاس بھی موجود تھا۔ میں اور انسپکٹر اروڑا یہ دونوں نقشے سامنے پھیلا کر بیٹھ گئے اور دو روز مسلسل سوچ بچار کرتے رہے۔ ہم کوئی ایسا منصوبہ بنانا چاہتے تھے جس میں جانی نقصان کا خطرہ کم سے کم ہو اور ڈاکو پولیس پارٹی کو چکمہ بھی نہ دے سکیں۔ ہماری منصوبہ بندی کے دوران ہی بارشیں شروع ہو گئیں۔ تمام راستے بند ہو گئے اور ہمیں ریسٹ ہاؤس کی چار دیواری میں بند ہونا پڑا...... ان دنوں پولیس پارٹی کے لئے ریڈیو سننے، سونے اور تاش کھیلنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ چند روز بعد جب بلال شاہ وہاں پہنچ گیا تو ماحول میں قدرے خوشگواری آگئی۔ انسپکٹر اروڑا کے سوا تمام عملے سے بلال شاہ کی چھیڑ چھاڑ تھی۔ صبح سے شام تک یہ ہلا گلا جاری رہتا۔ ریسٹ ہاؤس کے مالک دھنی رام سنگھ کی نوخیز بیوی سے بلال شاہ کو

خاصی چڑ تھی۔ وہ اس کی چال ڈھال کی نقل اتارتا اور اسے دلچسپ گالیاں دے کر عملے کے سینے میں ٹھنڈ ڈالتا۔

ایک ہفتے بعد بارشوں کا سلسلہ رکا اور ہم نئے سرے سے کمر کسنے لگے، لیکن اسی دوران جالندھر کے سول جج ہری کرشن صاحب اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وہاں آ دھمکے۔ ان کے لشکر میں ایک ڈی ایس پی، ایک انسپکٹر اور عملے کے کوئی پچیس ارکان تھے۔ ان کے پاس جدید اسلحے کے علاوہ دو وائرلیس سیٹ بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک جیپ کو بھی کسی طرح کھینچ تان کر ریسٹ ہاؤس تک لے آئے تھے۔ سول جج صاحب پرائیویٹ طور پر ساتھ آئے تھے بظاہر پولیس پارٹی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ اس پولیس پارٹی کو ترتیب دینے والے اور یہاں لانے والے جناب ہری کرشن صاحب ہی ہیں۔ پہلوان وچن سنگھ کی موت نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی اور وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر شہباز کو پکڑنے کی فکر میں خوار ہو رہے تھے۔ دھنی رام سنگھ نے ہماری طرح دوسری پولیس پارٹی کو بھی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا لیا۔ اس کے لئے دونوں پارٹیوں میں کوئی فرق نہیں تھا...... رات کو میں نے ڈی ایس پی راجپال سے بات چیت کی۔ وہ چوبیس گھنٹے نشے میں غرق رہنے والا ایک سُست الوجود اور ڈھیلا ڈھالا افسر تھا۔ تجربہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ معلوم نہیں وہ کیسے ڈی ایس پی بنا تھا اور جج ہری کرشن اسے کیا سمجھ کر اس پُرخطر مہم پر لے آیا تھا۔ میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔ میرے پوچھنے پر ڈی ایس پی نے گردن تان کر کہا۔ ''کل شام آٹھ بجے وہ اپنی چھاپہ مار ٹیم کے ساتھ ڈیک نالہ پار کر جائے گا اور رات بارہ بجے سے پہلے پہلے ٹیک سنگھ اور شہباز کا ڈیرہ پولیس کے گھیرے میں ہوگا۔'' اس نے مجھے ایک بہت پرانا نقشہ بھی دکھایا جس پر جگہ جگہ سرخ پنسل سے نشان لگے ہوئے تھے۔ ڈی ایس پی کا خیال تھا کہ یہ نادر نقشہ پولیس پارٹی کے لئے خضرِ راہ ثابت ہوگا اور چھاپہ مار عملہ مزے سے ٹہلتا ڈاکوؤں کے ڈیرے پر جا پہنچے گا۔ ڈی ایس پی جالندھر جیل سے ایک قیدی کو بھی ساتھ لایا تھا۔ ڈی ایس پی نے دعویٰ کیا کہ یہ قیدی ٹیک سنگھ کا ساتھی رہا ہے اور علاقے کے ہر نشیب و فراز سے واقف ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی وجہ ہی نہیں کہ پولیس پارٹی راستے میں کسی مصیبت کا شکار ہو۔

میں نے کہا۔ ''راج پال صاحب! میں بڑی عاجزی سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ اس علاقے کے بارے میں میری معلومات آپ سے اور جج صاحب سے زیادہ ہیں۔ یہ نقشہ جو آپ مجھے دکھا رہے ہیں اس سے بہتر نقشہ پچھلے دو مہینے سے میرے پاس موجود ہے لیکن صرف

ایک نقشے کے زور پر آپ کامیاب چھاپہ نہیں مار سکتے ہیں۔ نقشہ تو انگریز کپتان کے پاس بھی موجود تھا۔ آپ کے پاس پچیس آدمی ہیں تو اس کے پاس پوری کمپنی تھی۔ اسلحہ، وائرلیس، مخبر سب کچھ موجود تھا لیکن پھر کیا ہوا۔ کتنے بندے بچ کر آئے تھے واپس؟''

ڈی ایس پی کو تو جیسے کسی بہانے کی ضرورت تھی۔ بھڑک کر بولا۔ ''یہ تم نہیں تمہارے اندر کی بدنیتی بول رہی ہے۔ مجھے پتہ ہے یہ سارا جنگل صاف کر دیا جائے تو تب بھی تم ڈیک نالہ پار نہیں کرو گے۔ بس یہیں بیٹھے منصوبے بناتے رہو گے۔ اگر جان اتنی پیاری ہے تو استعفیٰ دے دو نوکری سے۔ کوئی جنرل سٹور کھول کر بیٹھ جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''جان کس کو کتنی پیاری ہے اس کا پتہ تو وقت آنے پر چلتا ہے۔ میں آپ سے الجھنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے ایک دفعہ اس علاقے کو دیکھ بھال لیں۔''

اتنے میں جج ہری کرشن بھی وہاں چلا آیا۔ اس کے چہرے کی سلوٹوں سے لگتا تھا کہ کونین کی گولی کھا رکھی ہے۔ بڑی سرد مہری سے بولا۔ ''نواز خان! تم اس معاملے میں دخل مت دو۔ ڈی ایس پی صاحب پورے اختیار کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ وہ اس معاملے کو جس طرح ہینڈل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہری صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ یہ انسانی زندگیوں کا معاملہ ہے۔ یقین کریں میری آپ سے کوئی ضد نہیں ہے لیکن میں اس معاملے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اگر پولیس پارٹی نے کھلے عام ڈیک نالہ پار کیا تو سب کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''کچھ خطرے میں نہیں پڑے گا۔'' جج دھاڑا۔ ''صرف تم لوگوں کی ہڈحرامی کا پول کھل جائے گا۔''

میرا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے منہ سے بھی کوئی سخت بات نکل جاتی۔ انسپکٹر اروڑا درمیان میں آ گیا اور اس نے بات رفع دفع کرانے کی کوشش کی۔ میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں جج ہری کشن اور اس کے ہمنواؤں سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہ ہی ٹیک سنگھ اور شہباز سے کوئی ہمدردی تھی لیکن جو بات غلط تھی اسے غلط کہنا میرا سرکاری اور اخلاقی فرض تھا۔ یہ شرابی ڈی ایس پی عملے کے جوانوں کی جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ ڈیک نالے کے ہر درخت کے پیچھے گھات تھی اور اندھی گولیاں کسی بھی وقت موت تقسیم کر سکتی تھیں۔ پولیس اہلکار ہندو تھے، سکھ تھے یا مسلمان۔ امرتسر سے تھے یا جالندھر سے، تھے تو جیتے جاگتے انسان۔ ان کے

سینوں میں بھی دل دھڑکتے تھے۔ دلوں میں خواہشیں تھیں، آرزوئیں اور امیدیں تھیں۔ روزگار کی خاطر وہ گھر سے سینکڑوں میل دور مارے مارے پھر رہے تھے۔ کسی ہری کرشن اور کسی راجپال کو کیا حق پہنچتا تھا کہ اپنے انتقام کی خاطر انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیتا۔ ان لمحوں میں مجھے محسوس ہوا جیسے راجپال کے ساتھ آنے والے اہلکاروں کی زندگی خطرے میں نہیں میری اپنی زندگی خطرے میں ہے۔ کل کوئی اور نہیں میں ڈیک نالہ پار کر کے اندھی گولیوں کی زد میں آنے والا ہوں۔ میرا سینہ غم و غصے سے لبریز ہوگیا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو جائے جج ہری کرشن اور ڈی ایس پی راجپال کو من مانی نہیں کرنے دوں گا...... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ انہیں کیسے روکا جائے۔ ڈی ایس پی راجپال میرا ماتحت نہیں تھا، نہ ہی جج ہری کرشن پر میرا کوئی زور چل سکتا تھا۔ زبردستی کی جاتی تو یہ ڈسپلن کی خلاف ورزی تھی۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ فساد ہی ہو جاتا۔ آجا کے ایک ہی راستہ تھا کہ میں کپورتھلہ پہنچ کر انگریز ایس پی سے رابطہ کروں اور انہیں ساری صورتِ حال بتاؤں۔

میں علی الصبح تین بجے کے قریب جاگا اور نہایت خاموشی سے کپورتھلہ جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس دوران بلال شاہ اصطبل میں جا کر میرے گھوڑے پر زین وغیرہ کس چکا تھا۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ اپنی گرم چادر تو ملی نہیں ایک کانسٹیبل کی چادر سے بکل مار لی تھی۔ اعشاریہ 38 کا بھارا ریوالور میری قمیص کے نیچے موجود تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے مین گیٹ سے نکل کر جونہی میں اصطبل کی طرف بڑھا۔ قریبی برآمدے میں آہٹ ہوئی اور ڈی ایس پی راج پال کا ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے پیچھے لپکا۔

''کہاں جا رہے ہیں جناب؟'' اس نے مجھے پہچان کر اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کسی کام سے جا رہا ہوں۔'' میں نے بھی سرد مہری سے جواب دیا۔

''لیکن...... لیکن ڈی ایس پی صاحب نے کہا ہے، کوئی آدمی بتائے بغیر ریسٹ ہاؤس سے باہر نہیں جائے گا۔''

''میں تمہارے ڈی ایس پی کا آدمی نہیں ہوں اور نہ اس کا حکم ماننا ضروری سمجھتا ہوں۔'' میرے لہجے میں بھی تلخی عود کر آئی۔

میں آگے بڑھا تو ہیڈ کانسٹیبل نے کمال جرأت سے میرا شانہ تھام لیا۔

''جناب! پہلے آپ سر جی سے بات کر لیں۔''

''پیچھے ہٹو۔'' میں نے پھنکار کر کہا۔ ''میں نہیں جانتا تمہارے سر جی کو۔''

اسی بحثا بحثی میں ڈی ایس پی خود بھی باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے جج ہری کرشن بھی سلیپنگ گاؤن سنبھالتا چلا آ رہا تھا۔ ''کیا کہتا ہے یہ؟'' ڈی ایس پی نے بڑی بدتمیزی سے اپنے ماتحت سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''راجپال صاحب، زبان سنبھال کر بات کرو۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

''تو تُو بے عزتی کرے گا میری۔'' راجپال خم ٹھونک کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اُڑ رہے تھے۔ اتنے میں راجپال کا ایک چمچہ سب انسپکٹر جالا پہلو سے آیا اور مجھے دھکا دے کر کہنے لگا۔ ''کیا بات ہے؟'' میرا پیمانہ صبر جو بہت دیر سے ہلکورے لے رہا تھا ایک دم چھلک گیا۔ میرا داہنا ہاتھ گھوما اور سب انسپکٹر تھپڑ کھا کر دور جا گرا۔ ڈی ایس پی نے جواباً مجھے تھپڑ مارنا چاہا لیکن وار خالی گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا، ڈی ایس پی کے قریب کھڑا اے ایس آئی اپنے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ میری بھرپور ٹانگ اس کے سینے پر پڑی اور وہ بھاری بھرکم ڈی ایس پی کو اپنے ساتھ لیتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ بات ایک دم بڑھ گئی تھی اور اس میں سارا قصور ڈی ایس پی اینڈ کمپنی کا تھا۔ یوں لگتا تھا ڈی ایس پی کی ساری نفری میری گھات میں بیٹھی ہے۔ ڈی ایس پی کے زمین بوس ہوتے ہی سب انسپکٹر نے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں اور پانچ چھ اہلکار باہر نکل کر چیلوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک اہلکار نے ریسٹ ہاؤس کا گیٹ باہر سے بند کر دیا تھا تاکہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی باہر نہ آسکے۔ صرف بلال شاہ باہر تھا۔ وہ اصطبل کی طرف سے بھاگتا ہوا آیا۔ دو تین ہٹے کٹے اہلکاروں نے اسے بھی دبوچ لیا۔ ڈی ایس پی نے ہاتھ بڑھا کر ریوالور میرے لباس سے نکال لیا۔ پھر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے بولا۔ ''لے جاؤ دونوں کو اور کمرے میں بند کر دو۔ میں دیکھتا ہوں کیسے ان کی نوکریاں باقی رہتی ہیں۔'' وہ بلال شاہ کو بھی پولیس ملازم ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے جج ہری کرشن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہری کرشن! یہاں قانون کا جو احترام ہو رہا ہے تم دیکھ رہے ہو ناں۔ یاد رکھو میں عدالت میں تم سے اس بارے میں پوچھوں گا۔'' جواب میں ہری کرشن بڑبڑا کر رہ گیا۔ میں چاہتا تو اب بھی مزاحمت کر سکتا تھا اور یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا لیکن بات جتنی بڑھ گئی تھی میں اس سے زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ جالندھر کے پولیس اہلکار مجھے دھکیلتے ہوئے اصطبل کی طرف لے گئے اور چوکیدار کے کمرے میں بند کر دیا۔ بلال شاہ کو بھی میرے ساتھ ہی دھکیل دیا گیا تھا۔ بلال شاہ مسلسل میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

مجھے معلوم تھا اس کی قمیص کے نیچے اب بھی بھرا ہوا ریوالور موجود ہے۔ لڑائی بھڑائی کے دوران میں اشارہ بھی کر دیتا تو بلال شاہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر ریوالور نکال لیتا اور دھائیں دھائیں گولیاں چلانا شروع کر دیتا...... میں فخر سے کہتا ہوں کہ میرے اشارے پر بلال شاہ کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن اگر میں ریسٹ ہاؤس کے دروازے کے سامنے کوئی ایسی حرکت کرتا تو یہ بڑی بے وقوفی ہوتی۔ بلال شاہ کے ریوالور سے انہی اہلکاروں کو نقصان پہنچنا تھا جنہیں نقصان سے بچانے کے لئے میں نے ڈی ایس پی سے متھا لگایا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جالندھر کی پارٹی سے میری ہاتھا پائی ہو لیکن جو کچھ ہوا اتنا اچانک تھا کہ خواہش کے باوجود میں اسے روک نہ سکا۔

کبھی کبھی حالات اتنے تیز رفتار ہو جاتے ہیں کہ ان پر نظر ٹکانا مشکل ہو جاتی ہے۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ہم ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے کسی ہنگامے کو ترس گئے تھے اور کہاں یہ حال ہو گیا کہ ہنگامے پر ہنگامہ کھڑا ہونے لگا۔ ابھی مجھے اور بلال شاہ کو کمرے میں بمشکل دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اصطبل کے اردگرد ہلچل محسوس ہوئی۔ یوں لگا کہ بھونچال سا آ گیا ہے۔ پھر یکبارگی گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ٹاپوں سے در و دیوار گونج اُٹھے۔ کچھ للکارتی ہوئی آوازیں سنائی دیں اور ایک دم فائرنگ ہونے لگی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے اور سپاہیوں کے بھاگنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈی ایس پی راجپال کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''اوپر چلو...... اوپر چلو۔'' وہ اپنے کسی رائفل مین کو ہدایت دے رہا تھا۔ پھر کسی نے آٹومیٹک گن کا برسٹ مارا۔ ایک چیخ گونجی اور جیسے کوئی زینوں سے لڑھکتا ہوا برآمدے کے پختہ فرش پر آن گرا۔ اتنے میں ہمارے کمرے کے بالکل قریب ایک تیز سریلی آواز گونجی۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ دھنی رام سنگھ کی نوخیز بیوی کی آواز ہے۔ وہ کسی سے خوفزدہ ہو کر بری طرح بھاگی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فائرنگ شدت پکڑ گئی۔ ریسٹ ہاؤس کے مین گیٹ پر مینہ کی طرح گولیاں برس رہی تھیں۔ اب دھماکوں کے ساتھ گندی گالیاں بھی سنائی دے رہی تھیں اور مختلف اشیاء کے ٹوٹنے پھوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلال شاہ نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے ڈاکو پڑ گئے ہیں۔'' اس کے خیال کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کمرے سے باہر جو کچھ ہو رہا تھا وہ مسلح ڈاکوؤں کے سوا اور کون کر سکتا تھا...... دھنی رام سنگھ نے اس خطرناک علاقے میں ریسٹ ہاؤس بنایا تھا تو اس کی حفاظت کا بھی مناسب انتظام کر رکھا تھا لیکن مسلح افراد نے اس قدر اچانک اور شدت سے حملہ کیا تھا کہ بلال شاہ کی زبان میں ''بیٹھلی اُتے'' ہو گئی تھی۔ ہم حیران پریشان کھڑے تھے

جب دروازے کے قریب تیز تیز بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی نے کاربین سے دو فائر کئے اور دروازے پر لگا تالا توڑ دیا۔ دروازہ جھٹکے سے کھلا اور میں نے اپنے سامنے دو ڈھاٹا پوش افراد کو دیکھا۔ ان کے لباس گرد سے اَٹے ہوئے تھے اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں کاربین اور دوسرے کے ہاتھ میں دو نالی رائفل تھی۔ کاربین والے کو میں نے اس کی آنکھوں سے پہچان لیا۔ وہ ٹیک سنگھ کا ایک پرانا ساتھی راجو بارا تھا۔ بارے کے متعلق کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ ہندو ہے، مسلمان یا سکھ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس کا اور ٹیک سنگھ کا ساتھ پرانا ہے۔ میں نے اس سے پہلے بارے کی صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔ اس کی دائیں آنکھ پتھر کی تھی۔ اسی آنکھ کے سبب میں اسے پہچان سکا۔ بارے نے بلند آواز میں کہا۔

''تمہیں کیوں باندھ رکھا ہے ان سؤر کے پتروں نے؟'' یہ شاندار لقب بارے نے راجپال سنگھ اور اس کے عملے کے لئے استعمال کیا تھا۔

بارے کے لہجے میں اپنے لئے نرمی محسوس کر کے اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے اپنے لہجے کو بالکل دھیما کر لیا اور ڈری ڈری آواز میں کہا۔ ''پتہ نہیں بھرا جی، ہم نے تو کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔ سیدھے سادے بندے ہیں۔'' (بارا مجھے نہیں جانتا تھا)

''کہاں سے آئے ہو؟'' بارے کے ساتھی نے پوچھا۔

''کپورتھلہ سے...... شکار کے لئے نکلے تھے یہاں آ کر خود شکار ہو گئے ہیں۔ بڑا مارا ہے بھرا جی ان پولیس والوں نے پنڈا ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔''

بارے کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ہمدردی کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس نے ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ باہر کا منظر حیران کن تھا۔ پانچ دس منٹ کے ہنگامے نے ریسٹ ہاؤس کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا تھا۔ کھڑکیاں دروازے ٹوٹ چکے تھے۔ مین گیٹ کے عین سامنے ڈی ایس پی راجپال کی جیپ اوندھی پڑی تھی اور دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ جیپ کے اردگرد کم از کم پانچ تازی کتے مرے پڑے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ریسٹ ہاؤس کے محافظوں نے ان کتوں کو ڈاکوؤں پر چھوڑا تھا اور ڈاکوؤں نے انہیں چھلنی کر دیا تھا۔ اصطبل کے عین سامنے ایک تازہ بتازہ لاش پڑی تھی۔ یہ راجپال کا ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے اندر اور باہر ڈھاٹا پوش افراد دندناتے اور بندوقیں لہراتے پھر رہے تھے۔ اب بات سے صاف ظاہر تھا کہ نہ صرف پولیس کا عملہ موقع سے فرار ہو گیا ہے بلکہ ریسٹ ہاؤس کے تنخواہ دار محافظ بھی جانیں بچا کر بھاگ گئے ہیں۔ دھنی رام سنگھ ریسٹ ہاؤس میں نہیں تھا۔ وہ کل سہ پہر ہی اپنے تین محافظوں کے ساتھ کپورتھلہ گیا تھا اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بیوی

ریسٹ ہاؤس میں ہی تھی اور اب میں اسے دو ہٹے کٹے افراد کی گرفت میں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ مونجھ کی رسی سے باندھ کر ایک گھوڑے پر اوندھا لیٹایا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے سے اُترنے کے لئے بُری طرح مچل رہی تھی لیکن مسلح افراد نے اسے دونوں طرف سے تھام رکھا تھا۔

جلد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ ریسٹ ہاؤس کے اندر ایک اور شخص ہلاک ہوا ہے۔ یہ جالندھر کا سول جج ہری کرشن سنگھ تھا۔ تھری ناٹ تھری کی گولی اس کے سر پر لگی تھی اور کھوپڑی کا ایک حصہ صاف اُڑ گیا تھا۔ اس کا کریم کلر سلیپنگ گاؤن خون سے لالہ زار ہو رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے اب صرف ایک شخص موجود تھا اور وہ انسپکٹر اروڑا تھا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور وہ پورچ کے سامنے سرسبز لان میں پڑا کراہ رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ انسپکٹر اروڑا ہم سے جان پہچان ظاہر نہ کردے۔ میں نے اونچی آواز میں پولیس والوں کو کوسنا شروع کر دیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ پولیس والوں کو اپنے کیئے کی سزا ملی ہے۔ اب بلال شاہ میری چال سے آگاہ ہو چکا تھا اور اس نے بھی چہرے پر مظلومیت طاری کر لی تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں لوٹ مار کرنے کے بعد اب مسلح افراد جلد از جلد وہاں سے کھسک جانا چاہتے تھے۔ بارے وغیرہ کا رویہ ہمارے ساتھ بدستور دوستانہ تھا۔ بارے نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

’’چلو استاد! ہمارے ساتھ تمہاری مرہم پٹی کرواتے ہیں اور شکار بھی کھیلاتے ہیں تم کو۔‘‘ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم تو کب سے ان کے ساتھ جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ بہرحال معمولی پس و پیش ظاہر کر کے ہم نے آمادگی ظاہر کر دی۔ اصطبل گھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ بارے اور اس کے ساتھیوں نے دس صحت مند گھوڑے ان میں سے چن لئے تھے۔ لُوٹ کے ان دس گھوڑوں کی مالیت ہزاروں میں تھی۔ ان میں سے ایک گھوڑا مجھے اور بلال شاہ کو دے دیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بلال شاہ کے حصے میں وہ گھوڑا آیا جو واقعی اس کا اپنا تھا۔ انسپکٹر اروڑا کو زخمی حالت میں وہیں پڑا رہنے دیا گیا تھا۔ لاشیں بھی جوں کی توں پڑی تھیں۔ بے خوف ڈاکوؤں کا یہ جتھا گھوڑوں پر سوار ہوا اور ہمیں لے کر آناً فاناً جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب صبح کا اجالا پھیلنے والا تھا۔ جنگل جاگ اُٹھا تھا اور پرندے شاخوں پر چہچہا رہے تھے۔ ڈاکوؤں کا جتھا ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے ڈیک نالے میں سے گزرا اور اس پُرخطر علاقے میں داخل ہو گیا جہاں چپے چپے پر لاقانونیت کا راج تھا۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے تھا جگہ جگہ قدرتی جوہڑ بنے ہوئے تھے اور ان کے کنارے بلند و بالا سرکنڈے جھوم رہے

تھے۔ ایک برس پہلے سرکنڈوں کے کسی ایسے ہی جھنڈ میں ڈاکوؤں نے انگریز کپتان کو گھیر کر اس کمپنی کو تہس نہس کر دیا تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے راستے تنگ اور جنگل گھنا ہوتا گیا۔ کہیں کہیں مسلح افراد سے مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ دیکھنے میں یہ لوگ آوارہ گرد دیہاتی نظر آتے تھے لیکن حقیقت میں ڈاکو تھے۔ یہ لوگ بارے اور اس کے ساتھیوں سے کافی مرعوب نظر آتے تھے۔ جھک کر سلام کرتے تھے اور فوراً راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ راستے میں ایک دو مقامات پر ہمیں فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ دوسروں کی طرح بلال شاہ اور میں نے بھی اپنے چہرے چادروں میں چھپا رکھے تھے لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ یہاں اتفاق سے بھی کوئی ہمیں پہچان سکے گا۔ بارا راستے میں مجھ سے مسلسل باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم باز پکڑنے کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ لاہور کے ایک ٹھیکیدار نے کہا تھا کہ وہ شکاری باز کی قیمت ایک ہزار روپیہ دے گا۔ ہم بیروزگار ہیں۔ قسمت آزمانے نکل کھڑے ہوئے۔ بارا مجھے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

’’استاد! کیا بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ قسمت آزمائی نہیں جاتی قسمت بنائی جاتی ہے اور قسمت باز سے نہیں بازوؤں سے بنتی ہے۔ ان بازوؤں میں بندوق اُٹھاؤ پھر دیکھو تمہارے ہاتھ کی لکیریں کیسے بدلتی ہیں......‘‘

اسی طرح کی باتیں کرتے ہم نے قریباً دس میل کا فاصلہ طے کیا اور ایک بڑے ٹیلے کے دامن میں پہنچ گئے۔ اس ٹیلے کے اوپر اور ارد گرد کثرت سے جنتر اُگا ہوا تھا۔ یہاں ایک بہت بڑی کھوہ نظر آئی۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کھوہ قدرتی ہے یا بنائی گئی ہے بہرحال اس ویرانے میں سر چھپانے کے لئے بہت مناسب جگہ تھی۔ جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لئے کھوہ کے دہانے پر ایک کچی دیوار سی بنا دی گئی تھی۔ اس دیوار میں لکڑی کا دروازہ لگا تھا۔ اس کے علاوہ دیوار میں کچھ رخنے بھی بنائے گئے تھے۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ رائفل وغیرہ کے لئے ہیں اور یہ دیوار ایک طرح سے مورچے کا کام بھی دیتی ہے۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ یعنی یہ کھوہ ٹیک سنگھ اور شہباز کا ڈیرہ ہے، لیکن پھر فوراً ہی یاد آیا کہ ایاز عرف ایازی نے تو کچھ اور بتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہاں چند کچے کوٹھے بنے ہوئے ہیں اور زمین ہموار ہے۔ یقیناً یہ کوئی اور جگہ تھی۔ بہرحال اپنے طور پر میں شہباز پہلوان کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ شہباز پہلوان مجھے پہچانتا تھا۔ اس کے سامنے جاتے ہی ہمارا بھانڈا پھوٹ جانا تھا۔ دعا یہی تھی کہ شہباز پہلوان سے سامنا نہ ہو اور اگر ہو تو ایسے موقعے پر ہو کہ ہم اس پر قابو پا سکیں نہ کہ وہ ہمیں چوہے دان میں پھنسا لے۔

بلال شاہ کا بھرا ہوا ریوالور اب میری قمیص کے نیچے منتقل ہو چکا تھا اور میں اسے استعمال کرنے کے لئے دل و جان سے تیار تھا۔

ہمیں کھوہ کے اندر پہنچا دیا گیا۔ دھنی رام کی کم عمر گجراتی بیوی کامنی راستے میں مسلسل آہ و بکا کرتی رہی تھی۔ کھوہ میں پہنچ کر بارے نے اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا ہٹایا تو لڑکی کا رونا دھونا اور بلند ہو گیا۔ وہ ناز و نعم میں پلی عیش و عشرت کی عادی، اس سخت کھردرے ماحول میں آئی تھی تو بُری طرح کراہ اُٹھی تھی۔ پہلے تو وہ بارے وغیرہ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتی رہی اور انہیں اپنے امیر کبیر شوہر کے اثر و رسوخ سے ڈراتی رہی...... پھر منت سماجت پر اُتر آئی اور دیوی دیوتاؤں کے واسطے دینے لگی۔ بارے اور اس کے ساتھیوں پر اس داد فریاد کا بھلا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کھولے بغیر اسے گرد آلود فرش پر پٹخ دیا اور ڈرا دھمکا کر چپ کرا دیا۔ جلد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ ٹیک سنگھ اور شہباز کا مرکزی ڈیرہ یہی ہے لیکن اس وقت وہ دونوں یہاں موجود نہیں تھے۔ (وہ اسی ڈیرے پر تھے جس کا ذکر ایاز عرف ایازی نے کیا تھا...... معلوم ہوا کہ کچے کوٹھوں والا وہ ڈیرہ یہاں سے پانچ میل مشرق کی طرف ہے) کھوہ میں پہنچتے ہی بارے نے ہماری مرہم پٹی کروائی اور مزے دار کھانا کھلایا۔ سالن شکار کے گوشت سے بنایا گیا تھا۔ ساتھ میں چھوٹی چھوٹی بھنڈی توری جیسی مچھلیاں تھیں جنہیں کھال اور سر سمیت پکایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بکری کے دودھ کا دہی اور شراب کے دو پوّے تھے۔ اس آخری آئیٹم کے سوا ہم نے سب کچھ کھایا پیا۔ بارے اور اس کے ساتھیوں نے جنگل میں منگل کر رکھا تھا۔ طبلے سے لے کر گراموفون تک اور شیشے کنگھی سے لے کر گرم حمام تک سب کچھ اس ڈیرے پر موجود تھا۔

رات کو ہم پرالی کے بستر پر آرام سے سوئے۔ اگلے روز بارے نے مجھے بتایا کہ آج شام بڑا سردار آ رہا ہے۔ وہ ہمیں اس سے ملوائے گا اور کوئی ایسی نوکری دلوانے کی کوشش کرے گا جس میں خطرہ نہ ہو اور معاوضہ بھی اچھا ہو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بارے نے ابھی تک ہمارے سامنے تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ مفرور ڈاکو ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کا سردار یہاں کا بااثر شخص ہے اردگرد کا جنگل اس کی ملکیت ہے اور سردار کے دم قدم سے علاقے میں امن و امان قائم ہے۔ اس نے اپنے بااثر سردار کا نامِ گرامی نہیں بتایا تھا لیکن بتائے بغیر ہی میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ٹیک سنگھ کی بات کر رہا ہے۔

سہ پہر تک ہم یعنی بلال اور میں آزادانہ آس پاس کے علاقے میں گھومتے رہے۔ میں نے اردگرد کے پُر پیچ راستے اچھی طرح ذہن نشین کر لئے۔ ہم نے کھوہ میں بھی گھوم پھر کر

دیکھا۔ یہ کھوہ کافی وسیع تھی اور اس کے اندر دو تین اور سرنگیں بھی تھیں۔ ایک سرنگ غالباً باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کی چھت دھوئیں سے کالی ہو رہی تھی اور دہانہ خوفناک نظر آتا تھا۔ اس سرنگ کے ساتھ والی سرنگ پتھر رکھ کر بند کر دی گئی تھی اور یہاں ایک مسلح شخص پہرہ دے رہا تھا۔ یہ بات ہمیں تین ماہ بعد معلوم ہو سکی کہ اس سرنگ میں لوٹ مار اور منشیات کا ذخیرہ تھا۔ آثار سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس ڈیرے پر عورتیں وغیرہ بھی لائی جاتی ہیں۔

دوپہر کے فوراً بعد بارا اور اس کے ساتھی جیسے کسی ضیافت کی تیاری کرنے لگے۔ دو بکرے لائے گئے۔ ان میں سے ایک کا جھٹکا کیا گیا اور دوسرے کے گلے پر چھری پھیری گئی۔ چند مرغیاں بھی جان سے گئیں۔ تانبے کے تین بڑے بڑے دیگچوں میں چاول رکھ دیئے گئے۔ چابی والا گراموفون زور و شور سے بج رہا تھا اور کسی کسی وقت کوئی شخص مستی میں اُٹھ کر ناچنے بھی لگتا تھا۔ شام ہونے تک غار میں موجود افراد کی تعداد ساٹھ ستر تک پہنچ گئی۔ اندھیرا گہرا ہوا تو بلال اور میں نے چین کا سانس لیا۔ اب ہمارا پہچانا جانا خاصا مشکل تھا۔ مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ایک نظر میں کسی کو شناخت کیا جا سکتا۔ ویسے بھی بہت سے دوسرے افراد کی طرح ہم نے بھی چادروں کے ڈھاٹے سے بنا رکھے تھے۔ پلاؤ اور قورمے کی خوشبو کھوہ میں پھیل گئی تو سب کی بھوک بھی چمک اُٹھی...... بڑا سردار کوئی آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر پہنچا۔ میں نے اسے بیس گز دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ سو فیصد ٹیک سنگھ تھا۔ چمکتا ہوا سانولا رنگ اور انگارہ آنکھیں۔ اس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔ اس کے ساتھ شہباز پہلوان تھا۔ وہ پہلوان جو چند ماہ پہلے اکھاڑے کی شان تھا۔ بے راہ روی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ جسم بھدا ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ وہ سر تا پا نشے میں غرق نظر آتا تھا۔ وہ دونوں کھوہ میں پہنچے تو مسلح افراد نے جھک جھک کر مصافحے کرنے شروع کر دیئے۔ ہجوم کے سبب میں اور بلال شاہ اس ''دعا سلام'' سے بچ گئے۔ کھوہ میں ہی ایک ہموار جگہ پر کھانا لگا دیا گیا۔ دیسی اور ولایتی شراب کی بوتلیں گردش میں آ گئیں۔ کھانے کے دوران ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب مجرے کا پروگرام ہو گا۔ کسی قریبی گوشے سے ہارمونیم کے سُر درست کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد جو پردے کے پیچھے تھا وہ سامنے آ گیا۔ یہ دو سیکنڈ ہینڈ طوائفیں تھیں۔ نہ رنگ نہ روپ چہروں پر سرخی پاؤڈر، جسم ڈھلکے ہوئے لیکن عورت کے لئے ترسے ہوئے مردوں بلکہ ''مردودوں'' کے لئے یہی پریزادیاں تھیں۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹے تک خوب ہلا گلا ہوا۔

میں نے قریب بیٹھے ایک سکھ نوجوان سے پوچھا۔ ''یار وہ ولایتی مچھلی کہاں ہے، جو کل سردار بارا نالے پار سے پکڑ کر لایا تھا۔'' میرا اشارہ نوخیز کامنی کی طرف تھا۔

نوجوان نے ایک گالی میری طرف اچھالی اور بولا۔ ''تجھے بڑی فکر ہے تیری کچھ لگتی تو نہیں ہے۔'' قریب بیٹھے دو گجراتی بدمعاش زور زور سے ہنسنے لگے۔ بے غیرتی کا ڈرامہ ضروری تھا اس لئے میں نے بھی ہنسنے میں ان کا ساتھ دیا۔ ایک گجراتی بدمعاش بولا۔ ''آج وہ ولایتی مچھلی سردار ٹیک سنگھ کے دسترخوان پر سجے گی، کل استاد شہباز کے دسترخوان پر، پرسوں سردار بارا کے دسترخوان پر، پھر مولا سنگھ...... پھر ٹھاکا سنگھ کالیا، پھر شاہ دین، پھر پربت کمار باڈر والا......'' ایک ہی سانس میں اس نے مجھے دس بیس نام گنوا دیئے۔ آخر میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''ہم تم کس گنتی میں آتے ہیں شہزادے۔ ہم تک پہنچتے پہنچتے ولایتی اور دیسی سب مچھلیاں ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے زیادہ فکر مت کرو اور لال پری کو چوم چاٹ کر سو جاؤ یہیں آگ کے پاس۔''

دھیرے دھیرے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس جشن کی وجہ وہ کامیاب حملہ ہے جو کل صبح بارے اور اس کے ساتھیوں نے ریسٹ ہاؤس پر کیا تھا۔ اپنے ایک بھی شخص کی جان گنوائے بغیر وہ ریسٹ ہاؤس کو تہس نہس کر آئے تھے اور مالِ غنیمت میں کئی تولے زیور اور سامان کے علاوہ ایک چلتی پھرتی قیامت بھی اُٹھا لائے تھے...... رات گیارہ بجے کے قریب محفل برخاست ہوگئی۔ وہ افراد جنہیں جنگل میں پہرہ دینا تھا یا دوسری جگہوں پر سونا تھا کھوہ سے رخصت ہوگئے۔ ٹیک سنگھ اور شہباز پہلوان بھی جھومتے ہوئے اُٹھے اور کھوہ کے اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد کسی گوشے سے کامنی کی دبی دبی چیخیں ابھرنے لگیں۔ ضمیر زندہ ہو تو ایسی چیخیں سن کر انسان کے جسم کی بنیادیں ہل جاتی ہیں لیکن کھوہ کے باسیوں کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ انہیں کسی نے پھڑکتا ہوا لطیفہ سنایا ہے۔ وہ قہقہے لگاتے اور مستی میں اُٹھ اُٹھ کر ناچنے لگے جو زیادہ من چلے تھے وہ ناچتے ناچتے ایک آدھ ہوائی فائر بھی کر دیتے تھے۔ بڑا وحشیانہ منظر تھا یہ......شراب بدستور پی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سب غفیل ہونے لگے۔ سردار بارا اور ایک جالندھری بدمعاش مولا سنگھ آخر تک جاگتے رہے لیکن پھر ان پر بھی نیند حاوی ہونے لگی۔ بارے نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''استاد تو بڑا کھوچل ہے۔ اتنی چڑھائی ہے پھر بھی چنگا بھلا ہے۔'' اسے معلوم نہیں تھا کہ بلال اور میں نے جتنی پی ہے وہ سب کھوہ کی کچی زمین میں جذب ہو چکی ہے۔ مولا سنگھ میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔ ''اچھا...... جا پھر اُدھر خاکی درواجے پر پہرہ دے۔

سردار کو کسی شے کی جرورت ہوگی تو مولا کہہ کر آواج دے گا۔ درواجا کھول کر اندر چلے جانا۔ گھبرانا نہیں۔''

نیند کی وجہ سے سردار بارے کے جہاز بھی اب مکمل طور پر ڈوب چکے تھے۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''اور ہاں وہ پولیس والے ماں کے ویر اپنی کڑی لینے آ جائیں تو سب کو مار دینا...... سب کو مار دینا بے فکر ہو کے...... میں صبح اُٹھ کر...... خود نبٹ لوں گا ہائیکورٹ کے وڈے مامے سے۔'' پتہ نہیں وہ نشے میں کیا اول فول بک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ گونج دار خراٹے لینے لگا۔ سوتے میں اس کی پتھر کی آنکھ ادھ کھلی تھی اور خوفناک لگ رہی تھی۔ مولا سنگھ نے مجھے دھکیل کر خاکی دروازے کی طرف بھیج دیا۔ یہ دروازہ پچیس تیس گز آگے کھوہ کے بائیں حصے میں تھا۔ کوئی پون گھنٹہ پہلے کامنی کی چیخیں اسی دروازے کے پیچھے سے بلند ہوئی تھیں میں دروازے کے پاس پہنچا تو اندر مکمل خاموشی تھی لیکن پھر اچانک دبی دبی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کامنی کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''چھوڑ دے مجھے اب میں جاؤں گی۔'' ٹیک سنگھ کی مخمور سرگوشی ابھری۔ ''ابھی کہاں میری جان، اتنی لمبی رات پڑی ہے ایسا ظلم ڈھاؤ گی تو مر جائے گا تمہارا دیوانہ......'' تب اندر سے ایک بار پھر ہاتھا پائی کی آوازیں آنے لگیں۔ میری پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ اب اور انتظار میرے بس میں نہیں تھا۔ مولا سنگھ نے کہا تھا کہ آواز آئے تو دروازہ کھول کر اندر چلے جانا۔ اس کا مطلب ہے دروازہ کھلا ہے۔ میں نے بھرا ہوا ریوالور ہاتھ میں لیا اور تیزی سے اندر گھس گیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں میری نگاہ سب سے پہلے ٹیک سنگھ کے منحوس چہرے پر پڑی۔

''خبردار'' میں نے پھنکار کر کہا۔ ''حرکت مت کرنا۔'' میرے ریوالور کی نال اس کے سر سے تقریباً پانچ فٹ دور تھی۔ نشے میں نزدیکیاں اور دوریاں کون دیکھتا ہے۔ ٹیک سنگھ نے بھی ریوالور کو نظر انداز کر کے مجھ پر جھپٹنا چاہا۔ مجھے گولی چلانا پڑی۔ دھماکہ ہوا اور ٹیک سنگھ کی پیشانی پر دائیں آنکھ کے عین اوپر ایک سیاہ نشان نمودار ہو گیا۔ یہ موت کا نشان تھا...... یہ اجل کی وہ مہر تھی جو قدرت نے میرے ہاتھوں ایک بدکار کے ماتھے پر لگوائی تھی۔ یہ مہر لگتے ہی اس دنیا سے اس کا جانا ضروری ہو گیا تھا۔ ٹیک سنگھ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ کٹے شہتیر کی طرح کامنی کے پاؤں میں گرا۔ وہ چیختی ہوئی اُٹھی اور خود کو کسی چادر میں لپیٹتی ہوئی ایک کونے میں جا گھسی۔ اب میری نگاہ دوسری چارپائی پر پڑی۔ لالٹین اس چارپائی کے قریب رکھی تھی۔ لہٰذا یہاں کا منظر زیادہ روشن تھا۔ میں نے شہباز کو دیکھا۔ وہ آنکھیں سکوڑ سکوڑ کر مجھے گھور رہا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ ابھی تک نیند میں ہے یا جاگ گیا ہے۔ پھر یکبارگی

اس کا ہاتھ اپنی رائفل کی طرف بڑھا۔ دوسرا دھماکہ ہوا اور 38 بور کی گولی شہباز کے بائیں
کندھے میں دھنس گئی۔ اس نے کراہ کر اپنا کندھا دوسرے ہاتھ سے تھاما۔ میں نے آگے بڑھ
کر ایک زوردار ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔ کل کا نامی گرامی پہلوان ایک خستہ برج کی طرح
ٹوٹ کر چارپائی سے نیچے جا گرا۔ دھماکوں کی آواز پوری کھوہ میں گونجی تھی۔ میں جانتا تھا
بدمست شرابیوں میں سے کئی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے ہوں گے اور اگر وہ نہ اُٹھے ہوں گے کھوہ سے
باہر پہرہ دینے والے ہوشیار ہو گئے ہوں گے...... مجھے اور بلال شاہ کو ایک خطرناک صورتِ
حال کا سامنا تھا لیکن دس بارہ سیکنڈ خیریت سے گزر گئے تو مجھ پر ایک اطمینان بخش حقیقت
کھلی...... دھماکوں کی آواز نے کسی کو جگایا تھا اور نہ ہوشیار کیا تھا۔ مجرے کے دوران اور بعد
میں کھوہ کے اندر مسلسل ہوائی فائرنگ کی جاتی رہی تھی اور ان دھماکوں کو بھی اسی فائرنگ کا
حصہ سمجھ لیا گیا تھا۔ بلال شاہ بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے بتایا کہ کھوہ کے دہانے پر چھ سات
گھوڑے موجود ہیں اور وہاں کوئی چوکیدار بھی موجود نہیں۔ میں نے لالٹین اُٹھا کر شہباز
پہلوان کا چہرہ دیکھا۔ چارپائی سے گرتے ہی اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور پیشانی لہولہان
ہو رہی تھی۔ وہ نشے میں تو پہلے ہی تھا۔ اب زخمی ہو کر اس کا دم خم بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اس پر
''راکھ کے پہاڑ'' والی مثال صادق آتی تھی۔ میں نے ایک پگڑی سے اس کے ہاتھ پشت پر
کس دیئے اور پھر بلال شاہ کے ساتھ مل کر منہ پر کپڑا بھی ٹھونس دیا۔ اپنے قریب ٹیک سنگھ کی
لحیم شحیم لاش دیکھ کر کامنی مسلسل گھٹی گھٹی آواز میں چیخ رہی تھی۔ میں نے ڈانٹ کر اسے چپ
کرایا۔ بلال شاہ جلدی جلدی کمرے کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس تلاشی کے سبب ہمیں ٹیک سنگھ
وغیرہ کے خلاف چند اہم ثبوت حاصل ہو گئے۔ پہلوان شہباز بہت وزنی تھا۔ کم از کم میرے یا
بلال شاہ کے لئے اسے کندھے پر اُٹھانا ممکن نہیں تھا۔ ہم اسے کندھوں سے تھام کر گھسیٹتے
ہوئے کھوہ سے باہر لے آئے۔ وہ نشے میں غوں غاں کر رہا تھا اور بار بار سر کو جھٹکے دیتا تھا
پہلوان کو گھوڑے پر لادنا ایک مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ حل کرنے میں کامنی نے بھی ہماری مدد کی۔ ہم
نے مل جل کر اسے گھوڑے پر اوندھا ڈال دیا۔ بلال شاہ نے بڑی پھرتی کے ساتھ ایک رسی کی
مدد سے پہلوان کو زین پر کس دیا۔ ہم نے تین صحت مند گھوڑے چنے اور انہیں رسوں سے
تھام کر دھیرے دھیرے ڈھلوان کی طرف بڑھنے لگے۔ اب ہم پوری طرح مسلح تھے۔
میرے ہاتھ میں شہباز پہلوان والی طاقتور رائفل تھی جب کہ بلال شاہ بھی ایک خودکار رائفل
سے مسلح تھا۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا اور ہم کسی بھی بُری صورتِ حال کے لئے پوری
طرح تیار تھے۔ کل دوپہر ہی میں ایک محفوظ راستہ دیکھ چکا تھا۔ یہ راستہ تھوڑا سا طویل تھا لیکن

ہم پہرے داروں کا خطرہ مول لئے بغیر ڈیرے کی حدود سے نکل سکتے تھے۔
ڈیرے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر دو مسلح افراد سے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں
نے ہمیں روکنا چاہا۔ میرے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تھی اور میرے سامنے وہ افراد تھے جو
پکڑے جاتے تو سینکڑوں برس قید اور کئی کئی پھانسیاں ان کے حصے میں آتیں۔ میرے دل
میں ان کے لئے ذرا بھر رحم نہیں تھا۔ میں نے بے دریغ لبلبی دبائی۔ یکے بعد دیگرے وہ
دونوں اچھل کر جنتر کی جھاڑیوں میں گرے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں لالٹین تھی جو اس کے
گرتے ساتھ ہی بجھ گئی۔ اب چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ وہ زندہ
بچے ہیں یا اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔ میرے اشارے پر بلال شاہ اور کامنی ڈیک نالے کی
طرف بڑھنے لگے۔ ڈیڑھ دو میل آگے پھر ہمیں روک لیا گیا لیکن اس دفعہ روکنے والے زیادہ
ہوشیار چالاک نہیں تھے۔ ہم نے انہیں چکمہ دیا کہ ایک ساتھی زخمی ہو گیا ہے اسے کسی ڈاکٹر
کے پاس لے جا رہے ہیں۔ ان افراد کے پاس ماچس کے علاوہ اور کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ
تیلیاں جلا جلا کر ہمارے چہرے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر ہمیں راستہ دے دیا......
ڈیک نالے تک کا وہ سفر بے حد دشوار بلکہ ناقابلِ فراموش تھا۔ اس کی تفصیل میں گیا تو یہ
روئیداد بہت طویل ہو جائے گی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ تاریک اور ٹھٹھرے ہوئے جنگل میں وہ
پہاڑ جیسی رات تھی جس کا ہر پل ہم نے ایک عذاب کی طرح کاٹا۔ سفر کے دوران ہم ایک
مرتبہ راستہ بھی بھولے لیکن قسمت اچھی تھی کہ جلد ہی ''راہِ راست'' پر آ گئے۔ مشرق کی طرف
سے سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ آخر ہم خراشوں، زخموں اور تھکن سے چُور ڈیک نالے پر پہنچے
اور اس خطرناک حد کو پار کر کے کھلے علاقے میں آ گئے۔

☆=====☆=====☆

ٹیک سنگھ کی موت اور شہباز پہلوان کی گرفتاری کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ علاقے میں
کھلبلی مچ گئی۔ شہباز پہلوان کو پہلے کپورتھلہ اور وہاں سے امرتسر لے جایا گیا۔ یہاں ہسپتال
میں اس کے کندھے سے گولی نکالی گئی اور سر کے زخم کی مرہم پٹی کی گئی۔ ہسپتال سے باہر شہباز
کو دیکھنے والوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ گولی نکلنے کے بعد شہباز پہلوان قدرے چاق و چوبند نظر
آنے لگا۔ ڈاکٹروں کے خیال میں اس کا چھ سات روز ہسپتال میں رہنا ضروری تھا۔ ہسپتال
میں اسے ہتھکڑیاں لگی تھیں اور چوبیس گھنٹے پولیس کی نگرانی میں تھا۔ ایک روز میں اسے دیکھنے
گیا تو وہ لڑکی اس سے ملنے آئی ہوئی تھی جو بڑے اور چھوٹے بھائی میں فساد کی بنیاد بنی تھی۔
میرا مطلب صفیہ سے ہے۔ میں ایازی کے بٹوے میں اس کی تصویر دیکھ چکا تھا اس لئے

پہچان گیا۔ لڑکی کے لباس اور چال ڈھال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ کھلتے ہوئے رنگ کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ پنجابی مٹیاروں کی طرح اونچی لمبی اور جوان تھی لیکن مٹیاروں کی طرح اَن پڑھ نظر نہیں آتی تھی۔ میرے پہنچتے ہی وہ پہلوان کے پاس سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ میں چند کاغذوں پر انگوٹھا لگوانے پہلوان کے پاس آیا تھا۔ انگوٹھا لگوا کر واپس جیون چلا گیا۔ شام تک مجھے پورن کچھ کے متعلق اپنی رپورٹ تیار کر کے انگریز ایس پی تک پہنچانی تھی...... شام کو ابھی میں بمشکل فائل سے فارغ ہوا تھا کہ ایک دھماکہ خیز خبر ملی...... کچھ مسلح سکھوں نے ہسپتال میں شہباز پہلوان پر حملہ کیا تھا اور اسے شدید زخمی کر کے فرار ہوگئے تھے۔ اس سنسنی خیز خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ دھیان فوراً وچن سنگھ پہلوان کے وارثوں کی طرف گیا۔ سب کام چھوڑ کر میں بھاگم بھاگ پھر امرتسر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ شہباز پہلوان ایمرجنسی وارڈ میں ہے اور اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ میں نے وہ کمرہ دیکھا جہاں شہباز حملے سے پہلے زیر علاج تھا۔ کمرہ میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہر چیز ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ کرسیاں، میز، بیڈ سب کچھ الٹ دیا گیا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبلوں سے رائفلیں چھین لی گئی تھیں اور ایک سب انسپکٹر اس ہنگامے میں شدید زخمی ہوا تھا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔ حملہ کرنے والے پہلوان وچن سنگھ کے حمایتی تھے۔ ان کی تعداد دو درجن سے زائد تھی۔ سب ہاکیوں، ڈنڈوں اور کرپانوں سے مسلح تھے۔ وہ انتقام انتقام کے نعرے لگاتے ہوئے ہسپتال میں گھسے تھے اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح پہلوان پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس واقعے میں سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ پہلوان کے چھوٹے بھائی ایاز کو بھی حملہ آوروں کے ساتھ دیکھا گیا تھا...... گو اس نے اپنا منہ سر پگڑی میں لپیٹ رکھا تھا لیکن ایک زخمی کانسٹیبل نے اسے پہچان لیا تھا۔

پہلوان سے میری ملاقات اگلے روز صبح سویرے ہوسکی۔ یوں لگا چراغِ سحری کی طرح اس کی زندگی کا چراغ بھی ٹمٹما رہا ہے۔ اس کے چوڑے چکلے سینے اور پیٹ پر کرپان کے کئی زخم آئے تھے۔ سر اور چہرے پر ہاکیوں اور لاٹھیوں کی ضربیں بھی اَن گنت تھیں۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ میں اس سے زیادہ دیر بات نہیں کرسکتا لیکن پہلوان جب بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ جیسے شمع بجھنے سے پہلے زور سے بھڑکتی ہے۔ وہ بھی بھڑک رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے پہلوان کے جسم میں وہی شہباز عرف بجلی پہلوان زندہ ہوگیا ہے جو ہار کر بھی ہار نہیں مانتا تھا۔ جو اکھاڑے میں چیتے کی طرح پلٹتا جھپٹتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے حریف کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا۔

قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ شروع سے آخر تک میں شہباز پہلوان کے بارے میں کشمکش کا شکار رہا۔ میں وچن سنگھ پہلوان کے حمائتیوں کی طرف دیکھتا تھا تو شہباز کے لئے دل میں ہمدردی پیدا ہوتی تھی لیکن جب اس کے اپنے کرتوتوں پر نظر پڑتی تھی تو ہمدردی کی جگہ نفرت لے لیتی تھی۔ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں شہباز پہلوان سے جو میری آخری گفتگو ہوئی اس نے میرے اندر کی کشمکش کو ختم کر دیا۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ تصویر کا ایک بالکل نیا رخ تھا لیکن افسوس کہ یہ رخ بہت دیر سے سامنے آیا۔ گفتگو کرتے ہوئے شہباز پہلوان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سکھ حملہ آوروں میں اپنے چھوٹے بھائی کو اس نے بھی پہچان لیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ دکھ اسی بات کا تھا کہ غیروں کے ساتھ مل کر اپنوں نے بھی اس کے سینے پر زخم لگائے تھے۔ اس نے روئیداد سناتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! اس روز اکھاڑے میں جو کچھ ہوا آپ کو بھی پتہ ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وچن کو قتل کر دوں گا۔ میں نے اسے داؤ لگا رکھا تھا۔ اس نے داؤ سے نکلنے کے لئے اندھا زور لگایا۔ میں داؤ چھوڑ دیتا تو نیچے آجاتا اس لئے زور تو میں نے بھی لگانا تھا۔ بس اسی چکر میں وچنے کی کمر ٹوٹ گئی۔ میری غلطی تھی کہ جان بچانے کے لئے میں موقعے سے غائب ہوگیا۔ وچنے کے حمائتیوں نے انسپکٹر نہال سنگھ کو شکاری کتے کی طرح میرے پیچھے لگا دیا۔ آپ پولیس کے محکمے میں ہیں، جانتے ہی ہوں گے کہ نہال سنگھ محکمے کے بدنام تھانیداروں میں سے ایک ہے۔ اس نے میری ماں اور بہنوں کو تھانے میں کھینچا اور پھر پولیس کی دو گاڑیاں لے کر مجھ پر چڑھ دوڑا۔ آپ کے کاغذوں میں میرا سب سے بڑا جرم یہی لکھا ہے ناں کہ میں نے پولیس مقابلہ کیا ہے اور نہال سنگھ سمیت تین پولیس والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں کہ میں مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور میں نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا تھا لیکن نہال سنگھ مجھے گرفتار کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ وچن سنگھ کے بدلے میں میری لاش لے کر جائے گا...... مجبور ہو کر...... بالکل مجبور ہو کر میں نے پولیس پارٹی پر فائر کھولا اور جان بچا کر بھاگ نکلا۔ آپ کی اور ایازی کی نظروں میں مَیں نے جو دوسرا بڑا جرم کیا وہ یہ ہے کہ میں نے اس لڑکی کو گھر میں ڈال لیا جس کو ایازی پسند کرتا تھا۔ ایازی کو کچھ پتہ نہیں ہے وہ لڑکی کون ہے، نہ ہی آپ کو پتہ ہے۔ آپ اب تک ایک لڑکی کا کھوج لگاتے رہے ہیں جس کا نام آپ کی فائل میں میری محبوبہ کے طور پر لکھا ہے...... یہ صفیہ ہی وہ لڑکی ہے۔ وہ مجھے اس وقت سے جانتی ہے جب ایازی کی ابھی مونچھیں بھی نہیں پھوٹی تھیں۔ جب اسے پتہ چلا کہ مجھ پر قتل کا الزام لگ گیا ہے

تو وہ سب کچھ چھوڑ کر مجھے ڈھونڈتی ہوئی پورن کچھ پہنچ گئی۔ میں نے اسے واپس بھیجنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی کہ میرے ساتھ جئے مرے گی...... جب وہ کسی طرح واپس نہیں گئی تو میں نے اس سے شادی کر لی، اب وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

شہباز پہلوان نے ایک گہری سانس لی۔ وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ کبھی اس کی آواز اتنی دھیمی ہو جاتی تھی کہ مجھے اس کے چہرے پر جھکنا پڑتا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ بولا۔ ''ٹیک سنگھ کے ساتھ رہ کر میں شراب ضرور پینے لگا ہوں، کبھی کبھی ناچ گانا بھی دیکھ لیتا ہوں لیکن خدا گواہ ہے صفیہ کے سوا کبھی کسی عورت سے میرا تعلق واسطہ نہیں رہا۔ میں اتنا بُرا نہیں تھا جتنا مجھے بنا دیا گیا۔ مجھ پر وہ الزام بھی لگائے گئے جن کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ نہ میں نے ٹیک سنگھ کے ساتھ مل کر لوگوں کو لوٹا ہے، نہ اپنے ماموں کو قتل کی دھمکیاں دی ہیں، نہ آپ کے گھر کو آگ لگائی ہے...... یہ اور اس طرح کے بہت سے الزام خواہ مخواہ میرے سر تھوپ دیئے گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ نرس نجمہ کے بارے میں بھی مجھ پر شک کیا جاتا رہا ہے۔ میں اسے بہن سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ میں نے اسے دیپالپور صرف اس لئے بلایا تھا کہ میں پولیس کے آگے اور بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا چاہتا تھا۔ نجمہ کا بہنوئی عدالت میں پیش کار ہے۔ میں نے اسے بھی ساتھ بلایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے صحیح قانونی مشورہ دے۔ خانہ بدوشوں کی بستی میں نجمہ اور اس کے بہنوئی عاقل سے میری ملاقات ہوئی۔ یقینی بات تھی کہ اس ملاقات کے بعد میں اپنی گرفتاری دے دیتا لیکن اس وقت وچن سنگھ کے حمائیتیوں اور پولیس نے بستی پر دھاوا بول دیا۔ مجھے ایک بار پھر جان بچا کر بھاگنا پڑا......'' باتیں کرتے کرتے پہلوان کی سانس اکھڑنے لگی۔ بڑے ڈاکٹر نے آ کر اسے بولنے سے منع کر دیا۔ میں پہلوان کے پاس سے اُٹھ کر جانے لگا تو اس نے نمناک نظروں سے میری طرف دیکھا اور رک رک کر بولا۔

''تھانیدار جی! میری وجہ سے میرے چھوٹے بھائی پر کوئی مصیبت نہیں آنی چاہیے...... میری درخواست ہے کہ آپ اس سے نرمی کریں اور اگر ہو سکے تو صفیہ کو کہیں سر چھپانے کی جگہ دلا دیں...... وہ بالکل بے آسرا ہے۔''

ٹھیک دو گھنٹے بعد پہلوان مر گیا۔ وہ شخص مر گیا جو اکھاڑے کی آبرو اور پنج پانیوں کی پہچان تھا۔ کبھی نہ ہارنے والا اپنی تقدیر سے ہار گیا۔ سینے پر ناقدری کے زخم لے کر منوں مٹی کے نیچے سو گیا۔ اسے اکھاڑے کی مٹی سے قبر کی مٹی تک پہنچانے میں تقدیر کے ساتھ ساتھ اس کے چھوٹے بھائی کا ہاتھ بھی تھا اور یہی زیادہ دکھ کی بات تھی۔

دوسرے تیسرے روز میں نے ایاز عرف ایازی کو جالندھر میں جا پکڑا۔ جیون لا کر اس سے پوچھ گچھ کی گئی۔ دو دن چھتر کھانے کے بعد اس نے سب کچھ بک دیا۔ اپنے بڑے بھائی پر پہلی دفعہ بھی ایازی نے ہی حملہ کروایا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ شہباز سردار تلکو رام کی بستی میں نجمہ سے ملنے والا ہے تو اس نے وچن سنگھ کے لواحقوں کو اطلاع دے دی اور وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر دیپالپور پہنچ گئے...... یوں شہباز زندگی کی طرف آتے آتے پھر موت کی طرف لوٹ گیا۔ اس واقعے کے بعد جب ایازی نے محسوس کیا کہ میں نے شہباز کی گرفتاری میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے تو اس نے مجھے اکسانے کی کوشش کی اور مظلوم ماموں کا ذکر کر کے مجھے چوکس کرنا چاہا۔ ناکام ہو کر اس نے اوچھا ہتھکنڈا استعمال کیا اور رات کی تاریکی میں میرے کوارٹر کو آگ لگا دی۔ چونکہ مجھے اس سے پہلے شہباز ایک خط لکھنے کی غلطی کر چکا تھا لہٰذا آگ لگنے پر میرا دھیان فوراً اس کی طرف چلا گیا۔ ایازی کو کچھ لوگوں نے آگ لگاتے دیکھا تھا۔ ایازی بھی بھاری تن و توش کا تھا لہٰذا سمجھا گیا کہ وہ شہباز پہلوان ہے۔ یوں ہم سے غلطی پر غلطی ہوتی چلی گئی۔ بالکل آخر میں جب پہلوان گرفتار ہو کر ہسپتال پہنچ گیا تو ایازی وغیرہ کو ایک بار پھر فکر لاحق ہوئی کہ کہیں پورن کچھ کے ڈاکوؤں کے لئے عام معافی کے چکر میں شہباز پہلوان کو بھی رعایت نہ مل جائے۔ انہوں نے اچانک شب خون مارا اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے شہباز پہلوان کو ہسپتال کے بستر پر ہی زخم زخم کر دیا۔ یوں جو شخص سات آٹھ ماہ تک اپنے دشمنوں کو اور پولیس کو چکمہ دیتا رہا وہ اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں موت سے مات کھا گیا۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔

مجھے وہ منظر آج تک یاد ہے جب ایازی کو پتہ چلا کہ صفیہ ہی شہباز کی گمنام محبوبہ ہے۔ ایازی کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا تھا اور جب آیا تھا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رویا تھا اور اس نے حوالات کی سلاخوں سے سر ٹکرایا تھا اور خود کو لہولہان کر لیا تھا...... لیکن جو کچھ ہو چکا تھا اسے بدلا نہیں جا سکتا تھا، نہ ہی مرنے والے کو واپس لایا جا سکتا تھا۔ عدالت میں ایازی پر کیس چلا اور مختلف جرائم کی سزا میں اسے سات سال قید با مشقت ہوئی۔ ٹیک سنگھ اور جج ہری کشن سمیت اس کہانی کے دیگر کردار اپنے اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے، صرف ڈی ایس پی راجپال زندہ تھا۔ اس نے دھنی رام کے ریسٹ ہاؤس میں اپنے اختیار سے تجاوز کر کے مجھ پر حملہ کرایا تھا اور حبس بیجا میں رکھا تھا۔ اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو چکا تھا۔ میں اس معاملے کو عدالت میں لے جا کر راجپال کو سزا دلا سکتا تھا لیکن افسران کے کہنے پر اور اپنی خواہش کے مطابق میں نے اسے معاف کرنا مناسب سمجھا۔ راجپال نے مجھ سے معافی مانگ لی اور یوں ہمارے درمیان

راضی نامہ ہو گیا۔

ان واقعات کے قریباً دو ماہ بعد جالندھر، امرتسر اور کپورتھلہ کے کئی تھانوں کی پولیس نے پوری تیاری کے ساتھ پورن کچھ پر حملہ بولا۔ اس کارروائی میں ڈی ایس پی راجپال اور میں بھی شریک تھے...... یہ کارروائی بہت ہنگامہ خیز لیکن کامیاب رہی۔ ٹیک سنگھ کی موت نے ڈاکوؤں کو تتر بتر کر رکھا تھا۔ وہ پولیس سے شدید مزاحمت نہ کر سکے۔ پولیس نے ان کے بڑے ڈیرے کو گھیر لیا اور اسلحہ و منشیات برآمد کرنے کے علاوہ قریباً ایک سو ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار شدگان میں ٹیک سنگھ کا قائم مقام بارا بھی تھا۔ یوں پکی کے اکھاڑے سے شروع ہونے والی کہانی ایک سال بعد پورن کچھ کے گھنے جنگل میں اختتام کو پہنچی۔

اس کہانی کا اہم ترین کردار صفیہ ہے۔ انسپکٹر اروڑا کہا کرتا تھا یہ لڑکی پہلوان کی محبوبہ نہیں اس کی مریدنی تھی۔ وہ اس سے محبت ہی نہیں کرتی تھی کسی بہت بڑے پیر کی طرح اس کی عزت بھی کرتی تھی۔ اسی لئے تو اس کی خاطر بہن، بھائی، گھربار، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل میں جا بسی تھی۔ وہ اپنے شوہر کا ذکر بڑے احترام سے ''پہلوان جی'' کہہ کر کرتی تھی۔

پاکستان بننے کے بعد 1955ء میں جب وہ دوبارہ ہندوستان گیا تو امرتسر میں صفیہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اسی پرانے محلے گر والی دروازے میں رہتی تھی۔ اس نے پھر دوبارہ شادی نہیں کی۔ اس کا سب کچھ ایک بارہ سالہ گورا چٹا صحت مند لڑکا تھا۔ وہ سکول کی کبڈی ٹیم کا کپتان تھا اور اس کا نام تھا......شہباز۔

☆======☆======☆

چوہدری کی موت

کہتے ہیں ظلم پھر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی ظلم اور جابر شخص کا قصۂ عبرت جو خود کو ''ہٹلر'' سمجھتا تھا۔ قانون اس کے لیے کھلونا تھا اور قانون کے محافظ اس کے زرخرید غلام...... اس کا خیال تھا کہ زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے لیکن وہ زندگی اور موت دینے والی اصل ذات کو بھول گیا تھا۔

وہ فروری کی آخری راتیں تھیں۔ گورداسپور سے امرتسر جانے والی سڑک پر ایک دیہاتی لڑکی کی کچلی ہوئی لاش ملی۔ یہ علاقہ میرے تھانے میں آتا تھا مجھے موقعہ ملاحظہ کرنے جانا پڑا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں ایک حوالدار اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ جائے وقوع پر پہنچا تو میرا سب انسپکٹر گلزار سنگھ عرف کالیا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ عملے کے پانچ چھ افراد بھی تھے۔ انہوں نے لاش اُٹھا کر سڑک کے کنارے ڈال دی تھی اور اب ایمبولینس کا انتظار کر رہے تھے۔

موقعہ پر روشنی کا تو کوئی انتظام نہیں تھا...... ہاں ٹارچیں اور لالٹینیں وغیرہ موجود تھیں۔ ٹارچیں پولیس والوں کی تھیں اور لالٹینیں اُن دیہاتیوں کی جو اردگرد کے مکانات سے تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔ لڑکی کے جسم پر عام سے کپڑے تھے اُس کی لاش بُری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ کسی بس یا ٹرک وغیرہ کا ایک پہیہ اُس کے پیٹ سے اور دوسرا سینے سے گزر گیا تھا۔ جب کوئی نوجوان لڑکی اس قسم کے حادثے کا شکار ہوتی ہے تو خواہ مخواہ شکوک ذہن میں سر اُٹھانے لگتے ہیں، اور پھر اس لڑکی کے پاس سے تو گہنے اور روپے وغیرہ بھی برآمد ہوئے تھے۔ سب انسپکٹر کالیا نے یہ سارا سامان لڑکی ہی کے خون آلود دوپٹے میں باندھ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔

موقعہ پر موجود افراد میں سے کوئی اس لڑکی کو پہچانتا نہیں تھا، معلوم نہیں یہ لاش کب سے یہاں پڑی تھی یقینی بات تھی کہ کئی لوگوں نے یہ لاش دیکھی ہوگی مگر پولیس کے چکر سے بچنے کے لیے عموماً لوگ ایسے موقعوں پر رُکتے نہیں۔ قریباً ایک گھنٹا پہلے سب انسپکٹر کالیا اپنے گشتی دستے کے ہمراہ ادھر سے گزرا تھا اور اُس نے لاش کو سڑک کے درمیان سے اُٹھا کر ایک طرف ڈالا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا ورنہ ممکن تھا لاش ساری رات سڑک پر پڑی رہتی اور ٹریفک اوپر سے گزر گزر کر اس کا قیمہ بنا دیتی۔ لڑکی کے پاس رقم موجود تھی اور زیور بھی تھے۔

یہی ذہن میں آتا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ کر کسی کے پاس جا رہی تھی کہ سڑک پار کرتے ہوئے کسی بس یا ٹرک تلے آ گئی۔

ہم موقعے پر ضروری کارروائی کرنے کے بعد لاش کو تھانے لے گئے۔ اصولی طور پر لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھیجنا چاہیے تھا لیکن ہم چاہتے تھے کہ صبح ہو جائے اور قرب و جوار کے لوگ آ کر لاش کی شناخت کر سکیں صبح ہونے تک اس حادثے کی خبر دور و نزدیک پھیل گئی میرا تھانہ گورداسپور کے نواح میں تھا اس تھانے کو شہری اور دیہاتی دونوں علاقے لگتے تھے ہم نے لاش ایک کھلے احاطے میں رکھوا دی تھی۔ لوگ جوق در جوق لاش دیکھنے آنے لگے لڑکی کا جسم بُری طرح کچلا گیا تھا لیکن چہرے پر چند خراشوں کے سوا کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی وہ ایک قبول صورت لڑکی تھی بال شہد رنگ تھے، ناک کی چھوٹی سی کوکی اور کان کی مُرکیوں سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ بیاہتا نہیں ہے۔

لاش دوپہر تک تھانے کے سامنے پڑی رہی لیکن کوئی اسے شناخت نہ کر سکا مجبوراً اُسے پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال پہنچانا پڑا۔ میں نے اردگرد کے تھانوں میں اطلاع دے دی کہ ایک لاوارث لڑکی کی لاش ملی ہے لہٰذا اس سلسلے میں کوئی اطلاع ملے تو مجھ سے رابطہ کیا جائے۔ لڑکی کے پاس سے ایک سستے بٹوے کے سوا اور کچھ نہ ملا تھا۔ زیور اور نقدی اسی بٹوے میں تھے۔ زیور اندازاً چار تولے اور نقدی چھ سو روپیہ تھی۔

تیسرے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی۔ یہ رپورٹ چونکا دینے والی تھی۔ پولیس سرجن نے بتایا تھا کہ لڑکی کے جسم پر کئی ایسی خراشیں اور ضربات موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حادثے کا نتیجہ نہیں۔ ان میں اُس کے چہرے کی خراشیں بھی شامل ہیں۔ پولیس سرجن نے لکھا تھا کہ متوفیہ کے تمام اعضاء بُری طرح کچلے گئے ہیں پھر بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شادی شدہ تھی یا حال ہی میں اُس نے کسی سے تعلقات قائم کیے تھے...... یا پھر اُس سے زیادتی ہوئی تھی۔ اس پوسٹ مارٹم رپورٹ میں واضح طور پر کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن جتنا بھی بتایا گیا تھا وہ شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ لاش سرد خانے میں بھیج دی گئی تھی...... کچھ دن بعد محسوس ہونے لگا کہ یہ سارا معاملہ ہی سرد خانے میں چلا جائے گا۔ لڑکی کا کوئی والی وارث سامنے نہیں آیا تھا، نہ ہی کوئی ایسا گواہ یا ثبوت ملتا تھا جس کے ذریعے تفتیش کو آگے بڑھایا جا سکتا۔

کیس وہی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں جن کی پیروی ہوتی ہے میں جس تھانے میں تھا

وہاں ویسے بھی ایک دو سنگین کیس روزانہ پہنچ جاتے تھے۔ چند دن کے اندر میں کئی دوسرے معاملات میں اُلجھ گیا پھر مجھے ضلع گورداسپور کے ہی ایک دور دراز گاؤں ''نوابی'' جانا پڑا۔ نوابی کے ایک بہت بڑے چوہدری نے انگریز ڈپٹی کمشنر صاحب کو اپنے بھائی کی شادی کے بہانے گاؤں میں بلا لیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے تشریف لانی ہو تو پولیس اہلکاروں کو کئی طرح کے انتظام کرنے پڑتے ہیں میں بھی ضروری کام چھوڑ کر ان انتظامات میں لگا رہا اسی طرح کے چکروں میں پندرہ بیس روز گزر گئے۔ ایک روز میں تھانے پہنچا تو میرے ہیڈ کانسٹیبل نے ایک رقعہ میرے ہاتھ میں تھما دیا میں نے رقعے پر نگاہ دوڑائی اور حیران رہ گیا۔ یہ ہندی اخبار کی رپورٹر کملا سنہا کی طرف سے تھا کملا سنہا کے بارے میں آپ پچھلی کہانیوں میں پڑھ چکے ہیں وہ ایک امیر خاندان کی خوبصورت لیکن مہم جُو قسم کی لڑکی تھی۔ مجھے اُس کے بارے میں جو اطلاع ملی تھی وہ یہ تھی کہ کملا اپنے ڈیڈی کے ہمراہ ولایت چلی گئی ہے...... اور اب اس بات کو قریباً ایک مہینہ گزر چکا تھا، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ دن ہو چکے تھے۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''کون دے گیا ہے یہ رُقعہ؟''

ہیڈ کانسٹیبل کی بجائے بلال شاہ نے جواب دیا (وہ ساتھ والے کمرے میں بیٹھا تھا اور لسی پراٹھے کا ناشتہ کر رہا تھا) کہنے لگا۔ ''دینا کس نے تھا جی۔ وہ آپ کی پرانی واقف کار خود آئی ہوئی تھی پورے تھانے میں یوں گھوم رہی تھی جیسے اپنا ہی راج ہے......''

میں نے بلال شاہ کی بات نظرانداز کرتے ہوئے رقعے پر نگاہ دوڑائی لکھا تھا۔ ''نواز صاحب! میں نے اپنے پتا کے ساتھ ولایت چلے جانا تھا لیکن کاغذات میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی اس لیے نہ جا سکی۔ اگر میں پتا کے ساتھ ولایت چلی گئی ہوتی تو آج آپ کو وہ اطلاع کیسے دیتی جو کچھ ظالم افراد کے گلے کا پھندا بنے گی، جی ہاں...... میرے پاس ایک بہت اہم خبر ہے آپ کے لیے اور کچھ فوٹو بھی، میں نے نیچے اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ دیا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھ سے رابطہ کریں فقط آپ کی خیر خواہ کملا سنہا۔''

نیچے فون نمبر لکھا تھا میں کچھ دیر سوچتا رہا ایک بار فون کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا فون کرنا ویسے بھی میرے حق میں بہتر تھا کیونکہ فون نہ کرتا تو وہ کسی بھی وقت خود یہاں آ دھمکتی۔ میں نے نمبر ڈائل کیے لیکن دوسری طرف فون مصروف تھا میں نے ریسیور رکھ دیا اور پھر دو دن گزر گئے نہ اُس نے رابطہ کیا اور نہ مجھے دوبارہ فون کرنے کا خیال آیا۔ وہ فروری کی ایک خوشگوار شام تھی دو دن کی بوندا باندی کے بعد کھل کر دھوپ نکلی تھی اور دھوپ کی تمازت اچھی لگ رہی تھی۔ میں بلال شاہ کے ساتھ صحن میں بیٹھا تھا اچانک وہ آ دھمکی صحن کی کیاریوں میں

کھلے زرد پھولوں کی طرح اس نے بھی گہرا زرد لباس پہن رکھا تھا چمکیلے بال حسبِ معمول شانوں پر بکھرے تھے، اُس کے کندھے سے چرمی بیگ جھول رہا تھا۔

''لو جی آ گئے تھانے کے اصل مالک۔'' بلال شاہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کملا کو گھورتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

کملا نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا اور بولی۔ ''تکلیف کی معافی چاہتی ہوں جی۔ میں نے سوچا آپ نے تو آنا نہیں خود ہی چل کر جانا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا ضروری بھی کیا کام آن پڑا ہے؟''

وہ ذرا تلخ لہجے میں بولی۔ ''آج گھر جا کر میں غور سے آئینہ دیکھوں گی شاید میرے چہرے پر لکھا ہوا ہے کہ میں جھوٹی ہوں۔ ورنہ آپ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش تو کرتے۔''

میں نے اسے بتایا کہ میں نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اُس کا فون مصروف ملتا رہا اتنی سی وضاحت سے اُس کا غصہ ٹھنڈا ہونے والا تو نہیں تھا۔ بہرحال کچھ کم ضرور ہو گیا۔ میں اُسے لے کر دفتر میں آ بیٹھا۔ میں دروازہ بند کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس نے خود اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

چند رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم جلد ہی اصل موضوع پر آ گئے اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور ایک لفافے میں سے چند فوٹو گراف نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ اُن دنوں رنگین تصویروں کا رواج نہیں تھا۔ کیمرے بھی اتنے اچھے نہیں ہوتے تھے پھر کملا جو تصویریں دکھا رہی تھی وہ رات کو کھینچی گئی تھیں اس کے باوجود جو مناظر نظر آئے انہوں نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ رات کے وقت سڑک پر کسی عورت کی کچلی ہوئی لاش پڑی تھی۔ ایک تصویر میں صرف لاش نظر آ رہی تھی دوسری میں ایک دیہاتی بھی تھا جو ٹارچ کی روشنی لاش پر ڈال رہا تھا اس دوسری تصویر میں لاش زیادہ وضاحت سے نظر آ رہی تھی مرنے والی نے سیاہ پھولوں والی سفید قمیص پہن رکھی تھی اور اس قمیص کو دیکھتے ہی مجھے اُس لاوارث لڑکی کی لاش یاد آ گئی جسے کچھ روز پہلے ہم نے تھانے سے باہر شناخت کے لئے رکھا تھا یہ اسی لاوارث لڑکی کی لاش تھی۔ میں نے کملا سے پوچھا۔ ''یہ تصویریں...... تم نے اُتاری ہیں؟'' اُس نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک تیسری تصویر میرے سامنے کر دی یہ تصویر بھی فلیش لائٹ میں اُتاری گئی تھی اور صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کسی چلتی گاڑی سے اُتاری گئی ہے کافی مدھم تصویر تھی اور اس میں ایک ریڑھے کے پاس چند چادر پوش افراد کھڑے نظر آ رہے تھے۔ چوتھی تصویر بھی اسی ریڑھے کی تھی یہ تصویر نزدیک سے اُتاری گئی تھی اور کافی صاف تھی۔ ریڑھے کے پاس کھڑے افراد

میں سے ایک ہٹے کٹے شخص کی صورت صاف نظر آ رہی تھی اُس کے ہاتھ میں کوئی رائفل نما شے تھی اس کے ساتھ کھڑا شخص اپنے داہنے ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا جیسے اُس نے تصویر کھینچنے والے کو دیکھ لیا ہو اور اسے اس حرکت سے روکنا چاہتا ہو۔ اس دوسرے شخص کی صورت بھی پہچانی جا رہی تھی اس کے ہونٹ پر کوئی سفید پٹی جیسی شے بھی نظر آ رہی تھی

میں نے کملا سے پوچھا یہ سب کیا ہے بھئی کب اُتاری ہیں تم نے یہ تصویریں؟

''اُسی رات جس رات یہ قتل ہوا۔''

''قتل؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''سو فیصد قتل۔'' کملا نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ''میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اُس ٹرک کا نمبر بھی میرے پاس نوٹ ہے جس نے کملا کی لاش کو کچلا۔''

''لاش کو کچلا...... تمہارا مطلب ہے کہ حادثہ پیش آنے سے پہلے لڑکی مر چکی تھی۔''

''سو فیصد مر چکی تھی۔'' کملا نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ بات کرتے ہوئے کملا کا لہجہ کانپ رہا ہے وہ جیسے سب کچھ ایک بار پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی اُس نے ایک گہری سانس لی سر جھٹک کر بال پیشانی سے پیچھے ہٹائے اور بولی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ اس لڑکی کا کیس آپ کے پاس آیا ہے۔ میں قتل کی رات ہی آپ سے ملنا چاہتی تھی لیکن نہ مل سکی اس کی وجہ میں آپ کو ابھی بتاتی ہوں پہلے یہ سن لیجئے کہ میں اس واردات کی چشم دید گواہ کیسے بنی۔'' اس نے کہا۔ ''میری ایک سہیلی جامن پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ٹیچر ہے اور ہاسٹل میں رہتی ہے میں چوبیس فروری کے روز اس سے ملنے گئی ہوئی تھی واپسی میں ذرا دیر ہوگئی گورداسپور واپس آتے ہوئے ''نالہ پُل'' کے پاس میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا بہر حال گاڑی کو روکتے روکتے میں نے کچے میں اُتار لیا اور ٹائر تبدیل کر کے روانہ ہونے والی تھی کہ مجھے ایک ریڑھا نظر آیا وہ کچے راستے سے سڑک پر چڑھا تھا اور بڑی دھیمی رفتار سے کنارے کنارے چلنے لگا تھا۔ ریڑھا میرے نزدیک سے گزرا لیکن میری کار چونکہ جھاڑیوں میں تھی اس لیے مجھ پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی۔ ریڑھے پر تین چار افراد کے ہیولے نظر آرہے تھے مجھے شک گزرا کہ یہ لوگ مسلح ہیں بیس تیس قدم آگے جا کر ریڑھا رُک گیا دو افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ انہوں نے چوکنے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر جلدی سے ایک جسم ریڑھے پر سے اُتارا اور سڑک پر رکھ دیا اس کے ساتھ ہی وہ لوگ ریڑھا چلا کر آگے لے گئے اور پھر سڑک سے اُتر کر درختوں میں گم ہوگئے میں حیران پریشان کھڑی تھی چاندنی میں مجھے سڑک پر پڑا ہوا جسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔

بمشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ دائیں جانب سے میں نے ایک گاڑی کی روشنیاں دیکھیں یہ گاڑی بڑے مشکوک سے انداز میں اُس جسم کی طرف بڑھی جو سڑک پر بے حرکت پڑا تھا۔ گاڑی میرے قریب سے گزری تو پتہ چلا کہ وہ ایک ٹرک ہے میں نے کوشش کی اور اس کا نمبر نوٹ کرنے میں کامیاب رہی اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ٹرک کو سڑک پر پڑے جسم پر سے گزرتے اور بڑی تیزی سے اوجھل ہوتے دیکھا میری آنکھوں کے سامنے ایک نہایت سنگین جرم رُونما ہو چکا تھا۔ میں جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھی، اُسے اسٹارٹ کیا اور موقعہ واردات کی طرف بڑھی مجھے دور ہی سے اندازہ ہوا کہ ایک شخص لاش کے قریب موجود ہے میرے پاس فلیش گن والا کیمرہ موجود تھا لاش کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے تیزی سے دو تصویریں اُتاریں اور آگے بڑھ گئی قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر مجھے وہی ریڑھا کچے پر کھڑا نظر آیا چند افراد اُس کے اردگرد موجود تھے میں نے چلتی گاڑی میں سے ریڑھے کی دو تصویریں اُتار لیں۔''

کملا نے ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں اس تصویر میں یہ بندہ مجھ پر چیخ رہا ہے اس کے ساتھ کھڑے شخص کے ہاتھ میں رائفل بھی صاف نظر آ رہی ہے بعد میں اس شخص نے میری گاڑی پر بھی فائر کیا لیکن اُس وقت تک میں کافی آگے گزر چکی تھی۔ گورداسپور پہنچ کر میں سیدھی یہاں تھانے میں آئی کہ رپورٹ لکھوا سکوں لیکن تھانے میں اُس وقت ایک حوالدار اور دو سپاہیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا معلوم ہوا کہ آپ لوگ کسی کام سے نکلے ہوئے ہیں میں مایوس ہو کر گھر چلی گئی۔ وہیں تھوڑی دیر بعد میرے ایڈیٹر رام پال صاحب بھی آگئے رام پال صاحب بڑے جذباتی آدمی ہیں جلدی سے جوش میں آجاتے ہیں اور جلدی سے جوش ٹھنڈا بھی کر لیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے شاباش دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ میں اس معاملے میں سخت احتیاط برتوں عین ممکن ہے کہ مجرموں نے میری گاڑی کا نمبر دیکھ لیا ہو یا ویسے ہی اندازہ کر لیا ہو کہ میں کوئی اخبار والی ہوں اور اب گورداسپور میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں۔ رام پال صاحب کی بات میں وزن تھا میں نے جس طرح مجرموں کی تصویریں اُتاری تھیں کوئی اخبار والا ہی اس طرح کر سکتا ہے۔ آج کل جتنے اخبار چھپ رہے ہیں اُن میں مشکل سے سات آٹھ عورتیں ہی کام کر رہی ہیں۔ ان سات آٹھ عورتوں میں سے ایک ایسی عورت کا سراغ لگانا جس کے پاس سرخ گاڑی ہو اور جو گورداسپور میں رہتی ہو بالکل مشکل بات نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے واقعی احتیاط کرنی چاہیے بڑے مندر کے علاقے میں رام پال صاحب کے پاس ایک کوارٹر ہے میں اپنا ضروری

گہری سرخ آنکھوں والا اکہرے بدن والا لڑکا تھا۔ ہونٹ سگریٹ نوشی کی وجہ سے سیاہ نظر آتے تھے۔ وہ رشتے میں سلام علی کا سالا تھا میں حیران ہو رہا تھا کہ سلام علی جیسے شخص نے سعید جیسے لڑکے کو ساتھ کیوں رکھا ہوا ہے اب اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی وہ اس کی جورو کا بھائی تھا اور یہ مثل مشہور ہے کہ ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف۔ سعید کو دیکھ کر سلام علی کی آنکھوں میں جو تاثرات اُبھرے اُن سے اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی سعید کو پسند نہیں کرتا۔

میں نے سعید سے علیحدہ کمرے میں پوچھ گچھ کی میں نے اُس کا نام پتہ اور دیگر کوائف پوچھنے کے بعد اندھیرے میں پہلا تیر چلایا میں نے اُس سے کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ کبھی کبھی تم خود بھی ٹرک چلاتے ہو۔''

اُس نے کہا۔ ''ایک دو بار ہی ایسا ہوا ہے جی۔ میں نے کچے راستے پر ٹرک چلایا ہے اور وہ بھی بھائی جان سے پوچھ کر اور اُن کی اجازت سے۔'' میں نے جیب سے کملا کی کھینچی ہوئی وہ تصویر نکالی جس میں ریڑھے کے آس پاس چادر پوش افراد کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ''اِن لوگوں کو پہچانتے ہو؟'' میں نے تصویر اُسے دکھا کر پوچھا۔

اُس نے چونک کر تصویر دیکھی اور پھر اچانک اس کا چہرہ زرد نظر آنے لگا۔ ''کک...... کون ہیں یہ؟''

''وہی جو لڑکی کو ریڑھے پر لاد کر ''نالہ پل'' پر لائے تھے اور اُسے سڑک پر ڈالا تھا۔''

''کک...... کون سی لڑکی...... کس نے...... ڈالا تھا۔''

سعید سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کے پاؤں اُکھڑے اُکھڑے تھے وہ کوئی بہت چالاک اور تجربہ کار بھی نہیں تھا...... صرف آدھ گھنٹے کے اندر میں نے اُس سے اقرار کروالیا۔ جب میں نے بار بار زور دے کر کہا کہ وہ قاتل ہے اور اُس نے باقاعدہ منصوبہ بنا کر ایک بے گناہ کو ٹرک تلے کچلا ہے تو اُس کے منہ سے نکل گیا کہ میں اس پر جھوٹا الزام لگا رہا ہوں اور اس کے ایک چھوٹے سے جرم کو ''قتل کی واردات'' بنا رہا ہوں۔ جب ایک بار زبان پھسل گئی تو پھر اُس کے پاس سنبھلنے کی کوئی گنجائش نہ رہی اور اُسے بتانا پڑا کہ اُس سے کون سا چھوٹا سا جرم ہوا ہے اور کیوں؟ اُس نے لرزتے کانپتے لہجے میں کہا انہوں نے مجھے...... مارنے کی دھمکی دی تھی اور زبردستی لے گئے تھے۔''

''کہاں لے گئے تھے؟''

''نالہ پل پر اُن کے پاس ایک لڑکی کی لاش تھی جسے وہ ریڑھے پر ڈال کر لائے تھے

انہوں نے وہ لاش سڑک پر ڈال دی اور مجھ سے کہا کہ میں اس کے اوپر سے دو تین بار ٹرک اس طرح گزاروں کہ اس کا قیمہ بن جائے لیکن...... میں ڈر گیا کیونکہ جب میں ٹرک موڑ کر دوبارہ لاش کی طرف آ رہا تھا میں نے ایک سرخ گاڑی کو دیکھا، اُس میں سے کسی نے لاش کی تصویر اُتاری تھی۔ میں اس وقت جھاڑیوں میں تھا واپس سڑک پر آنے کی بجائے میں کچے پر ہی آگے نکل گیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر نہر والی سڑک پر نکل آیا۔''

میں نے سعید سے پوچھا۔ ''کون تھے وہ لوگ؟''

ایک دم سعید کا زرد چہرہ کچھ اور زرد ہو گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میں اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب...... پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے گجر ٹائپ لگتے تھے انہوں نے ......میری گردن پر پستول رکھ دیا تھا وہ بہت خطرناک لوگ نظر آتے تھے میرا اُن سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے جی۔''

سعید کے جواب ہی میں اس کا اعتراف پوشیدہ تھا وہ مجھ سے التجا کر رہا تھا کہ میں اُسے اُن خطرناک لوگوں کے معاملے میں نہ گھسیٹوں، اس کے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کر رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ جانتا ہے اگر نہ جانتا ہوتا تو مجھ سے التجائیں اور درخواستیں کیوں کرتا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا...... ہم اسے اور اس کے بھائی جان یعنی سلام علی کو اپنے ساتھ امرتسر کے مرکزی تھانے میں لے آئے۔ سلام علی بھلا مانس شخص تھا اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ سعید جیسے نشے باز اور آوارہ کا بہنوئی تھا میں نے اسے اپنے کمرے میں بٹھایا اور سعید کو تھوڑی دیر کے لیے سب انسپکٹر کالیا کے حوالے کر دیا کالیا اپنے کام میں بڑا ماہر تھا اس نے سعید پر آدھ پون گھنٹہ ''محنت'' کی اور اُسے بالکل سیدھا کر دیا۔ کالیا سے چھٹکارہ پانے کے بعد سعید نے جو بیان دیا وہ خاصا انکشاف انگیز تھا اس نے اپنا پہلا بیان مکمل طور پر بدل لیا تھا اس نے اعتراف کیا کہ چوبیس فروری کی رات اس نے جو کچھ بھی کیا لالچ میں آ کر کیا تھا اسے لالچ دینے والے گورداسپور کے قریبی گاؤں نوابی کے افراد تھے۔ سعید نے ان کے نام گوبند سنگھ، پورن سنگھ اور کشنا بتائے اُس نے کہا کہ وہ ٹرک کے ساتھ اکثر گورداسپور جاتا رہا ہے ان تینوں افراد سے اس کی جان پہچان وہیں پر ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح نشے باز ہیں اس لیے اکثر ان سے ملاقات رہنے لگی چوبیس فروری کو دوپہر ایک بجے پورن سنگھ اور کشنا اس کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ ایک بڑا منافع بخش کام ہے دو گھنٹے میں وہ پورے پانچ سو روپے کما سکتا اُس نے پوچھا کام کیا ہے انہوں نے بتایا کہ یہ وہ موقع پر چل کر بتائیں گے وہ اسے اپنے ساتھ نالہ پل پر

لے گئے اور وہاں جا کر اُسے پتہ چلا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔

میں نے سعید سے پوچھا۔ ''یہ پورن اور کشنا کرتے کیا ہیں؟''

وہ بولا۔ ''کچھ نہیں کرتے جی...... اُنہیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ ایک بڑے زمیندار کے کمدار (نوکر) ہیں۔''

''کس زمیندار کے؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں سعید نے جو نام لیا وہ مجھے چونکانے کے لیے کافی تھا اُس نے چوہدری انپت رائے کا نام لیا تھا۔ انپت رائے وہی چوہدری تھا جس کے بھائی کی شادی پر چند روز پہلے ڈپٹی کمشنر صاحب بنفسِ نفیس تشریف لائے تھے اور مجھے انتظامات کے لیے دو تین دن تھانے سے غیر حاضر رہنا پڑا تھا۔ انپت رائے ضلع گورداسپور کا دبنگ چوہدری تھا وہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس کی زمین چھ سات دیہات تک پھیلی ہوئی تھی کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ اُس نے قریباً دو مربع زمین پر ایک بہت بڑا فارم بھی بنا رکھا تھا قرب و جوار میں یہ جگہ ''رائے فارم'' کے نام سے مشہور تھی سنا تھا کہ اس فارم میں پانچ پانچ دس دس ایکڑ کے کئی فارم ہیں کسی میں بھیڑ بکریاں، کسی میں گھوڑے اور کسی میں کتے پالے گئے تھے۔ جب سعید نے انپت رائے کا نام لیا، میں سمجھ گیا کہ اب مجھے گورداسپور چھوڑنا پڑے گا یا پھر رائے فارم کے اردگرد ایک زبردست کہانی جنم لے گی۔

☆======☆======☆

میں نے ٹرک ڈرائیور سلام علی کو تو چھوڑ دیا لیکن اس کے ٹرک اور سالے کو تھانے میں رکھنا ضروری ہو چکا تھا تفتیش کا سرا ہاتھ آ گیا تھا اور اگر ہم میں ہمت ہوتی اور ہم کوشش کرتے تو پوری گتھی سلجھ سکتی تھی۔ انپت رائے کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے ایس پی سے مشورہ کر لوں۔ میں ایس پی سے مشورے کے لیے روانہ ہونے ہی والا تھا جب اچانک مجھے یاد آیا کہ میرا ایک پرانا حوالدار دوست جو ایک پولیس مقابلے میں اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھا تھا نوابی گاؤں میں رہتا ہے چند روز پہلے جب ڈپٹی کمشنر صاحب نوابی آئے تھے اور میں انتظامات کے لیے وہاں گیا ہوا تھا میری اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ میرے دل میں آئی کہ کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے میں حوالدار جیون سنگھ سے مل لوں عین ممکن تھا کہ وہ اپنے ہی گاؤں سے تعلق رکھنے والی واردات کے بارے میں کچھ جانتا ہو اور اس حوالے سے مجھے کچھ بتا سکے۔

میں نے اسی وقت جیپ پکڑی اور براستہ ''نالہ پل'' نوابی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

دو گھنٹے کے دشوار گزار سفر کے بعد شام کے چھ بجے میں نوابی گاؤں کے ایک کچے کوٹھے میں معذور حوالدار جیون سنگھ کے سامنے بیٹھا تھا کمرے کی خوابناک فضا کو لالٹین کی زرد روشنی کچھ اور خوابناک بنا رہی تھی حوالدار کی بیساکھیاں اس کی گود میں پڑی تھیں اور وہ یک ٹک انگیٹھی میں دہکتے انگاروں کو دیکھ رہا تھا۔

کہنے لگا۔ ''انسپکٹر نواز خاں! پتہ نہیں کیوں مجھے وشواس تھا کہ تم جلد یا بدیر یہاں میرے پاس آؤ گے اور مجھے اس کمرے میں یوں انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر تمہارے سوال کا جواب دینا ہو گا۔ تمہارا یہ اندازہ درست ہے نواز خاں کہ اس گاؤں میں واردات ہوئی ہے اور یہ بھی اندازہ درست ہے کہ میں اس بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں لیکن اس بارے میں جاننے والا میں اکیلا نہیں ہوں اس گاؤں میں بلکہ اردگرد کے دیہات میں بھی درجنوں افراد اس بارے میں جان چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ پولیس تک پہنچے، پولیس تک پہنچنا تو بہت دور کی بات ہے لوگ آپس میں بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں...... تم خود اندازہ لگاؤ کہ جن لوگوں پر ظلم ہوا ہے ان سے بھی کوئی پوچھے تو وہ صاف انکار کر دیں گے اور یہ کوئی ایک جرم نہیں ہے ایسے کئی جرم ہیں جو لوگوں کے سینوں میں قیمتی رازوں کی طرح محفوظ ہیں ایسا اس وجہ سے ہے کہ ان جرائم کا تعلق چوہدری انپت رائے سے ہے۔ انپت رائے جیسے چوہدری میں نے دیکھے ہیں اور تم نے تو بہت زیادہ دیکھے ہوں گے تم خود ہی بتاؤ یہ ظالم بھلا کسی کو کچھ بولنے دیتے ہیں؟ ان کی دہشت زبانوں پر تالے لگا دیتی ہے اور آنکھیں دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو جیون سنگھ لیکن میں اگر تمہارے پاس آیا ہوں تو اس لیے کہ تم عام لوگوں سے مختلف ہو تم نے ہمیشہ بے خوفی کے ساتھ قانون کا ساتھ دیا ہے اور مجھے یقین تھا کہ تم مجھے مایوس نہیں لوٹاؤ گے۔''

''میں تمہارے یقین پر پورا اُتروں گا نواز خان!'' حوالدار جیون سنگھ نے کہا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا، ایک بیٹے ایک بہو اور دو پوتوں کے سوا اب اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے میں اپنی جان پر تو ہر ظلم برداشت کر سکتا ہوں لیکن انہیں کوئی تکلیف پہنچے یہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''تم کسی طرح کا فکر نہ کرو جیون سنگھ، میں جس رازداری سے تمہارے پاس آیا ہوں اسی رازداری سے واپس چلا جاؤں گا اور جو کچھ تم بتاؤ گے وہ میرے پاس تمہاری امانت ہو گا میرا وعدہ ہے کہ اس گفتگو کی وجہ سے تم پر کبھی کرئی حرف نہیں آئے گا۔''

جیون سنگھ نے ایک بے حد گہری سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ لڑکی جس کی لاش گورداسپور سے ملی ہے، مسلمان ہے اس کا نام جمیلہ ہے...... اور اسے چوہدری انپت رائے نے قتل کیا ہے۔''

اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے جیون سنگھ نے کہا۔ ''یہاں ''نوابی'' میں جمیل نامی ایک لڑکا رہتا ہے ماں باپ مر چکے ہیں جمیلہ اس کی بہن تھی جمیل نے جمیلہ کو بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ والدین کا پیار بھی دیا تھا اور بڑی محبت سے اس کی پرورش کی تھی۔ جمیل کا کل اثاثہ ایک چھوٹی سی باغیچی ہے اس میں دو درجن بیریاں اور دس بارہ جامن کے پودے ہیں وہ سارا سال بڑی محنت سے باغیچی کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی آمدن سے گھر کا خرچ چلاتا ہے۔ چوہدری انپت رائے کے دو بیٹے گورداسپور کے اسکول میں پڑھتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں سردیوں کی چھٹیوں میں وہ گاؤں آئے ہوئے تھے۔ ایک دن وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ جمیل کی باغیچی میں جا پہنچے جمیل نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا بیر وغیرہ توڑ کر دیئے اور دو تھیلے بھر کر ساتھ لے جانے کے لیے دے دیئے۔ اگلے دن لڑکے پھر آدھمکے جمیل نے پھر ان کی ''مہمانداری'' کی۔ پھر یہ روز کا کام ہو گیا۔ چوہدری کے دونوں بیٹے باغیچی میں پہنچتے اور خوب اودھم مچاتے۔ جمیل کا تو روزگار یہی تھا۔ وہ اس باغیچی کی فصل کھاتا تھا اور یہ کسان یا باغبان ہی جانتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے فصل برباد ہو رہی ہو تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ ایک روز وہ ڈرتے ڈرتے چوہدری انپت رائے کے پاس شکایت لے گیا انپت رائے پتہ نہیں کس موڈ میں بیٹھا تھا یا کسی نے اسے جمیل کے خلاف بھڑکا رکھا تھا وہ آگ بگولا ہو گیا اور نوکروں سے کہا کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیں۔ نوکر اس پر پل پڑے اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ بات یہیں پر رہتی تو بھی کسی کی جان نہ جاتی مگر نوکروں نے کچھ زیادہ ہی غصہ دکھایا اور گلی میں آ کر جمیل پر جوتے برسانے کی کوشش کی۔ وہ بھی آخر انسان تھا جوان تھا اور صحت بھی چوہدری کے سارے چمچوں سے اچھی تھی۔ اس نے جب بات حد سے بڑھتی دیکھی تو نوکروں سے الجھ گیا اس کا ایک ہاتھ لگنے سے انپت رائے کے ایک ادھیڑ عمر کمدار کا ہونٹ پھٹ گیا۔ بس پھر اس کی کم بختی آ گئی یہ معمولی ''جرم'' انپت رائے کے نزدیک دس آدمیوں کے قتل سے زیادہ سنگین تھا اس جرم کی سزا میں جمیل کو بھرے بازار میں برہنہ کر کے پیٹا گیا۔ پھر اس کی مشکیں کس کے ایک بیل گاڑی پر ڈالا گیا اور پولیس چوکی پہنچا دیا گیا وہ پولیس چوکی بھی کیا ہے، انپت رائے کا عقوبت خانہ ہی ہے۔ چوکی کا انچارج اے ایس آئی منوہر سنگھ چوہدری کا ہاتھ بندھا غلام ہے۔ اس چوکی میں منوہر اور اس کے عملے کا صرف ایک ہی کام

ہے چوہدری کی ہاں میں ہاں ملانا، چوہدری کے ایک اشارے پر اس نے جمیل کو حوالات میں الٹا لٹکا دیا اور دو روز تک مار مار کر اس کا برا حال کر دیا۔ دوسری طرف چوہدری کے کارندوں نے سزا کے طور پر باغیچی اجاڑی اور کچا پکا سارا پھل توڑ کر گاؤں والوں میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ جمیل نے باغیچی پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا اور پٹواری کے کاغذات میں یہ زمین نوابی گاؤں کے شمشان گھاٹ کی ہے۔

جمیلہ اپنے بھائی کی مصیبت پر تڑپ رہی تھی۔ اس نے پولیس چوکی جا کر اپنی آنکھوں سے بھائی پر ہونے والا ظلم و ستم دیکھا تھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے رازداری سے اسے مشورہ دیا کہ وہ جا کر چوہدری انپت رائے سے معافی مانگ لے۔ وہ منت سماجت کرے گی تو اس کا دل پسیج جائے گا اور پولیس کی مار سے جمیل کی جان چھوٹ جائے گی۔ دوسری طرف کچھ لوگوں نے کہا کہ انپت رائے کے سامنے ناک رگڑنے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا وہ غصے میں ہے اور اس کی ایک نہیں سنے گا، وہاں سے بھی یہ معاملہ پولیس میں جا چکا ہے اور اب پولیس ہی کار مختار ہے۔ گاؤں کے ہی ایک شخص نے چوری چھپے جمیلہ کو مشورہ دیا کہ وہ گورداسپور جا کر ڈی ایس پی سے ملے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

مصیبت کی ماری لڑکی نے ''نذر نذرانے'' کے لیے اپنے جہیز کے زیور اور نقدی ساتھ لی اور راتوں رات گورداسپور روانہ ہو گئی اس کے بعد آج تک اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن تم تو کہہ رہے ہو کہ اسے چوہدری انپت رائے نے قتل کر دیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں قتل کر دیا ہے اور سب کو معلوم کہ قتل کر دیا ہے لیکن یہ اندر خانے کی بات ہے ظاہر ہے سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ انہیں کچھ پتہ نہیں...... چوہدری کے کارندے عام لوگوں میں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ لڑکی ٹھیک نہیں تھی جب تک بھائی کا ڈر تھا شریف بنی بیٹھی تھی۔ بھائی حوالات چلا گیا تو بہن زیور اور نقدی سمیت کر کہیں نکل گئی۔''

''لیکن گاؤں والوں کو کیسے معلوم ہوا کہ لڑکی گم نہیں ہوئی قتل ہوئی ہے۔''

''ایسی باتیں چھپی کہاں رہتی ہیں نواز خان۔ جمیلہ کے جانے کے تین چار دن بعد ہی گاؤں میں یہ خبر گردش کرنے لگی تھی کہ جمیلہ اس رات شہر نہیں گئی تھی بلکہ چاچا طفیل اسے اپنے گھر لے گیا تھا وہ اس گھر میں اگلے روز دوپہر تک رہی تھی پھر اس کی لاش ایک جیپ میں ڈال کر کہیں لے جائی گئی تھی۔''

''یہ چاچا طفیل کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ وہی بندہ ہے جس نے جمیلہ کا خیر خواہ بن کر اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ شہر جا کر ڈی ایس پی سے ملے۔ اندر خانے چاچا طفیل بھی چوہدری انپت رائے کا ''کارندہ'' ہے شکل مومناں اور کرتوت کافراں والی مثال اس پر فٹ بیٹھتی ہے۔ زبان کا میٹھا، صورت کا بھلا مانس اور کام ایسے کہ جو سنے کانپ اُٹھے۔ جب جمیلہ رات کے اندھیرے میں گورداسپور روانہ ہو رہی تھی وہ راستے میں اس سے ملا اور کہنے لگا کہ اب اسے شہر جانے کی ضرورت نہیں اس نے چوہدری صاحب کے خاص کمدار گوبند سے بات کر لی ہے۔ گوبند کہتا ہے کہ وہ چوہدری صاحب کو جمیل کے سلسلے میں رام کر لے گا۔ مصیبت کی ماری لڑکی چاچے طفیل کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ وہاں گوبند نشے میں مدہوش موجود تھا (یہ گوبند وہی کمدار تھا جس کا ہونٹ جمیل کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ بعد ازاں کملا سنہا نے نالہ پل پر جو تصویریں اُتاری تھیں ان میں بھی یہ ہٹا کٹا شخص موجود تھا۔ ایک تصویر میں اس کے ہونٹ پر پٹی صاف نظر آ رہی تھی) شرابی گوبند نے جمیلہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس جیسے شخص کو ایک ڈری سہمی اور مجبور لڑکی کے ساتھ کرنا چاہیے تھا اس نے ترازو کے ایک پلڑے میں بہن کی عزت رکھ دی اور دوسرے میں بھائی کی جان کا چھٹکارہ۔ اس نے جمیلہ کو اس انداز میں جمیل کے عبرتناک انجام سے ڈرایا کہ وہ تنگ پنجرے میں پھنسی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ گوبند نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا اور اسی پر بس نہیں ہوئی چوہدری کے شرابی کارندے رات بھر اسے روندتے رہے۔ صبح دم بد نصیب لڑکی کی حالت نازک ہو گئی۔ اس دوران یہ خبر چوہدری انپت رائے کو بھی ہو چکی تھی کہ اس کے کارندوں نے کیا گل کھلایا ہے اس کے فارم میں جانوروں کے دو ڈاکٹر ہر وقت موجود رہتے ہیں اس نے ایک ڈاکٹر کو طفیل کے ڈیرے پر بھیجا تاکہ وہ لڑکی کا معائنہ کرے جانوروں کے ڈاکٹر نے اس بد نصیب لڑکی کا معائنہ کرنے کے بعد چوہدری کو بتایا کہ لڑکی کی زندگی خطرے میں ہے ضروری ہے کہ اسے فوراً شہر پہنچایا جائے۔ چوہدری انپت رائے اسے شہر کیسے پہنچا سکتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ لڑکی کا علاج یہیں کیا جائے اور یہ ''علاج'' دوا دارو کی صورت میں نہیں ''موت'' کی صورت میں تھا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسرے طریقے سے اسے مار دیا گیا اور پھر جیپ میں ڈال کر یہاں سے روانہ کر دیا گیا۔''

جیون سنگھ نے جو روداد سنائی وہ بے حد لرزہ خیز تھی اس سے نہ صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تصدیق ہوئی تھی بلکہ کملا سنہا کا بیان بھی سچ ثابت ہوتا تھا۔ جس روز دوپہر کو جمیلہ کی لاش نوابی گاؤں سے جیپ میں ڈال کر لے جائی گئی اسی روز شام کے بعد اسے گورداسپور کے نزدیک ''نالہ پل'' پر سڑک پر ڈالا گیا اور اس پر سے ٹرک گزارا گیا نوابی گاؤں سے لاش

جیپ پر لے جائی گئی تھی لیکن گورداسپور پہنچ کر اسے ریڑھے پر لاد دیا گیا تھا (جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اس کی وجہ یہ تھی کہ نالہ پل کے نزدیک پہنچ کر گوبند وغیرہ کی جیپ ایک کھالے میں پھنس گئی تھی۔)

میں نے جیون سنگھ سے پوچھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ اب جمیلہ کی لاش کہاں ہے؟''

جیون سنگھ نے انکار میں سر ہلا دیا میں نے وہ اخبار اس کے سامنے رکھ دی جس میں چند روز پہلے ''نالہ پل'' سے لاوارث لڑکی کی لاش ملنے کی خبر چھپی تھی۔

جیون سنگھ نے حیرانی سے یہ ساری خبر پڑھی۔ آخر میں گہری سانس بھر کر بولا۔ ''گاؤں والے جانتے تھے کہ جمیلہ کی لاش کے ساتھ کوئی ڈرامہ شرامہ کیا گیا ہوگا۔ اگر ڈرامے کا پروگرام نہ ہوتا تو پھر یہ لاش جیپ پر ڈال کر لے جانے کی ضرورت نہیں تھی اسے چاچے طفیل کے گھر یا کھیتوں میں ہی کہیں دفن کیا جا سکتا تھا بہر حال ہمیں اتنا اندازہ نہیں تھا کہ لاش اتنی دور لے جائی جائے گی۔''

میں نے جیون سنگھ کو کملا کی کھینچی ہوئی تصویریں دکھائیں وہ ان تصویروں میں گوبند اور اس کے ایک ساتھی کو صاف پہچان گیا۔ میں نے کہا۔ ''جیون سنگھ! اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سارا کام منصوبے کے مطابق کیا گیا۔ پہلے گاؤں میں یہ بات مشہور کرائی کہ جمیلہ اپنے بھائی کو بچانے کے لیے گورداسپور جانا چاہتی ہے پھر جب وہ گورداسپور جا رہی تھی اسے راستے میں چاچا طفیل ورغلا کر اپنے گھر لے گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ چاچے طفیل کی یہ حرکت لوگوں سے چھپی نہ رہ سکی ورنہ اب جمیلہ کی لاش مل بھی جاتی تو یہی سمجھا جاتا کہ وہ زیور اور نقدی وغیرہ لے کر ڈی ایس پی سے ملنے گورداسپور گئی تھی راستے میں حادثے کا شکار ہو گئی یا پھر وہ ویسے ہی گمراہ لڑکی تھی۔''

جیون سنگھ بولا۔ ''یہاں اخبار وغیرہ تو آتا نہیں۔ گورداسپور تک بھی کبھی کبھار ہی کسی کا جانا ہوتا ہے میرا تو خیال ہے کہ اگر تم کوشش نہ کرتے تو ممکن تھا جمیلہ کی لاش کا کبھی کھوج ہی نہ ملتا۔ ان دیہات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو انپت رائے چاہتا ہے اور وہی اطلاع گردش کرتی ہے جو انپت رائے پہنچانا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن جمیلہ کا بھائی بھی تو ہے وہ اب کہاں ہے؟''

حوالدار جیون سنگھ زخمی زخمی سے انداز میں مسکرانے لگا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ جمیلہ کا بھائی اپنی بہن کی لاش کا کھوج لگا سکتا ہے...... نہیں نواز خان...... انپت رائے جیسے لوگ جس کو شکنجے میں جکڑتے ہیں اس کو ہلنے جلنے کے قابل نہیں چھوڑتے۔ جمیل پر منوہر سنگھ نے بڑا

سخت کیس بنا رکھا ہے اس پر الزام ہے کہ اس نے اے ایس آئی سے سرکاری ریوالور چھین کر گولی چلائی جس سے چوکی میں کام کرنے والا بہشتی نور مسیح شدید زخمی ہو گیا اس کے علاوہ بھی اس پر کئی دفعات لگائی گئی ہیں، وہ زندہ رہا تو بھی چھ سات سال جیل سے باہر نکل نہیں سکے گا۔''

دفعتاً مجھے اور جیون سنگھ کو چونکنا پڑا یوں لگا جیسے باہر صحن میں کوئی دھم سے کودا ہو جیون سنگھ نے گود میں رکھی ہوئی بیساکھیاں اُٹھا کر بغل میں دبائیں اور اُٹھ کر کھڑکی کھولنے لگا ابھی بمشکل اس کا ہاتھ کنڈی تک پہنچا تھا کہ کسی نے باہر سے دروازے کو زوردار دھکا دیا پہلے دھکے سے ہی دروازے کی ہلکی پھلکی کنڈی ٹوٹ گئی اور کئی افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور لاٹھیاں وغیرہ تھیں۔ زخمی ہونٹ والے گوبند سنگھ کو میں صاف پہچان گیا اس نے اندر گھستے ہی بے دریغ ایک زوردار تھپڑ جیون سنگھ کو مارا۔ بیساکھیاں جیون سنگھ کی بغلوں سے نکل گئیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا انگیٹھی کے پاس جا گرا، ایک دوسرے شخص نے ٹانگ گھما کر جیون کو ٹھوکر مارنا چاہی تو میں نے اس شخص کو دھکا دیا وہ دروازے سے ٹکرایا اس دوران گوبند سنگھ نے حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ سرکاری ریوالور میرے ہولسٹر سے نکال لیا ایک دم پانچ چھ بندے مجھ پر پل پڑے۔ مختصر سے وقت میں انہوں نے مجھے اس بری طرح جکڑا کہ میں فوری طور پر اپنا بچاؤ نہ کر سکا میرا پاؤں نیچے گرے ہوئے جیون سنگھ سے الجھا اور میں پشت کے بل گر گیا۔ ایک لمبے تڑنگے شخص نے خودکار رائفل بڑے خطرناک انداز میں میرے سینے پر رکھ دی اور درندگی بھرے لہجے میں غرایا۔

''خبردار! میں فائر مار دوں گا۔''

اس شخص کا سر جسم کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا اور آنکھوں میں ناچتی ہوئی وحشت گواہی دے رہی تھی کہ وہ سوچ کر کام نہیں کرتا کام کرنے کے بعد سوچتا ہے۔ ان لوگوں نے میرے لباس کی اچھی طرح تلاشی لی اور پھر کھینچتے دھکیلتے ہوئے صحن میں لے آئے۔

جیون سنگھ کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا تھا کم از کم دو رائفلیں مسلسل ہماری طرف اُٹھی ہوئی تھیں اور رائفل برداروں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانا بھی جانتے ہیں خاص طور پر چھوٹے سر والا ریچھ تو پیشہ ور قاتل نظر آتا تھا۔ تین چار افراد صحن میں بھی موجود تھے اس وقت تک رات کے نو بج چکے تھے پورا گاؤں یخ بستہ سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا صحن کے ادھ کھلے دروازے سے مجھے ایک جیپ کی جھلک نظر آئی یہ جیپ عین دروازے کے سامنے رک گئی۔ چوہدری انپت رائے کے کارندے ہمیں دھکیلتے اور گالیاں دیتے ہوئے

جیپ تک لے آئے اس دوران دو تین دفعہ مجھے موقع ملا کہ میں اپنے پیچھے آنے والے رائفل بردار کو دھکا دے کر چھوٹے سر والے ڈشکرے پر پھینک سکوں اس کے بعد ان لوگوں کے نرغے سے نکلنے کی ایک بھرپور کوشش کی جا سکتی تھی لیکن میں جان بوجھ کر اس ہنگامہ خیزی سے دامن بچا گیا۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ ہمیں چوہدری انپت رائے کے پاس لے جانا چاہتے ہیں اور چوہدری انپت کے پاس جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

مجھے اور جیون سنگھ کو جیپ میں بٹھایا گیا دو افراد ہمارے دائیں بائیں بیٹھ گئے گوبند ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر تھا جیپ گاؤں کی سنسان گلیوں سے دندناتی ہوئی گزری اور پھر ایک گنجان باغ سے گزر کر انپت رائے کی کوٹھی نما حویلی کے سامنے جا رکی۔ حویلی کے مین گیٹ سے باہر ایک طرف بہت سے شیڈ بنے ہوئے تھے۔ یہاں ایک قطار میں پندرہ بیس گھوڑے کھڑے تھے ایک جانب دو کاریں اور ایک وین بھی نظر آ رہی تھی۔ ہماری جیپ نے مین گیٹ کے پاس سے موڑ کاٹا اور پارکنگ میں رک گئی ہمیں نیچے اُتارا گیا جیپ سے اُترتے ہوئے میں نے سوچا شاید یہی وہ جیپ تھی جس میں چند روز پہلے لٹی پٹی جمیلہ کا مردہ جسم ڈال کر گورداسپور پہنچایا گیا تھا۔ مجھے اس جیپ کے اندر سے ایک بے گناہ کے خون کی بُو آنے لگی یوں لگا جیسے نشستوں کے درمیان جیپ کے تاریک فرش پر ابھی تک جمیلہ کی نچی کھچی لاش پڑی ہے اور اس کی بے نور آنکھیں میری طرف دیکھ رہی ہیں، اپنے لہو کا حساب مانگ رہی ہیں۔

حویلی کے مین گیٹ پر بھی ایک مسلح شخص موجود تھا اس نے مسکراتی نظروں سے ہماری طرف دیکھا جیسے ہمارے بارے میں اور ہمارے انجام کے بارے میں اسے پہلے سے سب کچھ معلوم ہو۔ میں اور جیون سنگھ ابھی تک رائفل کی زد میں تھے۔ ایک کھلے احاطے کے عین درمیان اینٹوں کا راستہ بنا ہوا تھا راستے کی دونوں جانب پھولوں کی کیاریاں تھیں احاطے سے گزر کر ہم ایک وسیع و عریض برآمدے میں پہنچے اور پھر ایک آراستہ نشست گاہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں بہت بڑا قالین بچھا تھا دیواروں پر مختلف قسم کا اسلحہ سجا ہوا تھا نشست گاہ کا فرنیچر بھاری بھرکم اور قیمتی تھا ایک صوفے پر سرخ و سپید رنگ کا ایک لمبا تڑنگا شخص بڑی شان سے بیٹھا تھا وہ کڑھائی دار شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا قمیص میں سونے کے بٹن تھے گریبان تھوڑا سا کھلا تھا اور اس میں سے سینے کے نہایت گھنے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔

اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا پھر وہ گوبند سے مخاطب ہوا اور گرج کر بولا۔ ''یہ کیا حماقت ہے۔ رائفل کیوں تان رکھی ہے انسپکٹر صاحب پر میں نے کہا تھا کہ انسپکٹر صاحب کو لے کر آؤ مگر اس طرح لانے کو کس نے کہا تھا۔''

گوبند کا رنگ فق ہو گیا رائفل برداروں نے اپنی رائفلیں فوراً نیچے جھکا لیں۔ گوبند کے ہونٹ لرزے لیکن وہ کچھ بول نہیں سکا۔ ''جاؤ یہاں سے'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا گوبند سمیت سب افراد جلدی سے باہر نکل گئے گوبند نے باہر نکلتے نکلتے میرا ریوالور میز پر رکھ دیا تھا۔ جیون سنگھ کے گھر ہونے والی دھینگا مشتی میں میری قمیص کا گریبان پھٹ گیا تھا اور چہرے پر بھی خراشیں آئی تھیں۔ جیون سنگھ کی حالت بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔

چوہدری انپت رائے نے کہا۔ ''مجھے بہت افسوس ہے انسپکٹر صاحب! یقین کریں جو کچھ ہوا میرے ملازم کی بے وقوفی سے ہوا میں ان سے باز پُرس کروں گا میرا ارادہ ہرگز نہیں تھا کہ آپ سے کسی طرح کی زیادتی ہو ہم تو دشمن کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے آپ تو پھر دوست ہیں۔''

اس نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے کندھوں سے تھاما اور اپنے برابر بٹھایا۔ پھر جیون سنگھ سے بھی بیٹھنے کی درخواست کی جیون سنگھ پہلے تو جھجکتا رہا پھر بیٹھ گیا جیون سنگھ کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ چوہدری کے نرم ملائم لہجے اور رکھ رکھاؤ کو اداکاری سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا اس خوبصورت لہجے کے پیچھے بڑی پُراسرار قسم کی بد صورتی چھپی ہوئی تھی۔ چوہدری انپت رائے کے حکم پر فوراً ایک ملازم چائے اور چائے کے لوازمات لینے کے لیے دوڑا تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے سامنے رکھی ہوئی وسیع و عریض میز پھل مٹھائی اور بسکٹ وغیرہ سے بھر چکی تھی۔ پانچ دس منٹ بعد چائے بھی آ گئی۔ اس حویلی نما کوٹھی میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کھانے پینے کی اشیاء میں کچھ ملا دیا گیا ہو اور یہ چائے ہماری زندگی کی آخری چائے ثابت ہو۔ چوہدری انپت رائے نے جب دیکھا کہ میں چائے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے جھجک رہا ہوں تو اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی پیالی میری طرف بڑھا دی اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''کچھ اور نہیں تو پھل ہی کھا لیجئے انسپکٹر صاحب۔''

میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا ہم چائے پی چکے تو انپت رائے نے اپنے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ جیون سنگھ کو دوسرے کمرے میں لے جائے یا اگر وہ جانا چاہے تو اسے گھر چھوڑ آئے جیون سنگھ نے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا چوہدری کا ملازم اسے لے کر روانہ ہو گیا۔

ہم دونوں نشست گاہ میں تنہا رہ گئے تو چوہدری نے اُٹھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور میرے سامنے آن بیٹھا کہنے لگا۔ انسپکٹر صاحب! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں

گا جھوٹ ہمیشہ کمزور لوگ بولتے ہیں اور میں جو کچھ بھی ہوں کمزور نہیں ہوں وہ لڑکی میرے کارندوں کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے لیکن جرم وہ ہوتا ہے جو عدالت میں ثابت ہو سکے اور یہ جرم عدالت میں ثابت نہیں ہو سکے گا۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں نے بارہا قانون کو توڑا ہے خودسر مردوں کے ہوش ٹھکانے لگائے ہیں، مغرور عورتوں کو منت سماجت پر مجبور کیا ہے، زمینوں پر ناجائز قبضے کیے ہیں، اکھڑ کاشتکاروں کی فصلیں جلائی ہیں، اپنے مخالفین کو اغوا کیا ہے اور قتل بھی کیا ہے۔ میں شراب پیتا ہوں جوا کھیلتا ہوں، طوائف بازی کرتا ہوں اور ہر وہ کام کرتا ہوں جو میرا دل چاہتا ہے اور جسے میں ناجائز نہیں سمجھتا لیکن کبھی کبھی اتفاقاً یا غلطی سے کوئی ایسا کام بھی ہو جاتا ہے جسے میں ناجائز سمجھتا ہوں اور جس کے ہونے کے بعد میرے دل پر بوجھ سا پڑ جاتا ہے اور جمیل کی بہن کا قتل بھی ایک ایسا ہی کام ہے۔ میرے کارندوں کو اس حد تک نہیں جانا چاہیے تھا لیکن وہ چلے گئے لیکن اس میں سارا قصور ان کا بھی نہیں سچی بات یہ ہے کہ وہ آوارہ گرد لڑکی تھی اگر آپ کو کسی نے یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو چھڑانے کے لیے شہر جا رہی تھی تو یہ سراسر غلط ہے وہ اپنے بھائی کے گھر میں جھاڑو پھیر کر فرار ہوئی تھی۔ میرے کارندوں نے اسے پکڑ لیا اس نے انہیں اپنے جسم کی رشوت پیش کر کے نکلنا چاہا لیکن الٹے لینے کے دینے پڑ گئے چند اور شرابی بھی وہاں اکٹھے ہو گئے اور ان سب نے مل کر اسے کھلونے کی طرح توڑ پھوڑ دیا۔''

''اب آپ کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے چوہدری ہی کی طرح نرم و ملائم لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہو گا ہونا تو وہی ہے جو آپ چاہیں گے ویسے انسپکٹر صاحب، میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایک بات آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں چوہدری ہوں میری زمین آٹھ دس دیہات تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ سارا علاقہ اکھڑ اور غنڈہ گرد لوگوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں تین بڑی برادریاں آباد ہیں اور تینوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں ان لوگوں پر اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لیے وہ سب کچھ کرنا ضروری ہے جو میں کرتا ہوں۔ اگر آپ دو منٹ کے لیے خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں کتنا مجبور ہوں دس دیہات کی چودھراہت تو دور کی بات ہے معمولی سا نمبردار بھی ہر ہفتے دو چار بندوں کو چھتر نہ لگوائے ایک دو غنڈوں سے لکیریں نہ نکلوائے ایک آدھ مجرا نہ کروائے تو اسے کوئی نمبردار نہیں سمجھتا آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات؟''

میں نے کہا۔ ''بالکل سمجھ رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی سمجھانا چاہتا ہوں۔''

"میں آپ کے بتائے بغیر ہی سمجھ رہا ہوں۔" چوہدری انپت رائے نے میری بات کاٹی۔ "آپ یہی کہیں گے ناں کہ آپ بہت قانون پسند انسپکٹر ہیں رشوت کا نام سننا گوارا نہیں کرتے، بڑے بڑے آکڑ خانوں کی آکڑ آپ نے نکالی ہے، انصاف کا بول بالا کرنے کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں، نہ کسی سے زیادتی کرتے ہیں نہ کسی سے زیادتی ہونے دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ...... یہ سب باتیں میں جانتا ہوں جس دن میرے کارندوں نے جمیلہ کی لاش "نالہ پل" پر ڈالی تھی اسی روز میں نے معلوم کرالیا تھا کہ "نالہ پل" کس تھانے کی حدود میں آتا ہے اور وہاں کا ایس ایچ او کون ہے میرے خیال میں مجھے یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ پچھلے دس پندرہ روز سے آپ مسلسل میرے بندوں کی نظر میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جیون سنگھ سے ملنے اور معاملے کی ٹوہ لینے نوابی گاؤں آئے تو مجھے فوراً پتہ چل گیا۔ ہے تو یہ بڑی نامناسب بات لیکن میں نے آپ سے عرض کیا ہے ناں کہ چودھراہٹ برقرار رکھنے کے لیے بہت سے نامناسب کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے اور اسی لیے میں اتنا ڈر بھی رہا ہوں پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ ہم دونوں میں زبردست پھڈا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "پھڈا تو اسی وقت ہو جاتا ہے جب قانون سے جرم کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔"

وہ بولا۔ "لیکن اس ٹکراؤ سے بچا بھی جا سکتا ہے۔"

"مثلاً کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے بہت گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس کے دو بلکہ تین طریقے ہیں...... اب آپ پوچھیں گے کون کون سے تو سنیں پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ آپ وہ کام کرلیں جو آپ نے پہلے کبھی نہیں کیا لیکن جو اکثر لوگ کرتے ہیں اور جس کے کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو دھوتا ہے آپ جمیلہ کیس کی فائل بند کر دیں میں آپ کی اتنی خدمت کر دوں گا جتنی کر سکتا ہوں ...... میرے خیال میں بیس ہزار روپے سے کوئی آدمی اپنا جیون سنوار سکتا ہے اگر بیس ہزار کم ہو تو اس میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ میری آخری پیش کش تیس ہزار تک ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس تھانے سے اپنی تبدیلی کروالو۔ بھول جاؤ جو کچھ یہاں ہوا ہے اور جو آئندہ ہوگا اور تیسرا طریقہ یہ ہے جو ابھی ابھی میرے ذہن میں آیا ہے، یہ ہے کہ آپ کنی کترا جائیں یعنی اگر آپ کو پہلی پیش کش بھی قبول نہیں اور آپ اس تھانے سے تبدیلی بھی نہیں کروانا چاہتے تو پھر لمبی چھٹی پر چلے جائیں اس سلسلے میں مَیں بھی آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور چار چھ

ماہ کی چھٹی بمعہ تنخواہ آپ کو مل جانا معمولی بات ہے۔ مجھے وشواس ہے کہ اس دوران جو انسپکٹر آپ کی جگہ کام کرے گا وہ جمیلہ کیس نبٹانے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے تو انپت رائے نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ "نہیں انسپکٹر صاحب! انکار مت کیجیے گا بس یہی تین راستے ہیں ہمارے پاس، اس کے علاوہ جو راستہ بھی ہے وہ نقصان اور مصیبت کا ہے۔

میں صاف اور سیدھا بندہ ہوں میں نے آپ کو صاف صاف بتا دیا ہے مجھ میں خامیاں ہیں برائیاں ہیں لیکن یہ خامیاں اور برائیاں میری مجبوری ہیں میں اس کے بغیر چوہدری نہیں ہوں کوئی مجھے چوہدری مانے گا ہی نہیں...... وہ جرمنی کا بادشاہ، کیا نام لیتے ہیں اُس کا...... ہٹلر ...... ہٹلر نے صحیح کہا ہے کہ انسان طاقت کی زبان آسانی سے اور جلدی سمجھتا ہے جو کام پیار محبت کے ساتھ مہینوں اور سالوں میں نہیں ہو پاتا وہ بازو کے زور سے دس منٹ میں انجام پا جاتا ہے...... وہ دیکھیں...... سامنے لڑکا کھڑا پودوں کو پانی دے رہا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے بالکل پٹولے کی طرح۔"

میں نے چوہدری انپت رائے کی نگاہ کا تعاقب کیا اور لڑکے کو دیکھا۔ وہ سرخ و سپید اور نیلی آنکھوں والا ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔

انپت رائے بولا۔ "آپ جانتے ہیں یہ کون ہے؟" پھر خود ہی کہنے لگا۔ "یہ میری سب سے چھوٹی پتنی "کاجل" کا بھائی ہے وہ گورداسپور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں استانی تھی اس کا بھائی اتنا خوبصورت ہے، سوچو وہ کتنی خوبصورت ہوگی۔ میں نے اُسے ایک شادی میں دیکھا وہ مجھے پسند آگئی اب اگر میں کوئی آہیں بھرنے والا عاشق ہوتا تو ساری زندگی اس کے لیے ترستا تڑپتا رہتا وہ کسی اور کی ڈولی میں بیٹھتی اور اس کے بچے پیدا کرتی لیکن میں نے اپنی ہمت اور طاقت سے تقدیر کا رُخ اپنے حق میں موڑ لیا۔ اب اُس کا چھنے خاں بھائی اپنی مرضی اور خوشی سے اس گھر میں پودوں کو پانی دیتا ہے اور اس کی بہن میری پتنی کہلاتی ہے مزے کی بات یہ ہے کہ......

"میں نے آپ کی بہت باتیں سن لیں ہیں۔" میں نے انپت رائے کی بات کاٹی۔ "اب ایک بات میری بھی سن لیں۔" میرے لہجے نے انپت رائے کو چونکا دیا اور وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کے تیس ہزار روپے کی ضرورت ہے، نہ میں اپنی تبدیلی کروا رہا ہوں اور نہ چھٹی پر جا رہا ہوں میں آپ کے خلاف ایف آئی آر درج کر رہا ہوں اور آج ہی تفتیش کا آغاز کر رہا ہوں...... خدا حافظ۔"

میں نے سامنے پڑی تپائی پر سے اپنا سرکاری ریوالور اُٹھا کر قمیص کے نیچے رکھا اور لمبے قدم اُٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے آواز دے کر مجھے روکا اور قریب آ کر بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''جناب انسپکٹر صاحب سارے مجرم ایک جیسے نہیں ہوتے ان میں سے کوئی کوئی جرمنی کا بادشاہ بھی ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور آپ بھی ایک بات ذہن میں رکھیں آپ کے سارے مخالف کاجل کے بھائی کی طرح نہیں ہوں گے۔ اُن میں سے کوئی کوئی آپ کو ناکوں چنے بھی چبوا دے گا۔''

انپت رائے کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ دیوار پر آویزاں کلہاڑی کھینچ کر مجھ پر پل پڑے گا لیکن پھر ایک دم ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور پُرسکون نظر آنے لگا۔

☆======☆======☆

میں اگلے روز دوپہر کے بعد گورداسپور واپس پہنچا بہت تھکا ہوا تھا لہٰذا تھانے کی بجائے میں سیدھا اپنے کوارٹر میں گیا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کا موڈ تھا ان دنوں میرے پاس گلزار نام کا ایک نوجوان ملازم تھا۔ گلزار نے بتایا کہ کل شام ایک فیشن ایبل لڑکی مجھ سے ملنے آئی تھی وہ کچھ دیر گھر میں رہی پھر یہ کہہ کر چلی گئی کہ آج شام کو دوبارہ آئے گی۔ مجھے اپنے کوارٹر کا ماحول کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو یہ تبدیلی کچھ اور نمایاں ہو گئی۔ ہر شے سلیقے سے اپنے مناسب ترین مقام پر رکھی تھی دیوار پر ایک خوبصورت کیلنڈر نظر آ رہا تھا۔ بستر کی چادر بدل دی گئی تھی میرے کپڑے سلیقے سے تہہ کر کے الماری میں رکھ دیئے گئے تھے۔ میز پر سے ایش ٹرے غائب تھی وہاں پیپر ویٹ کے نیچے ایک پرچی رکھی تھی جس پر لکھا تھا سگریٹ صحت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ کملا سنہا۔

یہ پرچی پڑھنے سے پہلے ہی میں جان گیا تھا کہ اس کمرے کی جون بدلنے والی کملا ہے یہ عجیب و غریب لڑکی ایک غلط راستے پر چل نکلی تھی۔ پرچی کی پشت پر بھی کچھ لکھا تھا۔ میں نے الٹ کر پڑھا یہ بھی کملا کی تحریر تھی۔ ''میں کل شام چھ بجے کے بعد آؤں گی اگر آپ کا موڈ اچھا ہوا تو آپ کو ایک جگہ پر لے کر چلوں گی۔ وہاں جا کر آپ کا موڈ کچھ اور اچھا ہو جائے گا۔ آپ کے موڈ کے لیے ہر وقت فکر مند کملا سنہا۔''

میں نے دونوں پرچیاں پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں اور کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا تھکا ہوا تھا نیند آ گئی دوبارہ آنکھ کھلی تو کمرے میں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی بلب

روشن کر کے گھڑی دیکھی سات بج رہے تھے مجھے اندازہ ہوا کہ میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک کی وجہ سے کھلی تھی...... اتنے میں ایک بار پھر دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا سامنے کملا کھڑی تھی۔ وہ بھیگی ہوئی تھی اور پیشانی کے بالوں سے ابھی تک پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ کملا سخت گھبرائی ہوئی تھی میرے دروازہ کھولتے ہی اندر گھس آئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''حوالاتی کو آپ نے خود مارا تھا؟''

''کس حوالاتی کو؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ٹرک ڈرائیور سلام علی کے سالے سعید کو۔''

''نن...... کیا ہوا ہے اُسے؟''

''حیرت کی بات ہے وہ بولی وہ ہسپتال میں نیم مُردہ حالت میں پڑا ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں۔ میں سیدھی ہسپتال سے آ رہی ہوں وہاں ایس پی صاحب خود موجود ہیں اور اخباری رپورٹر بھی ہیں اگر وہ بندہ مر گیا تو آپ کے لیے تو مصیبت ہو جائے گی۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا میں سعید کو اپنے ایس آئی ممتاز گوندل کے حوالے کر کے آیا تھا ممتاز گوندل سے مجھے ایسی بے وقوفی کی توقع ہرگز نہیں تھی ویسے بھی ہم سعید سے سب کچھ معلوم کر چکے تھے اب اسے مارنے پیٹنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے اسی وقت کپڑے بدلے اور کملا سنہا کی کار میں بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا ہسپتال سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اُتر کر میں نے باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ مطلع ابر آلود تھا اور بوندا باندی جاری تھی۔ جونہی میں ہسپتال کے برآمدے میں پہنچا میری نگاہ انگریز ایس پی مسٹر نیومن ورتھ پر پڑی وہ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے ان کے اردگرد پولیس کا عملہ اور تقریباً دس بارہ اخباری رپورٹر موجود تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ کسی نے اطلاع دے کر اخباری رپورٹروں کو خاص طور پر یہاں بھیجا ہے۔ پھر میری نگاہ سب انسپکٹر ممتاز گوندل پر پڑی اور میں ششدر رہ گیا وہ وردی میں تھا لیکن نہ سر پر ٹوپی تھی اور نہ کمر میں بیلٹ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہتھکڑی جو آج تک ممتاز گوندل مجرموں کے ہاتھ میں پہناتا رہا تھا آج اس کی اپنی کلائی میں سجی ہوئی تھی اور اس ہتھکڑی کو انہی لوگوں نے تھام رکھا تھا جو آج تک اس کے شانہ بشانہ کام کرتے رہے تھے۔

نہ جانے کیوں یہ منظر دیکھتے ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ حوالاتی سعید جانبر نہ ہو سکا۔

اگلے چند سیکنڈ میں میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ موقع پر موجود اہلکاروں نے مجھے بتایا کہ حوالاتی دم توڑ گیا ہے اور اس کی موت کے بعد ہی ایس پی صاحب نے ممتاز گوندل کو ہتھکڑی لگوائی ہے۔ ایس پی صاحب نے سرِ عام تو مجھ سے کوئی بات نہیں کی لیکن صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں مجھ پر بھی سخت غصہ ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ میرے خلاف بھی کارروائی کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اتنے میں سب انسپکٹر ممتاز گوندل ہتھکڑی سمیت میرے پاس آ گیا اس کی آنکھوں میں شکوے ہی شکوے تھے۔

کہنے لگا۔ ''نواز صاحب! میں بالکل بے قصور ہوں اصل بات کا پتہ تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد چلے گا لیکن مجھے لگتا ہے کہ حوالاتی نے خودکشی کی ہے شاید اس نے لاک اَپ کی سلاخوں کو ٹکریں ماری ہیں یا پھر کوئی اور بات ہو گی بہر حال میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں میں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔''

اتنے میں انگریز ایس پی بھی دندناتا ہوا ہمارے نزدیک پہنچ گیا گرج کر بولا۔

''تم کیا بولنا مانگتا۔ وہ تو خود قصوروار ہے چلو تم دونوں گاڑی میں بیٹھو ہم تم سے ہیڈ کوارٹر میں جا کر بات کرتا ہے۔''

ایس پی کے آرڈر پر گوندل کے ساتھ ساتھ مجھے بھی جیپ میں بٹھا دیا گیا ہاں یہ رعایت کی گئی کہ مجھے ہتھکڑی وغیرہ نہیں لگائی گئی۔ بڑی عجیب صورتِ حال ہو گئی تھی ایک دم ہم محرم سے مجرم بن گئے تھے وہ اہلکار جو کل تک ماتحت یا دوست تھے ایس پی کے ڈر سے اجنبی بنے بیٹھے تھے۔ ممتاز گوندل نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''میں لنچ کے ٹائم صرف آدھ گھنٹے کے لیے تھانے سے باہر گیا تھا۔ واپس آنے پر ہیڈ کانسٹیبل ہری سنگھ نے بتایا کہ حوالاتی لاک اَپ میں لہولہان پڑا ہے۔ لاک اَپ کی چابی میرے پاس ہی تھی میں نے جلدی سے تالا کھولا اور اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اس کے سر پر دو زخم تھے ایک زخم پیشانی پر اور دوسرا کنپٹی پر، کنپٹی والا زخم گہرا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کی موت اسی زخم سے ہوئی ہے۔''

اگر چابی سب انسپکٹر کی جیب میں تھی تو پھر دھیان فوراً خودکشی کی طرف جاتا تھا اور اگر یہ خودکشی نہیں تھی تو پھر سب انسپکٹر نے حوالاتی سے مار پیٹ کی تھی لیکن مجھے ممتاز گوندل پر پورا بھروسہ تھا وہ ایسی حماقت کیوں کرتا۔ رہ رہ کر چوہدری انپت رائے کا شعلہ رنگ چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا کیا وہ میرے خلاف کارروائی کا آغاز کر چکا تھا؟

اگر واقعی ایسا تھا تو اس نے بڑا کارگر وار کیا تھا۔ حوالاتی سعید ''جمیلہ قتل کیس'' کا سب سے مضبوط گواہ تھا چوہدری انپت رائے کے کارندوں نے اسے جمیلہ کی لاش کچلنے کے لیے

استعمال کیا تھا وہ سلطانی گواہ بن کر ان سب کے لیے پھانسی کا پھندا تیار کر سکتا تھا مگر اسے ہلاک کر دیا گیا تھا اور یہ اقدام کرنے والوں نے اس کارروائی سے دہرا فائدہ اُٹھایا تھا۔ حوالاتی کے قتل کا الزام ہم دونوں پر آ رہا تھا...... میں نے اس انداز سے سوچا تو سناٹے میں رہ گیا۔ اگر یہ قتل واقعی چوہدری انپت کے ایماء پر ہوا تھا تو پھر ہمارے لیے بڑی شرمناک بات تھی۔ کوئی شخص تھانے میں گھس کر اپنا کام کر گیا تھا اور ہم بے خبر رہے تھے۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ اس قتل میں تھانے ہی کے کسی اہلکار کا ہاتھ ہے۔

میں نے سب انسپکٹر ممتاز گوندل سے پوچھا کہ جس وقت حوالاتی زخمی ہوا تھانے میں کتنے افراد موجود تھے۔

وہ بولا۔ ''ایک تو ہیڈ کانسٹیبل ہری سنگھ ہی تھا جس نے مجھے واقعے کی اطلاع دی۔ دو سپاہی گیٹ پر تھے رجسٹرار زین العابدین اور کانسٹیبل لطیف اوپر گیلری میں کھانا کھا رہے تھے۔'' ہماری گفتگو کے دوران جیپ ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئی تھی پندرہ بیس منٹ بعد ہم نہ صرف ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے بلکہ ایس پی نیومن صاحب کے سامنے پیش بھی ہو گئے۔

وہ سخت طیش میں تھے۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہنے لگے۔ ''یہ صاف طور قتل کیس ہے کل اخباروں میں دھوم مچ جائے گا۔ ہمارے بس کا بات ہوتا تو ہم تم سے رعایت کر دیتا لیکن یہ بات تو بہت اوپر تک پہنچ گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تم دونوں کو قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''ایس پی صاحب! اگر اجازت ہو تو میں اس سلسلے میں کچھ عرض کروں۔'' ایس پی نے ناگواری سے سر ہلا کر مجھے اجازت دی۔ میں نے کہا۔ ''جناب! حوالاتی کی موت کو پولیس تشدد کا معمولی واقعہ نہ سمجھا جائے مجھے یقین ہے کہ اس کے پیچھے گہری سازش ہے اور ہم دونوں کو اس کیس میں پھنسانے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔''

ایس پی نے کہا۔ ''اپنے اس سٹیٹ منٹ کے حق میں کون سا دلیل ہے تمہارے پاس۔''

میں نے کہا۔ ''بڑی مضبوط دلیل ہے جناب میں نے کل نوابی گاؤں جا کر چوہدری انپت رائے سے بات چیت کی ہے۔ چوہدریوں کے دستور کے مطابق اس نے مجھے شیشے میں اُتارنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور ناکام ہو کر دھمکیاں دی ہیں مجھے یقین ہے کہ حوالاتی سعید کی موت کا تعلق انہی دھمکیوں سے ہے۔''

ایس پی کے پوچھنے پر میں نے پوری تفصیل سے کل کے واقعات دہرا دیئے جیون سنگھ حوالدار کی گفتگو سے لے کر چوہدری انپت رائے سے تلخ کلامی تک، سب کچھ ایس پی کے گوش گزار کر دیا۔ میں نے ایس پی کے سامنے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا تھا جناب کہ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ چوہدری انپت رائے کو شامل تفتیش کرنے سے پہلے میں آپ افسران سے ''پرمشن'' لینا چاہتا تھا لیکن سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ انپت رائے کے کارندے اچانک حوالدار کے گھر میں کود پڑے اور ہمیں انپت رائے کی حویلی میں جانا پڑا۔''

میرا پورا بیان سننے کے بعد ایس پی کچھ نرم پڑ گیا اور اجنبیت کی جو دیوار سی ہمارے درمیان حائل ہو گئی تھی مسمار ہونے لگی۔ یہ بات تو ایس پی بھی سمجھ رہا تھا کہ جب ہم سعید کے خلاف چالان مکمل کر چکے تھے تو پھر ہمیں کیا ضرورت تھی اسے مارنے کی اور وہ بھی اس طرح کہ اسے جان لیوا زخم لگ جائے۔ میں جب ایس پی کے پاس سے اُٹھ کر واپس آیا، وہ کافی حد تک ''ملائم'' ہو چکے تھے، بہر حال انہوں نے سب انسپکٹر ممتاز گوندل کو بدستور حراست میں رکھا شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگلے روز اخباروں نے شور مچانا تھا اور اگر اخبار والوں کو پتہ چلتا کہ ملزم حوالات کی بجائے گھر بیٹھا ہے تو وہ آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔

اگلے روز اخباروں نے واقعی بہت شور مچایا سب انسپکٹر ممتاز گوندل کو درندہ صفت اہلکار قرار دیا اور وہ سب کچھ لکھا جو ایسے موقعوں پر لکھا جاتا ہے۔ بہر حال ان ساری باتوں کی توقع مجھے پہلے سے تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ چند ایسی باتیں بھی ہوئیں جن کی توقع مجھے ہرگز نہ تھی۔ اگلے روز میں ہیڈ کوارٹر پہنچا تو ایس پی صاحب جو کل کافی حد تک مہربان نظر آنے لگے تھے، آج ایک دم شعلہ جوالا بنے بیٹھے تھے ان کے تیور دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان پر اوپر سے دباؤ پڑ گیا ہے یا کوئی اور بات ہو گئی ہے۔ وہ بالکل اجنبی نظر آ رہے تھے۔ پہلے تو انہوں نے میرے ساتھ ملنے سے ہی انکار کر دیا، پھر ملاقات ہوئی تو وہ پھٹ پڑے۔

کہنے لگے۔ ''پبلک اتنا اُلو کا پٹھا نہیں ہے جتنا تم لوگوں نے سمجھا ہے اور نہ ہی ہم ایسا فول ہے کہ تمہاری الف لیلہ پر یقین کر لے گا۔ یہ صاف صاف مرڈر کا کیس ہے۔ ٹرک ڈرائیور سلام علی نے حلفیہ سٹیٹ منٹ دیا ہے کہ اس کے برادر اِن لاء کو پولیس تشدد سے ہلاک کیا گیا ہے وہ کہتا ہے کہ سب انسپکٹر ممتاز گوندل حوالاتی کو چھوڑنے کے واسطے ان سے ایک ہزار روپیہ رشوت مانگتا تھا اور صاف کہتا تھا کہ اسے روپیہ نہ ملا تو وہ لڑکے کی ہڈیاں توڑ ڈالے گا......''

''یہ سب جھوٹ ہے جناب'' میں ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے

کہ ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے۔''

''اس کا فیصلہ اب عدالت میں ہو گا۔'' ایس پی نے کہا ''تم اپنے آپ کو انڈر انوسٹی گیشن (زیرِ تفتیش سمجھو) ہو سکتا ہے آج شام تک تم کو لائن حاضر کر دیا جائے۔''

میں لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا...... ایس پی کی جلی کٹی سننے کے بعد میں ان کے دفتر سے باہر نکلا تو چادر میں لپٹی ایک عورت تیزی سے میرے قریب آئی میں نے اسے پہچان لیا وہ سب انسپکٹر ممتاز گوندل کی والدہ تھی۔ ممتاز گوندل اس کا سگا بیٹا نہیں تھا لیکن کسی ماں نے اپنی سگی اولاد سے بھی اتنا پیار نہیں کیا ہو گا جتنا وہ اس سے کرتی تھی۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور اس نے ممتاز گوندل کو لے پالک بنا رکھا تھا وہ فریادی لہجے میں بولی۔ ''نواز پتر! خدا کے لیے کچھ کرو وہ میرے ممتاز کو جان سے مار دیں گے مجھے پتہ چلا ہے کہ انہوں نے اسے الٹا لٹکا رکھا ہے اور سخت تکلیف دے رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں ماں جی۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ ممتاز کوئی چور اچکا نہیں پولیس کا عزت دار ملازم ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں ہو گی۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''پُتر! یہ ہو رہا ہے مجھے بتانے والا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔''

میں نے ممتاز کی والدہ کو وہیں ایک سب انسپکٹر کے کمرے میں بٹھایا اور خود صورت حال جاننے کے لیے تفتیشی شعبے کی طرف بڑھا۔ یہ شعبہ ہیڈ کوارٹر کے شمالی حصے میں تھا اور وہاں جانے کے لیے قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ یہاں نیم اور پھلاہی کے درختوں میں گھرے ہوئے پانچ چھ کمرے تھے۔ ان کمروں میں خاص خاص ملزمان سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی میں ان کمروں کے سامنے پہنچا تو کسی ملزم کی دردناک آواز نے خاموشی کا سینہ چیرا اور دور تک گونج گئی اس آواز نے مجھے سرتا پا لرزا دیا۔ یہ ممتاز گوندل کی آواز تھی۔ نوجوان خوبرو ممتاز گوندل، جو عام پولیس والوں سے کافی مختلف تھا۔ وہ کسی ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیختا تھا۔

مجھے دیکھ کر ایک لمبا تڑنگا انسپکٹر ایک کمرے سے باہر نکل آیا میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے انسپکٹر۔ ممتاز گوندل کو کیوں ٹارچر کیا جا رہا ہے؟''

وہ بولا۔ ''اس کے لیے اوپر سے آرڈر آئے ہیں ہمیں ہر صورت دوپہر تک ملزم سے اقبالی بیان لینا ہے۔''

''کیسا بیان؟''

"یہی کہ اس نے متوفی سعید کے وارثوں سے رشوت طلب کی تھی اور رشوت نہ ملنے پر اس نے سعید کو تشدد کا نشانہ بنایا۔"

میں ششدر رہ گیا یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی تھی۔ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ پولیس اہلکار سے کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو محکمہ اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہاں ایک ایسا جرم ممتاز کے سر پر تھوپا جا رہا تھا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک مسلمان اہلکار کو جان بوجھ کر خوار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی دوران اندرونی کمروں سے ایک بار پھر ممتاز گوندل کی لرزہ خیز چیخ ابھری اس پر تھرڈ ڈگری استعمال کی جا رہی تھی اور یہ کام کرنے والے اسپیشل برانچ کے لوگ تھے۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے اسپیشل برانچ کے انسپکٹر کو وارننگ دی کہ وہ ممتاز پر تشدد کا سلسلہ بند کر دیں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ انسپکٹر نے میری بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور سنی اَن سنی کرتا ہوا اندر چلا گیا۔

مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ دوبارہ ممتاز کی والدہ کا سامنا کرتا ویسے بھی میں ڈی آئی جی صاحب کو فون کرنا چاہتا تھا۔ میں ان سے جو بات کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ یہ ٹیلیفون ہیڈ کوارٹر کے باہر سے کیا جائے لہٰذا میں ممتاز گوندل کی والدہ سے ملے بغیر ہیڈ کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک دن کے گیارہ بج چکے تھے بازار وغیرہ کھل چکے تھے۔

میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے ڈی آئی جی صاحب کے گھر رنگ کیا ان کے ملازم تلک رام نے فون اُٹھایا۔ کسی ساتھ والے کمرے سے مجھے ڈی آئی جی صاحب کے بولنے کی مدھم آواز آئی۔ میں نے تلک رام سے کہا کہ میں انسپکٹر نواز خاں بول رہا ہوں اور بڑے صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

تلک رام نے کہا۔ "میں دیکھ کر بتاتا ہوں کہ وہ گھر پر ہیں یا نکل گئے ہیں۔" چند لمحے فون پر خاموشی رہی پھر تلک رام کی دبی دبی آواز آئی۔ "ہیلو انسپکٹر صاحب...... بڑے صاحب تو چند منٹ پہلے گاڑی پر چلے گئے ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا یہ پہلا موقع تھا کہ ڈی آئی جی صاحب نے مجھ سے یوں سرد مہری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یقیناً وہ پہلے سے جانتے تھے کہ میں انہیں فون کروں گا انہوں نے میرے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ منگل کا دن تھا اور منگل کو ان کی ہفتہ وار چھٹی ہوتی تھی۔ اس کا مطلب تھا آئندہ چوبیس گھنٹوں میں ان سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے تھکے تھکے انداز میں ریسیور نیچے رکھ دیا۔ دفعتاً مجھے یوں لگا کہ میں ایک کمزور شخص ہوں۔ اپنی وردی، اپنے عہدے اور اپنی تمام تر قانون پسندی کے باوجود میری کوئی حیثیت ہے اور نہ

کوئی اہمیت۔ بڑی بڑی کرسیوں اور شہہ نشینوں پر بیٹھے با اثر لوگ جب چاہیں مجھ جیسے اہلکاروں کو چٹکیوں میں اُڑا سکتے ہیں۔ میرے دل میں مایوسی سی بھرنے لگی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں قانون کا خیر خواہ بننے کے شوق میں کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتا ہوں اور ایسے با اثر لوگوں کو للکار بیٹھتا ہوں جو میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ممتاز گوندل کی کربناک چیخیں میرے تصور میں گونجیں پھر ڈی آئی جی کی بے رخی کا خیال آیا اور دل غم سے لبریز ہو گیا۔

میں میڈیکل اسٹور سے نکلا اور چند سیڑھیاں اُتر کر سڑک پر پہنچ گیا ابھی سوچ ہی رہا تھا، کیا کروں کہ اچانک کسی گاڑی کے بریک چرچرائے اور وہ میرے سامنے آن رکی میں پہچان گیا یہ چوہدری انپت رائے کی جیپ تھی۔ اسی جیپ میں مجھے جیون سنگھ کے گھر سے انپت رائے کی حویلی میں پہنچایا گیا اور غالباً یہی جیپ تھی جس میں دو ہفتے پہلے بدنصیب جمیلہ کی لاش "نالا پل" لے جائی گئی تھی۔ میں نے دیکھا جیپ میں ڈرائیور کے علاوہ گوبند سنگھ بھی موجود تھا۔ گوبند سنگھ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

"انسپکٹر جی! آپ کو چوہدری صاحب اپنے فارم پر یاد کر رہے ہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد کہا۔ "اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟"

وہ بولا۔ "کوئی زبردستی نہیں ہے جی...... ہمیں تو صرف پیغام پہنچانے کا حکم ملا ہے۔"

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا اور آگے بڑھ کر چوہدری انپت رائے کی بھیجی ہوئی جیپ میں سوار ہو گیا۔ جیپ کے پہیے چرچرائے اور برق رفتاری سے روانہ ہو گئی۔

☆======☆======☆

چوہدری انپت رائے کا وسیع و عریض فارم "نوابی گاؤں" کے راستے میں آتا تھا۔ نوابی گاؤں سے اس کا فاصلہ قریباً چھ میل اور گورداسپور چونگی سے پینتیس پکے میل کے قریب تھا۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ ہم قریباً ڈھائی گھنٹے میں وہاں پہنچ پائے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ فارم قریباً پچاس ایکڑ پر مشتمل تھا اور اسے "رائے فارم" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہم سہ پہر دو بجے کے لگ بھگ فارم کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ درختوں کی ایک بہت طویل قطار فارم کی حد بندی کو ظاہر کرتی تھی فارم کے اندر کشادہ راستے تھے اور ان راستوں کے دونوں طرف بڑے بڑے شیڈ اور اصطبل وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ ہم نے مچھلیوں کے بڑے بڑے تالاب دیکھے جن میں بطخیں تیر رہی تھیں ایک بہت بڑی چار دیواری کتوں کے لیے مخصوص تھی یہاں بہت اعلیٰ نسل کے کتے غولوں کے غول گھوم رہے تھے۔ فارم

کے ایک ایک گوشے سے چوہدری انپت رائے کی شان وشوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد ہماری جیپ ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے رکی یہ عمارت باہر سے تو ایسی خاص نظر نہیں آتی تھی لیکن اندر داخل ہو کر اندازہ ہوا کہ یہ ایک نہایت سجا سجایا اور آرام دہ ریسٹ ہاؤس ہے۔ عیش وعشرت اور دل بستگی کا ہر سامان یہاں موجود تھا۔ میں نے دیکھا چوہدری انپت رائے بید کی ایک بہت بڑی کرسی پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے صرف دھوتی پہن رکھی تھی بالائی جسم عریاں تھا۔ اور بالوں سے بھرا ہوا یہ جسم بالکل کالے ریچھ کا جسم دکھائی دیتا تھا دو خوبرو لڑکیاں جو عمر میں انپت رائے کی بیٹیوں سے بھی چھوٹی ہوں گی اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اس کے بدصورت کندھوں کی مالش کر رہی تھیں۔

مجھے اور گوبند کو دیکھ کر بھی انپت رائے اسی بے تکلفی کے ساتھ آرام کرسی پر بیٹھا رہا اس کی بڑی بڑی شرابی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی تھیں۔ مسکرا کر کہنے لگا۔

''میں نے جو پیش کش آپ کو کی تھی وہ اب بھی برقرار ہے اور باقی دونوں راستے بھی آپ کے سامنے کھلے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جو جواب میں نے تم کو دیا تھا وہ بھی برقرار ہے۔''

میں نے اسے ''تم'' کہہ کر مخاطب کیا تھا وہ جیسے اندر سے کھول کر رہ گیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنے اوپر نرمی اور ملائمت کا خول چڑھا لیا اور زوردار قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

''لگتا ہے آپ کا دماغ ابھی تک گرم ہے۔ گرمی دور کرنے کے لیے بیئر بڑی اچھی چیز ہے اور اگر ساتھ میں خوبصورت عورت بھی ہو تو ایک آدھ گھنٹے میں دماغ بالکل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بات شروع کرنے سے پہلے دماغ کی حرارت دور کر لیں۔''

پھر اس نے بڑے تحکمانہ انداز میں کسی ''ناجو'' نامی لڑکی کو آواز دی چند لمحے کے بعد ایک دراز قد لڑکی میرے سامنے تھی۔ وہ سرتاپا دعوتِ گناہ تھی اور بڑی بے باکی سے مسکرا رہی تھی۔

میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ انپت رائے مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''کوئی غلط مطلب مت لیجئے انسپکٹر صاحب، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ دور سے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں اتنے میں مَیں بھی فارغ ہو جاتا ہوں، پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو ابھی اور اسی وقت کہہ سکتے ہو۔'' میرے ''تم'' کہنے پر ایک بار پھر اس کی پیشانی پر بل پڑے لیکن فوراً ہی یہ بل کھل بھی گئے اس نے مالش کرنے والی لڑکیوں کو پیچھے ہٹا دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا ایک ملازم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک بڑے سائز کا تولیہ انپت رائے کے کندھوں پر رکھ دیا۔ وہ مجھے ساتھ

لے کر ایک دوسرے کمرے میں آ گیا یہ کمرہ بھی قیمتی فرنیچر سے سجا ہوا تھا فرش پر قالین تھا۔ دیواروں پر خوبصورت عورتوں کی تصویریں تھیں یہ تصویریں عریاں تو نہیں تھیں لیکن ان میں عورت کی جسمانی کشش کو نمایاں کیا گیا تھا۔ مجھے ایک بڑی الماری میں شراب کی جگمگاتی بوتلیں بھی نظر آئیں۔

انپت رائے بولا۔ ''لیجئے جناب انسپکٹر صاحب، اب تسلی سے بیٹھئے اور کھل کھلا کر فرمایئے کیا پینا پسند کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔''

وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ''انسپکٹر صاحب! گناہ کرنے کے لیے بس تھوڑے سے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگ یہ حوصلہ کر لیتے ہیں وہ دنیا میں جنت کے مزے پا لیتے ہیں، دوسرے آنے والے کل کے انتظار میں ہی رہتے کل جو کبھی نہیں آئے گا جو صرف ایک خیال ہے۔ انسان مٹی میں مل کر مٹی اور آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ جو مر گیا اس کے لیے قیامت آ گئی...... بس کہانی ختم۔'' اس کے ساتھ ہی چوہدری انپت نے ایک بار پھر ناجو نامی لڑکی کو آواز دی وہ ایک ٹرے میں شراب کی ولائتی بوتل اور گلاس وغیرہ سجائے اندر داخل ہوئی اس کے عقب میں ایک اور لڑکی تھی اس کے ہاتھ میں بھی ٹرے تھی ٹرے میں دو بڑی رکابیوں کے اندر بکرے کی بھنی ہوئی چانپیں تھیں مصالحے دار گوشت کی لذیذ خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ چانپیں لانے والی لڑکی خود بھی کسی آفت سے کم نہیں تھی اس خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ زمانہ قدیم کے شداد کی طرح اس منہ زور چوہدری نے بھی اس علاقے میں ایک چھوٹی سی جنت بنا رکھی ہے جس میں عیش وعشرت کے سامان بکھرے ہیں اور حوریں چوکڑیاں بھرتی پھرتی ہیں۔

چانپیں لانے والی نوخیز لڑکی نے بڑی ادا سے جھک کر ٹرے میز پر رکھی اور بڑی بے باکی سے میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی فنکار قسم کی لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ اپنے خطرناک جسم کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔ میں نے گھور کر پہلے لڑکی کو اور پھر چوہدری انپت رائے کو دیکھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا بات ہے؟'' چوہدری نے جیسے حیران ہو کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ شاید تم واقعی مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہو اگر پتہ ہوتا کہ کنجریاں پیش کرنے کے علاوہ تمہیں اور کچھ نہیں کرنا تو تمہارے فارم کی طرف تھوکتا بھی نہیں۔''

ایک دم چوہدری انپت رائے کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ وہ گرج کر بولا۔ ''تم حد سے بڑھ رہے ہو نواز خان! میں اپنے سامنے اونچی آواز میں بولنے والے کی زبان کھینچ لیا کرتا ہوں۔ اگر پتہ نہیں ہے تو جاؤ اپنے کسی افسر سے پوچھو انپت رائے کس کا نام ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری زندگی بھر کی بداعمالیاں تمہارے چہرے پر لکھی نظر آ رہی ہیں۔''

وہ غیظ و غضب سے کانپنے لگا۔ کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر پکار کر بولا۔ ''گوبند سنگھ...... گوبند سنگھ۔'' گوبند سنگھ رائفل تھامے تیزی سے اندر آیا چوہدری انپت نے کہا۔ ''اس انسپکٹر کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''میں اندھا نہیں ہوں۔ مجھے باہر کا راستہ آتا ہے اور یاد رکھنا دوبارہ اندر آنے کا راستہ بھی معلوم ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد پھر ملاقات ہو گی۔''

میں نے عشرت کدے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

اگلے پندرہ بیس روز میں نے بڑی بھاگ دوڑ میں گزارے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ سب انسپکٹر ممتاز گوندل بے گناہ ہے اور سعید نامی لڑکے کو ایک سازش کے تحت حوالات میں قتل کیا گیا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کون سا ایسا دلیر شخص تھا جو چوری چھپے تھانے میں داخل ہوا۔ پھر لاک اَپ تک پہنچا اور حوالاتی کو جان سے مار کر چلتا بنا۔ نہ اسے کسی نے دیکھا اور نہ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑ کر گیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ حوالاتی کے قتل میں تھانے ہی کا کوئی اہلکار ملوث ہے۔ جب تک اس اہلکار کا سراغ نہ لگتا ممتاز گوندل کی جان بچنی مشکل تھی اسے لائن حاضر کیا جا چکا تھا اور وہ اسپیشل برانچ پولیس کی حراست میں مسلسل تشدد کا نشانہ بن رہا تھا۔ میں نے اسے چھڑانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی بس نہیں چلا صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ چوہدری انپت رائے کی پہنچ بہت اوپر تک ہے اور وہ اپنا تمام اثر و رسوخ مجھے نیچا دکھانے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ایس پی نیومن ورتھ کو میں بہت بہادر آفیسر سمجھتا تھا اور وہ تھا بھی بہادر لیکن اس معاملے میں آ کر ان کی بہادری بھی گھٹنے ٹیک گئی تھی۔ انہوں نے مجھے تو کسی نہ کسی طرح لائن حاضر ہونے سے بچا لیا تھا لیکن ممتاز گوندل کے لیے وہ بھی کچھ نہیں کر سکے تھے جبکہ میرے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ تھا کہ ممتاز گوندل کی ضمانت ہو جائے اور وحشیانہ تشدد اور ذہنی اذیت سے اس بے گناہ کی جان چھوٹے۔ کبھی کبھی میرے دل میں آتا کہ قانون اور فرض کو ایک طرف رکھ کر دندناتا ہوا اس پولیس اسٹیشن میں گھس جاؤں

جہاں ممتاز گوندل کو رکھا گیا ہے۔ حوالات کا تالا توڑ کر روتے سسکتے ممتاز کو گود میں اُٹھاؤں اور باہر لے آؤں لیکن یہ سب خیال کی باتیں تھیں جب انسان بے بس ہونا شروع ہوتا ہے تو وہ تصورات میں اپنے مسائل حل کرنے لگتا ہے۔

ابھی یہ ممتاز گوندل والا مسئلہ ہی حل نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مصیبت میرے گلے پڑ گئی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ جمیلہ نامی اس لڑکی کا پوسٹ مارٹم میں نے ہی کروایا تھا جو چوہدری کے کارندوں کی ہوس کا شکار ہوئی اور بعد میں ٹرک تلے کچلی گئی۔ اس لڑکی کے پاس سے چار تولے زیور اور چھ سو روپیہ نقد برآمد ہوا تھا۔ قانون قاعدے کے مطابق مقتولہ کا یہ سامان مال خانے میں جمع کرا دیا گیا تھا لیکن جب ضرورت پڑنے پر ان اشیا کی تلاش ہوئی تو وہ مال خانے میں موجود نہیں تھیں۔ تھانے کے مال خانے سے سامان غائب ہو جائے تو ذمے دار ایس ایچ او ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا میرے لیے مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ مال خانے کا انچارج ایک بے حد ایمان دار اور پرانا اہلکار تھا اس سے کسی ایسی حرکت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ کئی مرتبہ ہزاروں روپے مالیت کی اشیاء مال خانے میں پڑی رہتی تھیں لیکن اس سے کسی طرح کی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ یہ نئی خبر بھی اخبار کی زینت بن گئی مجھے ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا میں نے اپنی صفائی پیش کی صفائی قابلِ قبول تھی لیکن چند افسروں کا رویہ بدستور مخالفانہ رہا۔ میں غصے میں میٹنگ سے اُٹھ کر چلا آیا اور افسروں سے کہہ دیا کہ وہ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔ میں پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ اب جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا نوکری جاتی ہے تو جائے لیکن چوہدری انپت رائے سے ٹکر ضرور لوں گا۔ مجھے یقین سا تھا کہ زیور اور نقدی غائب ہونے والے معاملے میں بھی کسی نہ کسی طرح چوہدری انپت رائے کا ہاتھ ہے اس خبیث کی جڑیں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھیں اور وہ اپنے اثر و رسوخ سے ہر مقام تک رسائی حاصل کر لیتا تھا۔

جس رات ہیڈ کوارٹر میں میری طلبی ہوئی اس سے اگلے روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں گورداسپور سے تانگے پر ایک قریبی گاؤں ''نواں پور'' جا رہا تھا۔ راستہ نیم پختہ تھا دونوں طرف کھیت تھے اور کیکر کے اونچے درخت تھے اچانک دور سے کسی گاڑی کی اُڑاتی ہوئی دھول نظر آئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوہدری انپت رائے کی شاندار جیپ دکھائی دی جیپ میں انپت رائے خود بھی موجود تھا۔ عقبی نشستوں پر اس کے دو باڈی گارڈ بیٹھے تھے ان میں منحوس صورت والا گوبند دور ہی سے پہچانا جاتا تھا اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ جب تک میں نے چوہدری انپت کو دیکھا اور پہچانا وہ بھی مجھے دیکھ اور پہچان چکا تھا۔ تانگے کو اوورٹیک کرتے ہی اس نے جیپ رکوا لی۔ کوچوان کو بھی تانگہ روکنا پڑا۔ جیپ کے دروازے کھلے اور چوہدری

سمیت اس کے کارندے باہر نکل آئے۔ چوہدری حسب معمول بڑے امیرانہ لباس میں تھا جدید جرمن ریوالور اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔

چوہدری کو تانگے کی طرف آتے دیکھ کر میں بھی نیچے اُتر آیا چوہدری کچھ دیر ساکت کھڑا میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے آگے بڑھ کر عجیب سے انداز میں میرا کندھا تھپتھپایا اور بازو سے تھام کر اپنی جیپ کی طرف لے آیا۔ اس کے انداز میں نرمی اور ہمدردی تھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کا رویہ کیونکر تبدیل ہوا ہے اس نے مجھے اصرار کر کے جیپ میں بٹھایا اور ساتھ لے کر چل پڑا۔

میں نے پوچھا۔ ''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟''

وہ بولا۔ ''بتاتا ہوں چن جی اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو۔ ہمارے ساتھ تو کوئی اتنی محبت سے پیش آئے تو ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں، جہنم اور مندر کے سوا جہاں چاہے لے چلو۔''

نہ جانے کیوں میری چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ چوہدری کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے...... اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ شبہہ اور تقویت پکڑ گیا۔ چوہدری مجھ سے ایسی باتیں کر رہا تھا جیسے میں کسی حادثے سے بال بال بچا ہوں اور مجھے دوسری زندگی ملی ہے۔ وہ مجھے حوصلے اور ہمت کی تلقین کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ زندگی میں اونچ نیچ آتی ہی رہتی ہیں۔

اسی طرح کی باتوں کے دوران ہمارا سفر کٹتا رہا اور ایک بار پھر رائے فارم پہنچ گئے۔ بہت بڑے گیٹ سے گزر کر ہم فارم میں داخل ہوئے اور کتوں، گھوڑوں اور مچھلیوں کی بڑی بڑی پرورش گاہیں ہماری نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ چوہدری انپت رائے کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ مجھے لینے کے لیے گورداسپور جا رہا تھا۔ میں راستے میں مل گیا اس لیے وہ مجھے لے کر واپس لوٹ آیا۔ جس وقت ہم فارم میں پہنچے شام ہو چکی تھی سردی بھی عروج پر تھی۔ چوہدری نے مجھے ایک آرام دہ کمرے میں ٹھہرایا اور خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ میں بھی خاموشی سے چوہدری کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتا رہا۔ ذہن میں ایک جستجو سی تھی کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس نے چوہدری کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ راز رات کو نو دس بجے کے قریب کھلا۔ باتوں باتوں میں چوہدری کے ایک کارندے نے کہا۔ ''اگر اتفاق سے چوہدری صاحب اخبار نہ دیکھتے تو ہمیں آپ کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ چلتا۔''

میں صرف ''ہوں ہاں'' کر کے خاموش ہو گیا اور کہتا بھی کیا؟ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا

کہ اخبار میں میرے حوالے سے کیا چھپا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری کا کارندہ چائے کے برتن لے کر واپس چلا گیا تو میں نے ایک تپائی کے نیچے تختے پر رکھے ہوئے اخباروں پر نگاہ دوڑائی۔ یہ دو تین روز کے اخبار تھے میں صوفے پر بیٹھ کر ان کی ورق گردانی کرنے لگا چند منٹ بعد مجھے بری طرح چونکنا پڑا بات تھی ہی چونکنے کی۔ دو روز پہلے کے ایک اخبار میں اندرونی صفحے پر میری خودکشی کی خبر چھپی تھی۔ سرخی کے نیچے لکھا تھا انسپکٹر نواز نے خودکشی کی کوشش کی۔ وہ پچھلے کئی روز سے سخت پریشان تھے آج رات نو بجے کے قریب وہ سادہ لباس میں ریلوے لائین کی طرف چلے گئے اور انبالہ سے گورداسپور آنے والی پسنجر ٹرین کے آگے لیٹ گئے۔ اتفاق سے ایک سگنل مین دیپک سنگھ کی نگاہ ان پر پڑ گئی۔ اس نے بروقت پہنچ کر انسپکٹر کو لائن سے ہٹا لیا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق انسپکٹر نواز خواب آور گولیاں بھی کھائے ہوئے تھے ان کی جیب سے اُن کی اپنی تحریر میں ایک رقعہ بھی ملا ہے۔''

میں کچھ دیر حیرت سے اس خبر کو دیکھتا رہا پھر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خبر کسی اور انسپکٹر نواز کے بارے میں ہے (بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست نکلا یہ خبر ریلوے پولیس کے ایک انسپکٹر نواز رانا کی تھی۔ اس نے واقعی خودکشی کی ناکام کوشش کی تھی یہ بھی معلوم ہوا کہ اخبار میں یہ خبر پڑھنے کے بعد چوہدری انپت رائے نے مقامی پولیس چوکی سے پتہ کرایا تھا۔ چوکی انچارج منوہر سنگھ بھی ایک نمبر اُلو کا پٹھا تھا وہ بھی اسی خبر کو سچ سمجھے بیٹھا تھا اس نے چوہدری کو بتایا کہ یہ انسپکٹر نواز خان کی ہی خبر ہے۔ اب پوری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی چوہدری انپت رائے نے خیال کیا تھا کہ اس کے اثر ورسوخ کے سامنے میں نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور افسروں کی بے رخی اور حالات کی سنگینی سے اتنا دل برداشتہ ہوا ہوں کہ زندگی سے ہی بے زار ہو گیا ہوں۔ اب وہ میرے آنسو پونچھنے کے لیے اور کوئی نیا جال پھیلانے لیے مجھے اپنے ساتھ فارم میں لے آیا تھا میں نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے یہ فیصلہ کر لیا کہ چوہدری انپت رائے کی اس غلط فہمی سے پورا فائدہ اُٹھاؤں گا۔

☆======☆======☆

دو تین روز اسی طرح چوہدری کے وسیع وعریض فارم پر گزر گئے۔ اس فارم میں ہر قسم کی رنگینی موجود تھی کوئی رنگین مزاج شخص اس طرح چوہدری انپت کا مہمان بنتا تو وہ جی بھر کے عیش کر سکتا تھا۔ شاید دو تین مہینے بھی اسے اس فارم پر رہنا پڑتا تو اسے کوئی اکتاہٹ نہ ہوتی لیکن میں نے تیسرے چوتھے روز ہی اپنی بوریت کا اعلان کر دیا۔ چوہدری قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''بھئی! بوریت تو ہو گی۔ کھانا کھانے اور سو جانے کے سوا تمہیں اور کوئی کام نہیں۔ حالانکہ کرنا

چاہو تو یہاں سینکڑوں کام کرنے والے ہیں۔ یہ لڑکی ہی دیکھ لو جو چائے لے کر آ رہی ہے بتاؤ یہ کوئی ہے انکار کرنے والی چیز ہے اور اس جیسی کئی یہاں مل سکتی ہیں۔" لڑکی قریب پہنچی تو چوہدری انپت کی بھوکی نگاہیں بے قراری سے اس کے جسم کا طواف کرنے لگیں وہ اپنی نظروں کی کمینگی سے بے خبر بولتا چلا گیا۔ "دیکھو میاں! میں تمہیں یہاں لایا تھا تبدیلی آب و ہوا کے لیے کچھ موج میلہ کرتے، کھاتے پیتے، ذرا غم غلط ہوتا لیکن تم تو مولوی بنے بیٹھے ہو۔ بوریت نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "بس...... اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے چوہدری صاحب۔"

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اچھا...... تو چلو تمہیں نوابی لے چلتے ہیں حویلی میں...... وہاں کا ماحول فارم سے کافی مختلف ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "میں گورداسپور جانا چاہتا ہوں جب تک ممتاز گوندل کی ضمانت نہیں ہوتی مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"ضمانت بھی ہو جائے گی انسپکٹر صاحب سب کچھ ہو جائے گا۔ اب تمہاری پریشانی چوہدری انپت رائے کی پریشانی ہے، اس لیے سمجھو کہ کوئی پریشانی نہیں۔ کل ڈی آئی جی صاحب لکشمن پور گاؤں میں نہر کے افتتاح پر آ رہے ہیں وہاں ان سے ملاقات یقینی ہے میں ان سے ساری بات کر لوں گا۔ بھگوان نے کرپا کی تو ایک دو ہفتوں میں سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس بارے میں بالکل بےفکر رہو تم۔"

شام کے وقت چوہدری گاؤں جا رہا تھا وہ چاہتا تھا میں بھی اس کے ساتھ چلا جاؤں لیکن میں نوابی گاؤں جانے سے پہلے ایک کام کرنا چاہتا تھا یہ بہت ضروری کام تھا اگر رہ جاتا تو میرا بھانڈا پھوٹنا یقینی تھا۔ میں نے چوہدری انپت رائے سے دو گھنٹے کی رخصت لی اور چوہدری کی ہی ایک کھٹارہ جیپ پر پختہ سڑک تک پہنچا۔ یہاں محکمہ انہار کے ایک دفتر سے میں گورداسپور ٹیلیفون کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ایس پی نیومن ورتھ صاحب سے بات کی اور انہیں بتایا کہ میں کن حالات میں یہاں چوہدری انپت رائے کے پاس پہنچا ہوں۔ میں نے ایس پی صاحب سے درخواست کی کہ اگر چوہدری ان سے ملاقات کے دوران میری خودکشی کا ذکر کرے یا اس قسم کی کوئی اور بات کرے تو وہ اس کا مناسب جواب دیں۔ ایس پی صاحب میری بات سمجھ گئے اور انہوں نے میرا "پردہ" رکھنے کی یقین دہانی کرا دی۔

اسی شام چوہدری انپت رائے مجھے اپنے ساتھ نوابی گاؤں لے گیا۔ میں اس شاندار حویلی میں پہلے بھی آ چکا تھا لیکن اس وقت میری حیثیت قیدی کی سی تھی مجھے حویلی کے مہمان

خانے میں ٹھہرایا گیا۔ خدمت کے لیے نوکر چاکر بھی موجود تھے حویلی آ کر بھی چوہدری کا رویہ مجھ سے بدستور ہمدردی اور نوازش کا رہا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے...... اب یہ کیا کام تھا؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سمگلنگ، مار دھاڑ، مجرموں کی سرپرستی اور اس طرح کے اور بہت سے کام یہ چوہدری حضرات کرتے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ کسی ایسے ہی کام میں مجھ سے مدد لینا چاہتا ہو یا پھر جمیلہ والے کیس کو دبانے کے لیے ہی وہ یہ سب کچھ کر رہا ہو۔

اگلے روز شام کو چوہدری لکشمن پور چلا گیا جیسا کہ اس نے بتایا تھا وہاں نہر کا افتتاح ہونا تھا اور اس افتتاحی تقریب میں چوہدری کو بھی شرکت کرنا تھی۔ چوہدری اپنی شاندار شیورلیٹ کار پر روانہ ہوا تو اسے الوداع کہنے والوں میں اس کی سب سے چھوٹی بیگم بھی شامل تھی۔ وہ درمیانے قد لیکن اسمارٹ جسم والی ایک خوبرو لڑکی تھی ایک خوش رنگ، ہلکی پھلکی تتلی کی مانند، لیکن یہ ہلکی پھلکی تتلی بھاری بھرکم لباس اور وزنی گہنوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ میں ہی وہ مجھے مظلوم نظر آئی۔ چوہدری نے اسے دیکھا اور اپنے گھر کے لیے (بلکہ کہنا چاہیے اپنی خواب گاہ کے لیے) پسند کر لیا۔ اب وہ چوہدری کی بیوی تھی اور اس کا خوبرو بھائی چوہدری کی حویلی میں پودوں کو پانی دیتا تھا۔

چوہدری کی گاڑی دھول اُڑاتی ہوئی لکشمن پور جانے والے راستے پر روانہ ہو گئی تو چھوٹی چوہدرانی دھیمی رفتار سے چلتی میرے پاس آ گئی "آپ انسپکٹر نواز خاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی۔ "میں نے آپ کا نام پہلے بھی سنا ہوا ہے شاید اخبار میں کسی ڈکیتی کی خبر آئی تھی۔ آپ نے گورداسپور اسٹیشن سے دو مغرور مجرم پکڑے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک موٹا سا شخص بھی تھا۔ کمال شاہ یا جلال شاہ نام تھا اس کا۔ وہ ایک بس کی چھت سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔"

میں سمجھ گیا کہ چوہدرانی آٹھ دس ماہ پہلے کے ایک واقعے کا ذکر کر رہی ہے اس میں بلال شاہ کو کچھ چوٹیں آئی تھیں۔ بہرحال ان چوٹوں کے بدلے سرگودھا کے دو نامی گرامی مجرم ہم نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیے تھے۔ چھوٹی چوہدرانی مجھ سے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اس نے دعوت دے ڈالی کہ کل شام کی چائے ہم حویلی کے باغ میں اکٹھے پئیں گے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا میں تو خود یہ چاہتا تھا کہ مجھے چوہدری کی نجی زندگی میں جھانکنے کا موقع ملے۔

اگلے روز سہ پہر کو حویلی کے چھوٹے سے خوبصورت باغ میں چھوٹی سی خوبصورت

چوہدرانی سے ملاقات ہوئی۔ سبزہ زار پر ایک منقش تپائی کے اوپر چائے کے قیمتی برتن رکھے تھے۔ چھوٹی چوہدرانی آسمانی رنگ کے شلوار قمیص میں اسمارٹ نظر آتی تھی اور اسے دیکھتے ہی خیال آتا تھا کہ چوہدری انپت رائے سے اس کا جوڑ کسی طور بھی مناسب نہیں۔ چوہدری انپت رائے ابھی تک لکشمن پور سے واپس نہیں آیا تھا۔ ہم دونوں میں کھل کر اور دیر تک باتیں ہوئیں۔ چھوٹی چوہدرانی کا پورا نام کاجل پارے تھا اس کے بھائی کا نام راکیش تھا کاجل کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ سات بہن بھائی ہیں۔ کاجل سے چھوٹا راکیش تھا اور اس سے چھوٹی پانچ بہنیں تھیں۔ باپ ریٹائر ہو چکا تھا، گھر میں مفلسی تھی خاندان کا واحد کفیل راکیش تھا جس نے گورداسپور اکے ایک سینما ہاؤس کے نزدیک چھوٹا سا ہوٹل کھول رکھا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے چند غنڈوں سے راکیش کی مار پیٹ ہوگئی اور ہوٹل کا فرنیچر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ یہ غنڈے شہر کے ایک نامی گرامی بدمعاش ''مستانہ'' کے ساتھی تھے۔ مستانہ جیسے شخص سے ٹکرانا راکیش کے بس کا روگ نہیں تھا لیکن اس نے بے وقوفی کی اور اس سے دشمنی مول لے لی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز مستانہ کے آدمیوں نے راکیش کا ہوٹل جلا کر راکھ کر دیا اور الٹا اس پر بلوے کا کیس بنوا دیا۔ یہی وقت تھا جب چوہدری انپت رائے راکیش کی مدد کے لیے سامنے آیا۔ اس نے راکیش کا حمایتی بن کر مستانے کو للکارا اور چند ہی ہفتوں میں اسے دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ راکیش پر بلوے اور دنگا فساد کا جو کیس بنا تھا وہ بھی کافی سخت تھا۔ چوہدری انپت رائے نے نہ صرف اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا بلکہ راکیش کی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک قابل وکیل بھی کھڑا کر دیا۔ دو تین پیشیوں میں یہ کیس خارج ہو گیا لیکن اس جھگڑے اور مقدمے بازی کے دوران راکیش کوڑی کوڑی کو محتاج ہو چکا تھا روزگار ختم ہو گیا تھا اور تین مرلے کا چھوٹا سا مکان بھی گروی پڑا ہوا تھا۔ انہی دنوں چوہدری انپت رائے کے خاص کمدار نے راکیش کو بتایا کہ چوہدری صاحب کی پہلی بیوی بیمار رہتی ہے صرف ایک بچہ ہے اور وہ اس کی نگہداشت بھی ٹھیک طور پر نہیں کر پا رہی۔ چوہدری صاحب دوسری شادی کی خواہش رکھتے ہیں اس کے ساتھ ہی کمدار نے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ چوہدری صاحب کا رشتہ راکیش کے گھرانے سے جڑ سکتا ہے۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔ کنواری آنکھوں سے معصوم خواب دیکھنے والی دوشیزہ نے اپنا آپ اپنے بہن بھائیوں اور اپنے گھرانے کے بہتر مستقبل کے لیے قربان کر دیا۔ وہ سب چوہدری کے احسانوں تلے دبے ہوئے تھے ان کے لیے انکار کرنا بہت مشکل تھا۔ جس روز چوہدری انپت رائے کے ساتھ کاجل کے پھیرے ہوئے اس

سے دو روز قبل ہی چوہدری نے راکیش کا گروی پڑا ہوا مکان چھڑا دیا تھا اور اس کی چھوٹی بہن کے بیاہ کے لیے ایک مناسب رشتہ بھی ڈھونڈ نکالا تھا۔

کاجل نے اپنے شوہر نامدار کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دولت مند اور بارسوخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خداترس اور ہمدرد شخص بھی ہے اور اس نے تمام ضروری تقاضے پورے کرنے کے بعد کاجل سے باقاعدہ شادی کی ہے لیکن اس رُوداد میں کوئی بات ایسی تھی جو ابھی کاجل نے مجھے نہیں بتائی تھی اور وہ اس بات کو چھپا رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اشارہ بھی دے رہی تھی کہ وہ کوئی بات چھپا رہی ہے۔ میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹال گئی ہاں اتنا ضرور کہا کہ اس جاگیردارانہ ماحول میں اسے گھٹن محسوس ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ سوچتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی نامعلوم سمت میں روانہ ہو جائے۔

اسی روز شام کو چوہدری آ گیا۔ اس سے اگلے روز وہ ایک بڑی پارٹی کے ساتھ مرغابی کے شکار کے لیے روانہ ہو گیا میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ ''شکار'' پورے تین دن جاری رہا۔ اس ٹور کے دوران ہی چوہدری انپت رائے نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ سب انسپکٹر ممتاز گوندل ضمانت پر رہا ہو گیا ہے۔ یہ واقعی خوش خبری تھی لیکن ابھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس خوش خبری کی ''قیمت'' کیا ہے۔ میں نے چوہدری انپت رائے سے کہا کہ میں ممتاز گوندل سے ملنے گورداسپور جانا چاہتا ہوں، ویسے بھی میری چھٹی چھ سات روز کی تھی، اب میرے لیے ضروری ہے کہ افسران کو اطلاع دوں۔

چوہدری بڑی نحوست سے میرا شانہ تھپک کر بولا۔ ''چھوڑو نواز صاحب! تم چوہدری انپت رائے کے ساتھ ہو۔ کم از کم گورداسپور میں کوئی ایسا افسر نہیں جو تم سے باز پُرس کر سکے۔ میں نے تمہارے ایس پی صاحب کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے کہا تھا انسپکٹر میرے ساتھ ہے جب تک اس کی طبیعت اچھی طرح بحال نہیں ہوتی میں اسے واپس نہیں بھیجوں گا۔''

تیسرے روز جب ہم شکار سے واپس حویلی پہنچے تو چوہدری انپت رائے کو معدے میں درد کی شکایت ہو گئی وہ اسی روز اپنا چیک اَپ کرانے کے لیے لاہور روانہ ہو گیا۔ میرے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ میں ایک بار پھر کاجل سے مل بیٹھنے اور اسے کریدنے کی کوشش کرتا۔ اس دفعہ میں نے اپنی بھرپور صلاحیتیں استعمال کیں اور کاجل کی تنہائی سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ''فائدہ اُٹھانے'' سے مطلب کہ میں چوہدری انپت کے حوالے سے اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب رہا۔ باغ کے ایک تنہا گوشے میں شام کے پھیلتے سایوں میں بھاپ دیتی چائے

کے سامنے بیٹھ کر کاجل مجھ سے دیر تک باتیں کرتی رہی اس کا چہرہ سرخ تھا اور تمتما رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دو روز سے اسے شدید بخار ہے اس بخار کے باوجود وہ میرے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی اور دلجمعی سے باتیں کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خود بھی مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔ اس کی گفتگو میں کسی شرابی کی سی لڑکھڑاہٹ اور تیزی تھی۔ شاید یہ بخار کا اثر تھا۔ بولتے بولتے اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کہنے لگی۔ ''نواز صاحب! چوہدری انپت کے بارے میں آپ کے جتنے بھی شبہات ہیں وہ درست ہیں۔''

یہ فقرہ بم کے دھماکے جیسا تھا...... بالآخر کاجل کے ہونٹوں پر جمی ہوئی برف ٹوٹ گئی تھی اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ شوہر سے اس کے تعلقات درست نہیں۔ وہ ایک بار کھلی تو پھر کھلتی چلی گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں کا بند توڑ کر سیلاب کی مانند اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''نواز صاحب! میں آپ کو وہ باتیں بتا رہی ہوں جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائیں، میرا سگا بھائی بھی اس بات سے بے خبر ہے۔ میرے پاس اب اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ چوہدری نے مجھ سے شادی کا فیصلہ پہلے کیا تھا اور میرے بھائی راکیش سے مستانہ وغیرہ کی چپقلش بعد میں شروع ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ سب کچھ چوہدری کا ہی کیا دھرا تھا اس نے مجھے حاصل کرنے کے لیے میرے بھائی کے گرد ایک جال بچھایا۔ آخر اس کی ہمدردیاں جیتنے میں اور مجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب میں اس کی پتنی ہوں اور میرا بھائی اس کا بے دام غلام بنا ہوا ہے۔ میں نے اسے ابھی تک کچھ نہیں بتایا اور بتاؤں تو ہو سکتا ہے وہ یقین ہی نہ کرے، وہ اندھا اعتماد کرنے لگا ہے چوہدری انپت پر۔ اسے تو......''
ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ میں نے ذرا کریدا تو وہ بولی۔ ''نواز صاحب! جو باتیں میں آپ کو بتا رہی ہوں بھگوان کے لیے اپنے تک رکھیے گا۔ اگر آپ میری مدد نہیں کر سکتے تو مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں لیکن اگر یہ باتیں باہر نکل گئیں تو میرا اور میری بہنوں کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہے گا...... اور اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ یہاں جو بات بھی ہو رہی ہے وہ ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان رہے گی۔ میری یقین دہانی کے بعد کاجل نے اپنا دکھڑا سناتے ہوئے کہا کہ چوہدری انپت رائے اب اس کی چھوٹی بہن پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ کاجل نے بتایا۔ ''وہ میٹرک کا امتحان دے رہی ہے اور مشکل سے سولہ سال کی ہے یہ بتاتے ہوئے بھی

شرم آتی ہے۔ کہ ادھیڑ عمر چوہدری نے اسے ورغلانہ شروع کر دیا ہے۔ وہ ناسمجھ لڑکی ہے اسے کچھ معلوم نہیں کہ چوہدری کی حویلی میں اس کے لیے کیا جال بچھایا جا رہا ہے الٹا وہ مجھ سے ناراض رہنے لگی ہے اور کہتی ہے کہ جیجا جی اس سے محبت کرتے ہیں تو میں اس سے جلتی ہوں۔ چوہدری آئے دن کسی نہ کسی بہانے اسے حویلی میں بلاتا رہتا ہے۔ اب ڈیڑھ دو ہفتے بعد اس کی سالگرہ ہے۔ چوہدری نے اسے پٹی پڑھائی ہے کہ اس دفعہ وہ اپنی سالگرہ حویلی میں منائے اور اپنی سہیلیوں کو بھی بلائے جو میٹرک کے امتحان کے بعد اس سے جدا ہو رہی ہیں۔ کافی لمبا چوڑا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ اور وہ بدھو راکیش بھی اس تماشے سے بڑا خوش نظر آ رہا ہے اسے کچھ پتا نہیں کہ اس کی بہنوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے......''

چوہدری انپت کے بارے میں مجھے پہلے بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی لیکن اب اس کا گھناؤنا ترین روپ سامنے آ رہا تھا۔ ایک خوبصورت جواں سال لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانے کے بعد بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور اب وہ اپنی سولہ سالہ سالی پر دانت تیز کر رہا تھا اور اسی طرح نہ جانے وہ کس کس جرم میں عروج حاصل کر چکا تھا۔ شام کے گہرے سائے شب کی تیرگی میں بدل گئے تو میں مہمان خانے میں واپس آ گیا۔ چوہدری لاہور گیا تھا اور امید نہیں تھی کہ دو روز سے پہلے واپس آئے گا۔ اگلے دن دس گیارہ بجے کے قریب مجھے پتہ چلا کہ چھوٹی چوہدرانی کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور دو گھنٹے پہلے ڈاکٹر بھی آیا تھا۔ میں نے مزاج پُرسی کے لیے جانا ضروری سمجھا۔ کاجل کا بھائی راکیش مجھے زنان خانے میں لے گیا حویلی میں زنان خانہ اور مردانہ بنایا گیا تھا لیکن پردے وغیرہ کا خاص خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ میں کاجل کے پاس پہنچا تو وہ ایک گرم شال لپیٹے صوفے پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی تپائی پر انگریزی دواؤں کی شیشیاں رکھی تھیں۔ اس کا چہرہ ابھی تک سرخ تھا اور آنکھوں میں آگ سی جل رہی تھی۔ ملازمہ نے بتایا کہ چوہدرانی جی کو ابھی دو تین بار قے آئی ہے اور اس کے بعد سے ان کی طبیعت کچھ بہتر ہے۔

میں کاجل کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی خیر خیریت دریافت کرنے لگا۔ ملازمہ میرے لیے چائے لینے چلی گئی راکیش بھی تھوڑی دیر بعد باہر نکل گیا میری نگاہ بیڈ کے نیچے رکھے ایک بڑے بکس پر پڑی۔ یہ گتے کا بکس تھا۔ میں نے کاجل سے پوچھا۔ ''اس بکس میں کیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''آواز ریکارڈ کرنے والی مشین ہے چوہدری صاحب نے لندن سے منگوائی ہے۔'' ان دنوں ٹیپ ریکارڈر کا کوئی وجود نہ تھا۔ صرف ریڈیو اسٹیشنوں پر بڑی بڑی مشینیں ہوتی تھیں یا پھر ریکارڈ ڈسک ہوتی تھی جسے ریکارڈ پلیئر پر چلایا جاتا تھا۔ اس چھوٹی سی مشین کو

دیکھ کر میں حیران ہوا۔یقیناً یہ کافی مہنگی آئی تھی کاجل نے کہا۔''میں نے کل بتایا تھا ناں کہ میری چھوٹی بہن شیلا کی سالگرہ آنے والی ہے چوہدری صاحب نے یہ مشین اسے تحفے میں دینے کے لیے منگوائی ہے۔ بڑا خیال رہتا ہے انہیں اس کا ویسے ایک پھوٹی کوڑی کسی پر خرچ نہیں کرتے لیکن اپنے مطلب کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہادیتے ہیں۔''

کاجل کی آنکھوں میں چوہدری کے لیے نفرت کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔آج وہ مجھ سے زیادہ کھل کر باتیں کر رہی تھی اور اپنے دل کے سارے زخم مجھے دکھاتی جارہی تھی۔اس نے بھی وہی بات کہی جس کا دعویٰ اس سے پہلے چوہدری بڑے فخر سے کر چکا تھا۔یعنی ہر جرم ''نوابی گاؤں'' کی فضاؤں میں پروان چڑھتا تھا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا جاتا تھا جرم کرنے اور اسے چھپا جانے میں چوہدری انپت رائے اتنا ماہر تھا کہ بڑے بڑے جغادری اس میدان میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔یہ بات اب ظاہر تھی کہ جمیلہ کو ہوس کا نشانہ بنانے اور قتل کرنے والے چوہدری کے خاص کارندے تھے اس جرم کی گواہی وہ لڑکا دے سکتا تھا جس نے جمیلہ کی لاش پر سے ٹرک گزارا تھا لیکن اسے قتل کرا دیا گیا تھا۔اسی طرح چوہدری کا اثرورسوخ ہر جگہ کام دکھاتا تھا۔گواہوں کو خریدنا، دھمکانا، ان سے جھوٹی گواہیاں دلانا چوہدری کے لیے ایک آسان کام تھا۔جھوٹی رپورٹیں، ڈاکٹروں کے جھوٹے سرٹیفکیٹ، جھوٹے حلف نامے...... یہ سارے کام چوہدری انپت رائے کو کروانے آتے تھے، اور وہ کرواتا تھا۔ایسے شخص کے سامنے قانون اور انصاف کا بے بس ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔

اس روز کاجل اور میرے درمیان خاصی طویل بات چیت ہوئی۔کاجل نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ چوہدری کے چنگل سے چھٹکارہ چاہتی ہے اور رات دن بھگوان سے یہ پرارتھنا کرتی ہے کہ کوئی مضبوط ارادے کا شخص آئے اور اسے اور اس کی معصوم بہنوں کو اس زورآور شخص کی چالوں سے بچائے۔میں نے کاجل سے کہا۔

''کاجل بی بی! میں ہر طرح تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں اور اللہ نے چاہا تو کسی مرحلے میں بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا لیکن جو کام تم دنوں میں کر سکتی ہو میں مہینوں میں بھی نہیں کر سکتا۔میرا مطلب چوہدری کے خلاف کسی ٹھوس ثبوت سے ہے تم اس حویلی کا ایک فرد ہو پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چوہدری کی بیوی ہو۔تم کوشش کرو تو اس کے خلاف کوئی ایسی شہادت مہیا ہو سکتی ہے جو اسے قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کرے......''

اس سے پہلے کہ کاجل کوئی جواب دیتی میرا دھیان پھر اس ڈبے کی طرف چلا گیا جو پلنگ کے نیچے چھپا کر رکھا گیا تھا۔اچانک ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور میں چونک

گیا۔میں کرسی سے اُٹھ کر ڈبے تک پہنچا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا یہ پہلا ٹیپ ریکارڈر تھا جو میں نے زندگی میں دیکھا۔موجودہ ٹیپ ریکارڈروں سے یہ بہت بڑا اور کافی مختلف تھا بڑی بڑی چرخیاں لگی ہوئی تھیں اور لوہے کی موٹی گراریاں تھیں۔اس مشین کا سائز ۲۶ئ کے ٹی وی سے کم نہیں تھا۔

میں نے کاجل سے پوچھا۔''یہ چلانا آتا ہے تمہیں؟''

وہ بولی۔''ہاں...... صرف ایک بار چلا کر دیکھا ہے۔اس کے ساتھ گاڑی کی ایک بڑی سی بیٹری بھی ہے۔دو تار اس بیٹری سے جوڑنے پڑتے ہیں۔وہ سامنے الماری میں پڑی ہے بیٹری۔'' وہ صوفے سے اُٹھی اور الماری سے ایک انگلش بیٹری نکال کر لے آئی اس نے ریکارڈنگ مشین کو ڈبے سے نکالے بغیر اس کے تار بیٹری سے جوڑے اور مجھے دکھایا کہ مشین کس طرح کام کرتی ہے۔

میں نے کاجل سے کہا۔''کاجل بی بی! ہم اس مشین سے زبردست فائدہ اُٹھا سکتے ہیں تم نے دیکھا ہی ہے کہ چوہدری بہت کھلی ڈلی باتیں کرتا ہے اور برسرِ عام کہتا ہے کہ اس نے جرم کیے ہیں اگر کسی طرح ہم اس ریکارڈنگ مشین پر اس کا اقبالیہ بیان اس کی اپنی آواز میں ریکارڈ کر لیں تو وہ بری طرح پھنس سکتا ہے۔''

کسی اندرونی روشنی سے کاجل کی سیاہ آنکھیں چمک اُٹھیں۔اسے میرا آئیڈیا پسند آیا تھا اور یہ آئیڈیا کوئی ایسا ناقابلِ عمل بھی نہیں تھا۔چوہدری نے خود یہ مشین منگوائی تھی لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس مشین کو اس کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اور کسی خاص مقصد کے لیے اس کی آواز ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔کاجل نے کہا۔''میرے سامنے تو وہ کبھی اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کرتا بلکہ باتیں کرتا ہی نہیں۔بس ہر وقت تیوری چڑھی رہتی ہے۔ہاں...... اس کا ایک یار ہے۔زمیندار ذیل سنگھ امرتسر کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا ہے اس کے ساتھ چوہدری کی بڑی بے تکلفی ہے۔وہ مہینے میں ایک دو بار ضرور یہاں کا چکر لگاتا ہے دونوں رات کو جی بھر کے شراب پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں کبھی کبھی شکار کے لیے بھی نکل جاتے ہیں میرا اندازہ ہے کہ یہ شخص فارم میں بھی چوہدری کا حصے دار ہے۔ہو سکتا ہے اس ہفتے وہ نوابی گاؤں آئے۔''

میں نے کہا۔''پھر تو یہ تمہارے لیے سنہری موقع ہوگا...... مجھے پچاسی فیصد یقین ہے کہ حوالاتی سعید کو قتل کروانے والا چوہدری انپت رائے ہے۔عین ممکن ہے کہ اس مرتبہ چوہدری کی ملاقات لنگوٹیے یار سے ہو تو وہ دونوں اس معاملے پر بھی بات چیت کریں۔اگر یہ گفتگو

ریکارڈ ہو جائے تو اپنے تمام تر اثر و رسوخ کے باوجود چوہدری کو نانی یاد آ جائے گی۔"

☆======☆======☆

میں نے اور کاجل نے جو پروگرام بنایا تھا وہ ہماری توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ قریباً ہر کام اسی طرح ہوا جس طرح ہم نے سوچا تھا۔ کاجل بڑی رازداری کے ساتھ چوہدری انپت رائے اور اس کے دوست ذیل سنگھ کی گفتگو ریکارڈ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ گفتگو قریباً تین گھنٹے پر مشتمل تھی اور اس میں ٹیپ کی دو بڑی ریلیں استعمال ہوئی تھیں۔ اس گفتگو میں دنیا جہاں کی باتیں شامل تھیں۔ عربی گھوڑوں کی باتیں تازی کتوں کی باتیں، جانوروں اور عورتوں کے شکار کی باتیں۔ سیاست اور مکاری کی باتیں نشے کی حالت میں ذیل سنگھ ایک نوجوان ملازمہ کو فحش لطیفے سناتا رہا تھا یہ لطیفے بھی اس ٹیپ پر ریکارڈ تھے۔ اس تین گھنٹے کی ریکارڈنگ میں ہمارے کام کی ریکارڈنگ قریباً آدھ گھنٹے کی انکشاف انگیز گفتگو پر مشتمل تھی۔ اس گفتگو میں علاقے کے عیار ترین چوہدری نے اپنی آواز میں یہ بیان ریکارڈ کروایا تھا کہ اس نے جمیلہ قتل کیس کے اہم ترین گواہ محمد سعید کو حوالات میں قتل کروایا ہے قاتل کا نام سنت سنگھ تھا۔ سنت سنگھ میرے ہی تھانے میں ہیڈ کانسٹیبل تھا اس نے اس گھناؤنے کام کے عوض صرف چار سو روپے معاوضہ پایا تھا۔ رات کے وقت جب حوالاتی محمد سعید آہنی سلاخوں کے قریب پختہ فرش پر سو رہا تھا ہیڈ کانسٹیبل سنت سنگھ اس تک پہنچا اور سلاخوں کے اندر سے اپنی رائفل گزار کر اس نے آہنی بٹ کی دو شدید ضربیں مقتول کی کنپٹی پر لگائی تھیں اور موقعے سے کھسک گیا تھا۔ چونکہ حوالات کی چابی سب انسپکٹر ممتاز گوندل کے پاس تھی اور واردات کے وقت وہی تھانے کا انچارج بھی تھا، اس حوالاتی کی موت کا الزام اس پر آ گیا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل صاف بچ نکلا تھا۔ بعدازاں تھانے کے مال خانے سے سامان غائب کرنے والا بھی یہی بدبخت سنت سنگھ تھا۔

ریکارڈ ہونے والی گفتگو اتنی صاف اور واضح تھی کہ اسے سننے کے بعد کسی قسم کے شک شبے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی اور یہ ریکارڈ عدالت کے سامنے پیش ہو جاتا تو وہ آنکھیں بند کر کے فیصلہ کر سکتی تھی۔ اپنے منصوبے کی اس شاندار کامیابی پر ہمیں جتنی خوشی ہو رہی تھی، اتنی ہی حیرانی بھی تھی۔ صرف قدرت ہی جانتی ہے کہ کس کام کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر چوہدری انپت نے اپنی بدنیتی کے تحت کاجل کی چھوٹی بہن کو تحفہ دینے کے لیے خریدا تھا لیکن ہوا یہ تھا کہ یہ مشین اس کے خلاف ایک کھلی شہادت کا ذریعہ بن گئی تھی۔ کبھی کبھی زیادہ خوشی بھی انسان کو راس نہیں آتی۔ کاجل کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ چوہدری کے خلاف ثبوت

حاصل کر چکی تھی اور بہت خوش تھی۔ چوہدری فارم پر گیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ حویلی کے زنانے حصے میں لے گئی اور ریکارڈ شدہ کے اہم حصے سنائے میں نے ٹیپ کا وہ حصہ جس میں اہم گفتگو تھی کاٹ کر علیحدہ کر لیا اور چرخی سمیت ایک اخباری کاغذ میں لپیٹ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ پروگرام یہ بنایا تھا کہ دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد میں چوہدری انپت سے اجازت لے کر گورداسپور روانہ ہو جاؤں گا اور یہ ٹیپ اعلیٰ افسروں کو پیش کر دوں گا لیکن دوپہر سے پہلے ہی حویلی میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ دراصل رات کو کاجل سے ایک فاش غلطی ہوئی تھی۔ اس نے حویلی کی نشست گاہ میں مائیک چھپا کر چوہدری اور ذیل سنگھ کی بات چیت ریکارڈ کر لی تھی لیکن مائیک اور سیاہ تار نشست گاہ سے نکالنا بھول گئی تھی۔ جو اس نے بڑی چابکدستی سے صوفے کی گدیوں کے درمیان چھپایا تھا۔ صبح نشست گاہ کی صفائی کے دوران چوہدری کے ہوشیار ترین کمدار گوبند نے یہ چیزیں دیکھ لیں اور فارم پر جا کر چوہدری سے اپنے شبہے کا اظہار کر دیا۔ چوہدری بھاگم بھاگ حویلی پہنچا نہ صرف اس نے مائیک اور تار دیکھ لیں بلکہ ریکارڈ مشین سے غائب شدہ فیتے کا کھوج بھی لگا لیا دوسرے طرف کاجل بھی حالات کے تیور دیکھ چکی تھی وہ سمجھ گئی کہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے اور اب اس کی جان کی خیر نہیں۔ چوہدری کا سامنا کرنے کی بجائے وہ عقبی دروازے سے نکل کر حویلی کے پچھواڑے پہنچی اور وہاں سے سیدھی "مردانے" میں میرے پاس چلی آئی میں اس وقت اپنے کمرے میں تھا اور منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔

کاجل گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "انسپکٹر! غضب ہو گیا۔ چوہدری کو پتہ چل گیا ہے وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ کا بچنا بھی محال ہے چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔"

"ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ہانپتی ہوئی سانسوں اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مختصر بات مجھے بتا دی ساتھ ساتھ وہ مجھے دروازے کی طرف بھی کھینچ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "تم بھاگ کر خود کو کیوں مشکوک بنا رہی ہو کسی نے تمہیں مائیک رکھتے دیکھا تو نہیں۔"

"آپ کو کچھ پتہ نہیں انسپکٹر۔" اس نے سرگوشی کی۔ "بہت عیار ہے چوہدری...... وہ اب تک بات کی تہہ تک پہنچ بھی چکا ہو گا......" اس نے اپنے گریبان کے اندر سے ایک چابی نکالی اور بولی۔ "ٹیپ آپ کے پاس ہے ناں؟" میں نے "ہاں" میں جواب دیا۔ وہ کہنے لگی۔ "یہ لیں...... یہ جیپ کی چابی ہے بس اب آ جائیں ذرا بھی دیر کی تو پکڑے جائیں گے۔" وہ مجھے قریباً کھینچتی ہوئی حویلی کے پھاٹک کی طرف لائی میرے ہاتھوں میں ابھی تک

صابن لگا ہوا تھا میں نے قمیص کے دامن سے ہاتھ پونچھے اور کاجل کے ہاتھ سے چابی لے کر جیپ میں داخل ہو گیا یہ وقت تھا جب مجھے حویلی کے اندر سے چوہدری انپت رائے کے چنگھاڑنے کی آوازیں آئیں وہ کاجل کو پکار رہا تھا۔ میں نے جیپ کے اگنیشن میں چابی گھمائی اور انجن اسٹارٹ کر دیا اگلے ہی لمحے جیپ جھٹکے سے آگے بڑھی اور کمان سے نکلے تیر کی طرح پھاٹک سے گزرتی چلی گئی۔

نوابی گاؤں کی گلیوں سے گزر کر میں اس نیم پختہ راستے پر پہنچا جو رائے فارم کی طرف جاتا تھا اسپیڈومیٹر کی سوئی چالیس کے ہندسے پر لرز رہی تھی کاجل کا سر اچھل اچھل کر چھت سے ٹکرا رہا تھا گاہے گاہے اس کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخ نکل جاتی تھی۔ ابھی ہم گاؤں سے بمشکل دو فرلانگ باہر نکلے تھے کہ مجھے عقب میں چوہدری انپت رائے کی سرخ شیورلیٹ نظر آئی وہ دھول کے مرغولوں میں راستہ بناتی تیزی سے ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ پھر مجھے ایک اور جیپ نظر آئی وہ کھیتوں کے درمیان سے شارٹ کٹ لگانے کی کوشش کر رہی تھی اس کا مطلب تھا چوہدری کے کارندے شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے دوڑ پڑے ہیں۔ چند لمحے بعد جیپ دندناتی ہوئی اس چھوٹی سی باغیچی کے پاس سے گزری جو ایک غریب دیہاتی جمیل کی ملکیت تھی اور جس میں سے بیر توڑنے کے جھگڑے کا نتیجہ جواں سالہ جمیلہ کی حسرت ناک موت کی صورت میں نکلا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس باغیچی کے درخت بھی اداس ہیں اور اپنے مالکوں کی سیاہ بختی پر آنسو بہا رہے ہیں۔

نیم پختہ ہموار راستوں پر جیپ بہترین سواری ہے اور کار یا کوئی دوسری گاڑی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جیپ جو ہمارے نیچے تھی ''فور ویل ڈرائیو'' تھی اور بہت اچھی حالت میں تھی۔ پانچ دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد مجھے اس پر پورا قابو حاصل ہو گیا اور میں نے اسے ہوائی جہاز بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ بڑا فلمی سا منظر تھا۔ کاجل بار بار اچھل کر مجھ سے ٹکراتی تھی اور اس کے ہونٹوں سے دہشت زدہ چیخ نکل جاتی تھی وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔ ''نواز صاحب! کسی بھی طرح کسی پولیس اسٹیشن تک پہنچنے کی کوشش کریں چوہدری ٹیپ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرے گا۔'' کاجل پولیس اسٹیشن کا ذکر کر رہی تھی لیکن اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں اور پختہ سڑک ہمارے دائیں جانب آئے گی یا بائیں جانب۔

ڈھلتے سورج کی دھوپ میں وہ ایک زبردست دوڑ تھی۔ حویلی سے روانہ ہونے والی گاڑیاں بدستور ہمارے پیچھے آ رہی تھیں اور دھول کے بلند ہوتے مرغولوں سے ان کی پوزیشن

کا صحیح پتہ چل رہا تھا۔ وہ گاڑیاں ہمارے پیچھے قریباً تین فرلانگ کے فاصلے پر تھیں جبکہ ایک جیپ بائیں جانب سے ہمارے نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگلے نصف گھنٹے میں میں نے ان گاڑیوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا لیکن گاڑیوں سے آگے نکلنے کے باوجود خطرہ بدستور موجود تھا۔ ہم راستہ کھو چکے تھے اور پختہ سڑک کا دور دور پتہ نہیں تھا جب تک ہم پختہ سڑک پر نہ پہنچتے اور ہمیں اپنے رخ کا پتہ نہ چلتا، ہم خود کو پیچھے آنے والی گاڑیوں کی زد سے باہر نہیں سمجھ سکتے تھے۔

دفعتاً ایک جگہ شریہہ اور کیکر کے گھنے درختوں میں میں ایک گاڑی دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی سرخ کار تھی میں اسے سینکڑوں میں پہچان سکتا تھا یہ کملا سنہا کی گاڑی تھی۔ یہاں اس ویرانے میں یہ گاڑی دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے میں نے زمین کے اندر سے زندہ سلامت گھوڑا برآمد ہوتے دیکھ لیا ہے۔ پھر میری نگاہ ''گاڑی والی'' پر پڑی۔ وہ ایک درخت کے نیچے ستانے والے انداز میں بیٹھی تھی اور ''حضرت بلال شاہ جالندھری'' گاڑی کا ٹائر بدلنے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں جیپ کی گھن گرج سن چکے تھے اس لیے جیپ ہی کی طرف دیکھ رہے تھے سب سے پہلے مجھے کملا سنہا نے پہچانا اور وہ ایک دم کھڑی ہو گئی میں نے اس کے قریب پہنچ کر بریک لگائے اب بلال شاہ بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ وہ ہاتھ میں ''پانا'' لیے میری طرف بھاگا دوسری طرف سے کملا لپکی۔

''آپ یہاں؟'' کملا کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

''اور تم یہاں کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم تو...... آپ کی طرف جا رہے تھے۔'' وہ زور سے بولی

''چلو جیپ میں بیٹھو دونوں۔'' میں عقبی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

میرے لہجے اور انداز نے ان دونوں کو سمجھا دیا کہ کوئی زبردست خطرہ درپیش ہے۔

''لل...... لیکن...... میری گاڑی؟'' کملا نے اعتراض کیا۔

''گاڑی بھی آ جائے گی۔'' میں نے اسے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

بلال شاہ نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے تھے لیکن میرے تاثرات دیکھ کر وہ بھی چپ ہو گیا دونوں لپک کر جیپ میں سوار ہوئے گاڑی کے چاروں طرف گرد و غبار پھیل چکا تھا۔ میں نے گیئر لگا کر ریس دی پہیے تیزی سے ایک کھڈے میں گھومے اور جیپ اچھل کر گرد و غبار کے بادل میں سے نکلی جونہی ہم صاف فضا میں پہنچے میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا ہمارے سامنے سو گز کی دوری پر چوہدری انپت رائے کی شیورلیٹ کار نظر آ رہی تھی

اچانک ایک دھماکہ ہوا اور تھری ناٹ تھری کی گولی سنسناتی ہوئی ہمارے قریب سے گزری۔ کاجل کے ہونٹوں سے چیخ نکلی اور اس نے سہم کر اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا میں نے جیپ کو تیزی سے بائیں طرف اُتارا اور جھاڑیوں کے درمیان دوڑاتا چلا گیا۔شیورلیٹ بھی راستے سے اُتر کر جھاڑیوں میں دوڑنے لگی اوپر تلے دو فائر ہوئے اور دونوں گولیاں سنسناتی ہوئی گاڑی کی باڈی میں پیوست ہوگئیں۔

''وہ سامنے ایک پاٹھ شالا ہے اس طرف موڑلیں۔'' بلال شاہ نے بلند آواز میں کہا۔بلال شاہ انگلی سے ایک جانب اشارہ کر رہا تھا میں نے اس رخ پر دیکھا تو ایک پختہ عمارت کی شکستہ دیواریں نظر آئیں۔تعاقب کرنے والے سر پر پہنچ چکے تھے، اب ان کی فائرنگ سے محفوظ رہنے کے لیے کسی شے کی آڑ درکار تھی۔ان ٹوٹی ہوئی دیواروں کے سوا اس وقت کوئی آڑ نظر نہیں آرہی تھی۔میں جیپ کو اس کھنڈر نما مقام میں گھساتا چلا گیا۔اس کھنڈر کی ایک جانب جھاڑیوں کے درمیان وسیع ڈھلوان سی بنی ہوئی تھی۔میرے پاس ۳۸ بور کا سرکاری ریوالور موجود تھا بلال شاہ بھی اکثر اپنے نیفے میں ایک دیسی ساخت کا پسٹل رکھا کرتا تھا۔جیپ ایک دیوار کی اوٹ میں پہنچ کر رک گئی۔آگے راستہ بند تھا میں نے ریوالور نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور دروازہ کھول کر جیپ سے باہر آگیا۔شیورلیٹ مجھے نظر نہیں آرہی تھی لیکن آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پاٹھ شالا سے پچاس ساٹھ گز دور رک گئی ہے اور اس میں سوار لوگ نیچے اُتر کر دائیں بائیں پوزیشن لے رہے ہیں۔چند سیکنڈ مزید گزرے اور پھر یکے بعد دیگرے ہونے والے دھماکوں سے پاٹھ شالا کا کھنڈر لرز اُٹھا۔کئی گولیاں سنسناتی ہوئی کھنڈر کی دیوارں میں پیوست ہوئیں اور شاخوں سے پرندے بھرا مار کر پرواز کر گئے۔مجھے اپنے عقب میں کملا اور کاجل کی دبی دبی چیخیں سنائی دیں اس کے ساتھ ہی میں نے لحیم شحیم بلال شاہ کو اوندھے منہ زمین پر گرتے دیکھا۔پہلے تو میری سمجھ میں یہی آیا کہ بلال شاہ کا قصہ پاک ہوگیا ہے اور اس کی بھلی مانس بیوی مزید بچے پیدا کرنے کی مصیبت سے بچ نکلی ہے لیکن پھر میں نے بلال شاہ کو فوجیوں کے انداز میں پیٹ کے بل رینگتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اسے گولی نہیں لگی وہ فائرنگ سے بچنے کے لیے زمین پر گرا ہے۔میں نے اپنے ریوالور سے اوپر تلے تین فائر کیے اور اپنے مخالفین کو بتایا کہ ہم بھی منہ میں زبان اور ہاتھ میں اسلحہ رکھتے ہیں۔

توقع کے مطابق بلال شاہ کے پاس اپنا پستول موجود تھا یہ اور بات ہے کہ اس میں صرف پانچ گولیاں تھیں۔بلال شاہ دیوار کی اوٹ میں مجھ سے شانے سے شانہ ملا کر بیٹھ گیا

اور پوری طرح ''بجنگ آمد'' نظر آنے لگا۔یہ پاٹھ شالا یعنی سکھوں کی درس گاہ جس میں ہم نے پناہ لی تھی قریباً ایک کنال جگہ پر تھی۔درمیان میں ایک احاطہ تھا جس میں چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا چاروں طرف حجرہ نما کمرے تھے۔عمارت کی چھتیں گر چکی تھیں اور ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔معلوم نہیں کتنے عرصے سے یہ جگہ ویران پڑی تھی ہم اس کھنڈر میں آکر وقتی طور پر محفوظ ہوگئے۔شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔اگر ہم آدھ پون گھنٹہ تک چوہدری کے کارندوں کو خود سے دور رکھنے میں کامیاب رہتے تو تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر یہاں سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی جاسکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم زیادہ دیر تک فائرنگ کا جواب نہیں دے سکتے تھے میرے پاس ریوالور کی قریباً بیس اور بلال شاہ کے پاس پانچ گولیاں تھیں۔اگر ہم ایک منٹ میں دو فائر بھی کرتے تو دس منٹ میں سارا ''ایمونیشن'' ختم ہو جانا تھا۔

ایکا ایکی کسی جیپ کا شور سنائی دینے لگا۔یہ گاڑی بھی نیم پختہ راستے سے اس پاٹھ شالا کی طرف بڑھ رہی تھی شور ذرا واضح ہوا تو پتہ چلا کہ یہ ایک نہیں دو گاڑیاں ہیں۔شیورلیٹ کے نزدیک پہنچ کر یہ گاڑیاں رک گئیں اان کے دروازے کھلنے، بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ایک کھڑکی کی چوکھٹ پر پاؤں رکھ کر میں ایک ٹوٹی ہوئی چھت پر چڑھ گیا چھت پر پیٹ کے بل لیٹ کر میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور سکتے میں رہ گیا کم وبیش چار گاڑیاں پاٹھ شالا کے اردگرد موجود تھیں۔ان گاڑیوں میں سے چوہدری انپت رائے کے مسلح کارندے نکل کر چاروں طرف پھیل رہے تھے۔مجھے چوہدری انپت کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی وہ اپنے کارندوں کو احکامات دے رہا تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ ہمیں اس پاٹھ شالا سے بچ کر نکلنا نہیں چاہیے وہ سب کا حشر نشر کردے گا۔بہت طیش میں دکھائی دیتا تھا وہ۔اس کا ''طیش'' سمجھ میں بھی آنے والی چیز تھی جس طرح جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے، چوہدری انپت رائے کی جان میری مٹھی میں آگئی تھی۔وہ ٹیپ جو میں حویلی سے نکال لایا تھا چوہدری کے لیے پھانسی کا پھندا تھی اس ٹیپ کو واپس حاصل کرنے کے لیے وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

میں جس چھت پر اوندھا لیٹا تھا وہ اتنی کمزور تھی کہ میرے بوجھ سے تڑخنے لگی۔بلال شاہ پکار کر بولا۔''خان صاحب! چھت گر رہی ہے۔'' میں فوراً چوکھٹ پر پاؤں رکھ کر نیچے اُتر آیا۔میرا نیچے اُترنا میرے حق میں بڑا مفید ثابت ہوا۔جونہی میں نے چوکھٹ پر پاؤں رکھا آٹو میٹک رائفل کی تڑتڑ گونجی اور کئی گولیاں در و دیوار میں پیوست ہوگئیں میں چھت پر ہوتا تو عین ممکن تھا کہ نقصان اُٹھاتا۔صورت حال ہماری توقع سے کہیں زیادہ سنگین ثابت ہو رہی تھی۔ ہمارے تعاقب میں آنے والے تعداد میں کسی طرح بھی بیس تیس سے کم نہیں تھے۔اور ان کا

اسلحہ بھی معمولی نہیں تھا ابھی جس گن سے فائرنگ کی گئی تھی وہ ایک طاقتور، خودکار گن تھی اور ہمارے ریوالور اس کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں تھے۔ عین ممکن تھا کہ اگلے پانچ دس منٹ میں ہمیں گھیر کر پکڑ لیا جاتا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ''ٹیپ'' اس پاٹھ شالا میں کہیں چھپا دوں۔

اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر میں نے ایک جگہ منتخب کی۔ گھاس پھونس کے درمیان تھوڑی سی جگہ کھودی اور ایک رومال میں لپیٹ کر ٹیپ کی چرخی مٹی میں دبا دی۔ میرے اس عمل کے دوران کملا سنہا میرے قریب آن کھڑی ہوئی تھی کملا سے میری آخری ملاقات آٹھ دس روز پہلے اپنے کوارٹر میں ہوئی تھی، جب اس نے مجھے ممتاز گوندل کی گرفتاری کی اطلاع دی تھی وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''یہ کیا ہے انسپکٹر'' اس نے اخباری نمائندوں کے ''خاص کھوجی'' انداز میں پوچھا۔

میں نے ہاتھ جھاڑ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم بتاؤ کہ تمہارا یہاں کیسے آنا ہوا؟''

اس نے بڑے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اس کی چمکیلی آنکھوں میں ایک بڑا خاص جذبہ کروٹیں لے رہا تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ خطرے میں گھرے رہیں اور میں اطمینان سے گورداسپور بیٹھی رہوں، میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میں بہت پریشان تھی آپ کے لیے، میں نے ایک اسسٹنٹ رپورٹر کو آپ کے کھوج میں بھیجا تھا اس نے پتہ چلایا کہ آپ رائے فارم میں ہیں۔ بس میں بلال شاہ کو لے کر یہاں پہنچ گئی۔ رائے فارم میں تو ہمیں کسی نے گھسنے نہیں دیا۔ بہرحال اتنا پتہ ہمیں ضرور چل گیا کہ آپ چوہدری کے ساتھ نوابی گاؤں چلے گئے ہیں۔ ہم نوابی گاؤں جا رہے تھے کہ یہاں راستے میں میری کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اتنے میں ہماری قسمت نے زور مارا اور آپ خود یہاں پہنچ گئے۔''

میں نے کہا۔ ''جسے تم خوش قسمتی کہہ رہی ہو وہ بہت زبردست قسم کی بدقسمتی ہے۔ یہ جگہ چاروں طرف سے گھیر لی گئی ہے اور گھیرنے والے چوہدری انپت رائے کے مسلح کارندے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کی مشترکہ قبر اسی پاٹھ شالا کے احاطے میں تیار ہو گی۔''

وہ بولی۔ ''مرنے سے میں کبھی نہیں ڈری اور آج تو بالکل بھی ڈر نہیں لگ رہا پتہ نہیں کیا بات ہے شاید اس لیے کہ آپ ساتھ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمی ہے تمہیں۔''

وہ بولی۔ ''آپ مجھے باتوں میں ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ ابھی

آپ نے وہاں کونے میں کیا دبایا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک ٹیپ ریکارڈر کا فیتہ ہے۔ اس میں چوہدری انپت کا اقبالی بیان ریکارڈ ہے۔ بس یوں سمجھو کہ وہ چوہدری کی پھانسی کا پھندا ہے۔''

پتہ نہیں کملا کو میری بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن ایک دم پریشان ضرور نظر آنے لگی۔ بولی۔ ''چوہدری انپت رائے اپنے جرم کا ثبوت ضائع کرنے کے لیے مشہور ہے۔ اگر واقعی آپ اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کر چکے ہیں تو وہ ثبوت ضائع کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''لگا دے گا...... کیا مطلب؟ وہ لگا رہا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ وہ ہمیں یہاں سے صحیح سلامت نکل جانے دے۔ اس ایک ریوالور کے ساتھ ہم ان لوگوں کو کتنی دیر یہاں سے دور رکھ سکیں گے۔''

وہ بولی۔ ''ایک بات کا شاید آپ کو پتہ نہیں۔ اس جیپ میں ایک آٹومیٹک رائفل بھی موجود ہے اس کے درجنوں راؤنڈ بھی اگلی سیٹ کے نیچے پڑے ہوئے ہیں۔''

یہ اطلاع میرے لیے حیران کن تھی میں نے بلال شاہ کو وہیں دیوار کے پاس چھوڑا اور خود جھک کر بھاگتا ہوا جیپ کی طرف گیا کملا سنہا میرے پیچھے پیچھے آئی۔ اس کی اطلاع بالکل صحیح تھی جیپ کی اگلی سیٹ کے نیچے کینوس کے دو تھیلوں میں ایک سب مشین گن کے درجنوں راؤنڈ موجود تھے۔ سب مشین گن لکڑی کے ایک کیس میں تھی اس کیس میں دو گنوں کے لیے جگہ تھی لیکن ایک گن کیس سے نکالی جا چکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کیس کا تالا بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ میں نے سب مشین گن ہاتھ میں لی یہ گن گیس آپریٹڈ گن تھی میگزین سائیڈ میں لگتا تھا اور ایک میگزین میں پچیس تیس کے قریب گولیاں لوڈ ہوتی تھیں لکڑی کے بکس میں ایک بھرا ہوا میگزین بھی موجود تھا۔ میں نے یہ میگزین گن سے اٹیچ کیا اور جیپ سے باہر آ گیا۔ پاٹھ شالا کے سامنے موجود افراد نے ایک بار پھر فائرنگ شروع کر دی تھی یہ فائرنگ آٹومیٹک رائفل، ریوالور اور تھری ناٹ تھری سے کی جا رہی تھی اس فائرنگ کا مقصد ہمیں نشانہ بنانا نہیں صرف خوفزدہ کرنا تھا۔ میں نے بھی مخالفین کو خوفزدہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ ہلہ بول کر پاٹھ شالا میں گھسنے کی کوشش نہ کریں۔ دیوار کی اوٹ لے کر میں نے سب مشین گن کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اوپر تلے دو برسٹ مارے خوفناک آواز سے قرب و جوار گونج اُٹھے میں نے کسی کو نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی لہٰذا ایک طرح سے یہ ہوائی فائرنگ تھی۔

قریباً تین چار منٹ تک اسی طرح فائرنگ کا تبادلہ ہوا پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔

چوہدری کے کارندے جو جوش کے عالم میں پاٹھ شالا کے بہت قریب آ گئے تھے سب مشین گن کے مسلسل قہقہے سن کر فاصلے پر چلے گئے۔

فائرنگ کے دوران ہی وہ چھت جس پر کچھ دیر پہلے میں اوندھے منہ لیٹا تھا دھماکے سے گر پڑی تھی۔ میں اور بلال شاہ خود کو بمشکل ملبے کی زد سے بچا سکے تھے۔ پھر بھی ایک اینٹ میرے ٹخنے کو زخمی کر گئی تھی۔ کملا نے میرے پاؤں سے خون بہتے دیکھا تو فکر مند ہو گئی۔

ہمیشہ کی طرح اس کے پاس شولڈر بیگ تھا۔ یہ بیگ عمرو عیار کی زنبیل جیسا تھا۔ میں نے اس میں سے بے شمار چیزیں نکلتی دیکھی تھیں۔ کاغذ قلم سے لے کر پرانے اخبار تک اور میک اپ کے سامان سے لے کر زیورات تک پتہ نہیں کیا کچھ اس میں بھرا رہتا تھا۔ آج اس بیگ میں سے میرے لئے مرہم پٹی کا سامان نکل آیا۔ اپنے نفیس لباس کی پرواہ کئے بغیر وہ گرد آلود زمین پر بیٹھ گئی اور میری پنڈلی سے جراب نیچے کر کے ٹخنے سے خون روکنے لگی۔ بڑی دردمندی اور تیزی سے دو منٹ کے اندر اندر اس نے میرے ٹخنے پر پٹی باندھ دی۔ بلال شاہ اسے مسلسل کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے روز ہی بلال شاہ کی کملا سے بنی نہیں تھی۔ وہ مجھ سے ملنے آتی تھی تو بلال شاہ اسے ٹرخانے کی کوشش کرتا تھا۔ باتوں باتوں میں اسے کڑوی کسیلی سنا جاتا تھا اور ایک بار تو ان دونوں میں جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ بلال شاہ کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر کملا بولی۔ ”پتہ نہیں اس موٹے کا میں نے کیا بگاڑا ہے ایسے دیکھتا ہے جیسے کچا کھا جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”دراصل یہ بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔ چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ سکھی رہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عورت کو میرے قریب دیکھ کر اسے فکر لاحق ہو جاتی ہے۔“

”آپ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت مصیبت کا دوسرا نام ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ میں نہیں کہتا، بلال شاہ کہتا ہے۔“

وہ تڑخ کر بولی۔ ”تو پھر اس موئے نے خود کیوں شادی کی تھی۔ میں نے سنا ہے اس کے ٹوکرا بھر بچے ہیں۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس تجربے سے گزرنے کے بعد وہ عورت سے اتنا خوفزدہ رہتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ اسے صرف مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے، یہ ایک اور لڑکی بھی تو آپ کے ساتھ آئی ہے۔ نوجوان ہے، خوبصورت ہے، اس کو یہ کیوں نہیں گھورتا؟“

کملا کا اشارہ کاجل کی طرف تھا۔ کاجل کا ذکر کر کے وہ مجھے کریدنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جاننا چاہ رہی تھی کہ یہ کون لڑکی ہے، میرے ساتھ کہاں سے آئی ہے اور کیوں؟ میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ یہ چوہدری انپت رائے کی چھوٹی پتنی ہے اور اس کی مدد سے میں چوہدری کے خلاف ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ ”کافی خوبصورت ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی اوٹ پٹانگ سا جواب دیتی۔ چند دھماکے ہوئے اور گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر گئیں۔ کملا سنہا ایک دم کانوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ساری شوخی رخصت ہو گئی۔ غالباً اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں نہیں ایک پاٹھ شالا کے کھنڈر میں بیٹھی ہے اور اس کی چاروں جانب بندوقوں کا پہرہ ہے۔ فائرنگ کے جواب میں مَیں نے بھی سب مشین گن سے چھوٹے چھوٹے تین چار برسٹ فائر کئے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ کے اندر پاٹھ شالا کا یہ کھنڈر گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ یہاں سے نکلنے کے لئے اب یہ سنہری موقع تھا۔ میں نے بلال شاہ کو اپنے پاس بلایا اور اسے ضروری باتیں سمجھا دیں۔ اس کے بعد کملا سنہا اور کاجل کو بھی بتا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس کھنڈر کی ایک جانب وسیع ڈھلوان سی تھی۔ جیسے پاٹھ شالا ایک ٹیلے پر موجود ہو اور یہ ڈھلوان ٹیلے کا دامن ہو۔ میں اور بلال شاہ جیپ دھکیل کر اس ڈھلوان کے عین کنارے پر لے آئے۔ میں نے بلال شاہ سے اس کا مفلر مانگا اور مفلر کی مدد سے جیپ کا اسٹیئرنگ اس طرح گیئر کے لیور سے باندھ دیا کہ جیپ کو ڈھلوان پر لڑھکایا جائے تو وہ اِدھر اُدھر مڑنے کی بجائے سیدھی نکل جائے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ دونوں لڑکیوں کو لے کر پاٹھ شالا کے شمالی حصے میں چلا جائے۔ پاٹھ شالا سے نکلنے کے لئے وہ جگہ بڑی مناسب تھی۔

بلال شاہ لڑکیوں کو لے کر مقررہ جگہ پر پہنچ گیا تو میں نے جیپ کا انجن سٹارٹ کیا اس کی بتیاں جلائیں اور دروازہ بند کرنے کے بعد اسے ڈھلوان پر دھکیل دیا۔ جونہی جیپ ڈھلوان پر اُتر کر کھنڈر سے باہر نکلی اس پر فائرنگ ہونے لگی۔ ایک دم دھماکوں سے قرب و جوار گونجنے لگے۔ اب یقینی بات تھی کہ پاٹھ شالا کو گھیرنے والے تمام افراد کی توجہ جیپ پر مرکوز ہو گئی ہے۔ یہاں سے نکلنے کے لئے یہ موقع بڑا مناسب تھا۔ میں بلال شاہ کے پاس

پہنچا اور ہم دونوں لڑکیوں کے ساتھ گھنی جھاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ تاریکی نے قرب و جوار کی ہر شے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں آگے تھا اور قریباً 800 گز تک مار کرنے والی سولہ پونڈ وزنی گن آگ برسانے کے لئے میرے ہاتھوں میں بالکل تیار تھی۔ پاٹھ شالا کے جنوبی حصے میں زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ بندوق برداروں کی بلند آوازیں اور سنسناتی گولیوں کی سیٹیاں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اس جانب بھی مسلح آدمی موجود ہوں اور اچانک ہم پر تابڑ توڑ پگھلا سیسہ برسنے لگے۔

بہرطور خیریت گزری اور ہم گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں رستہ بناتے ہوئے پاٹھ شالا سے قریباً دو فرلانگ دور نکل آئے۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ ہماری جیپ والی ترکیب کامیاب رہی ہے...... پاٹھ شالا سے محفوظ فاصلے پر آنے کے بعد ہم نے اپنی رفتار کم کر دی اور احتیاط سے درختوں میں راستہ بناتے آگے بڑھنے لگے۔ تاریک رات میں درختوں کے اندر سفر کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے اور اس کا حال کچھ انہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ تاریکی کے علاوہ سردی بھی اپنے عروج پر تھی۔ پاٹھ شالا کے اندر تو ہم کسی حد تک سرد ہوا سے محفوظ رہے تھے لیکن درختوں میں آتے ہی جان پر بن گئی تھی۔ خاص طور پر کملا کا بُرا حال تھا۔ اس نے حسبِ عادت کوئی گرم کپڑا نہیں پہن رکھا تھا۔ اب وہ بُری طرح کپکپا رہی تھی۔ شاید اس کی کپکپاہٹ ہی تھی جس کے سبب وہ دو تین بار لڑکھڑا کر گری۔ بلال شاہ کو چاہیے تھا کہ اس کا ہاتھ تھام لیتا لیکن وہ تو اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کے جسم کو ہاتھ کیسے لگاتا۔ بلال شاہ کی قطع تعلقی دیکھ کر میں نے کملا کا ہاتھ تھام لیا۔ اب میں اور کملا آگے تھے جب کہ کاجل ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ آخر میں بلال شاہ کی توند مٹک رہی تھی۔ عجیب جذباتی سی لڑکی تھی یہ کملا۔ ان پُرخطر لمحات میں بھی اس کی نسوانیت جاگ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پیوست ہوتا جا رہا تھا اور وہ مجھ سے چپکی ہوئی چل رہی تھی۔

چند لمحے بعد ایک کھالے کے کنارے ہمیں رکنا پڑا۔ یہ کھالا یا نالہ بدبودار پانی کا تھا۔ اس میں کسی فیکٹری کا فضلہ بہہ کر آ رہا تھا اور بدبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا پندرہ بیس گز دور نالے پر ایک پل سا دکھائی دیا۔ ہم پل پہ پہنچے۔ یہ دراصل کسی درخت کا تنا تھا جسے نالے پر اس طرح پھینک دیا گیا تھا کہ نالہ عبور کرنے کے لئے راستہ بن گیا تھا۔ یہ کافی خطرناک پل تھا۔ آمدورفت سے درخت کا تنا ملائم ہو چکا تھا۔ گزرنے والے کا پاؤں ذرا پھسلتا تو وہ چار فٹ نیچے بدبودار پانی میں ڈبکی کھاتا نظر آتا۔ بہرحال اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ نہ ہی ہم نالے کے اس کنارے پر رک سکتے تھے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر تنے کا

اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر تاریکی میں احتیاط سے پاؤں رکھتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ لڑکیوں کو گھبرانا چاہیے تھا لیکن ان سے زیادہ بلال شاہ گھبرا رہا تھا۔ موٹا تھا ناں...... اور موٹوں کی بے بسی ایسی موقعوں پر قابلِ دید ہوتی ہے۔ میں نے کملا کو اشارہ کیا کہ وہ آگے آئے۔ اس نے اپنا شیورلیٹ بیگ اچھال کر میری طرف پھینکا۔ پھر سینڈل اُتار کر ہاتھ میں لی اور بڑی احتیاط سے تنے پر پاؤں رکھا...... ابھی اس نے پہلا قدم اُٹھایا ہی تھا کہ بائیں جانب درختوں کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ''خبردار...... میں جان سے مار دوں گا۔''

میں نے دیکھا تاریکی میں تین چار ہیولے درختوں سے برآمد ہوئے اور انہوں نے کملا، کاجل اور بلال شاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ میں لپک کر ایک تناور درخت کی آڑ میں آ گیا۔ ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ نالے سے پار آیا اور عین اس درخت پر ٹھہر گیا جس کے پیچھے میں نے پناہ لی تھی۔ ظاہر تھا کہ مجھے بھی دیکھ لیا گیا تھا۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے جھاڑیوں میں روپوش ہو جانا میرے لئے چنداں مشکل نہیں تھا لیکن ایک آواز نے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ یہ چوہدری کے خاص غنڈے گوبند سنگھ کی آواز تھی۔

وہ گرج کر بولا ''بھاگنا نہیں تھانیدار جی۔ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی مجھے کملا کی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ گوبند نے کملا کو جکڑ کر ریوالور یا رائفل کی نال اس کے سر سے لگا رکھی ہے۔ میں چند لمحے شدید تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ میں یہاں سے نکل جاتا تو پولیس فورس کی مدد لے کر آ سکتا تھا لیکن میرے بعد بلال شاہ اور دونوں لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوتا؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر کملا سنہا تو چوہدری اور اس کے کتوں کے لئے تر نوالہ تھی۔ میرے واپس پہنچنے تک معلوم نہیں وہ کتنی مرتبہ اسے ذلت سے دوچار کر دیتے۔ میں نے ریوالور نیچے جھکایا اور درخت سے اوٹ سے نکل کر روشنی کے دائرے میں آ گیا۔ اسی دوران ایک کار کی ہیڈ لائٹس نے گرد و نواح کو روشن کر دیا۔ یہ چوہدری انپت رائے کی شیورلیٹ تھی۔

☆======☆======☆

وہ سرد رات بڑی ہنگامہ خیز اور عجیب و غریب تھی۔ آج تک اس شب کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن میں نقش ہے۔ چوہدری انپت رائے غصے میں آتش فشاں کی مانند کھول رہا تھا اور اس کے تیوروں سے نظر آتا تھا کہ ہم سب کو قتل کر کے اس ویرانے میں دفن کر دینا اس کے لئے معمولی کھیل بن گیا ہے۔

نالے کے قریب سے ہم کو پکڑنے کے بعد وہ لوگ پاٹھ شالا میں لے آئے۔ ہم سب

کی تلاشی لی گئی۔ کملا اور کاجل سے بھی کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ میرے لباس سے ریوالور اور بلال شاہ کے پاس سے پستول برآمد ہوا لیکن اس ٹیپ کا کہیں پتہ نہیں تھا جس کے لئے چوہدری اور اس کے کارندے ہلکان ہو رہے تھے۔ چوہدری انپت رائے نے سب کے سامنے اپنی پتنی کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ مارتے ہوئے پوچھا۔

''بتا حرام زادی! کہاں ہے وہ ٹیپ؟''

''کون سی ٹیپ؟'' کاجل نے روتے ہوئے کہا۔

''وہی...... جس میں تُو نے میری اور ذیل سنگھ کی آوازیں بھری ہیں۔''

''مم...... میں کچھ نہیں جانتی، تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

اس نے ایک اور تھپڑ کاجل کے گال پر مارا اور دانت پیس کر غرایا۔ ''غلط فہمی...... میں بتاتا ہوں، ابھی تم سب کو کہ کس کو غلط فہمی ہوئی ہے اور کس کو نہیں۔'' پھر وہ میری طرف آیا اور بڑی بے باکی سے میرے گریبان میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ ''لگتا ہے انسپکٹر! تجھے عزت راس نہیں ہے۔ میں نے تجھے عزت دینے کی کوشش کی تُو نے نہیں لی۔ اب ٹھیک ٹھاک طرح بے عزت ہونے کے لیے تیار ہو جا۔''

میں نے دل میں سوچا، تیرے تو اپنے پاس ذلت کے سوا اور کچھ نہیں تُو کسی کو عزت کیا دے گا۔ گوبند سنگھ نے آگے بڑھ کر جرمن ساختہ خودکار رائفل کی نال میری گردن سے لگا دی۔ ہمارے اردگرد کم از کم بیس افراد موجود تھے اور ان میں سے اکثر مسلح تھے۔ چوہدری انپت رائے نے مجھے بُری طرح جھنجھوڑ کر کہا۔ ''بتاؤ کہاں چھپایا ہے ٹیپ کا فیتہ؟''

''میں نے کہیں نہیں چھپایا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

ابھی بمشکل میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ کسی نے عقب سے ایک موٹی رسی میری گردن میں ڈال دی اور پورے زور سے کھینچ کر نیچے گرا دیا۔ دو تین ڈشکرے مجھ پر پل پڑے اور رسی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ چوہدری جانتا تھا کہ وہ جس شخص سے یہ جاگیردارانہ سلوک کر رہا ہے وہ کوئی معمولی مزارعہ یا نوکر چاکر نہیں۔ گورنمنٹ ملازم ہے اور پولیس انسپکٹر ہے۔ دو تین منٹ کے اندر اندر میرے ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیئے گئے اور ٹانگوں کے گرد بھی رسی کے بل دے دیئے گئے۔ دوسری طرف بلال شاہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اس نے مزاحمت کی کوشش کی تھی اور اس کے سر پر رائفل کا بٹ مارا گیا تھا۔ کملا سنہا اور کاجل کو آزاد رہنے دیا گیا تھا لیکن آزادی سے مطلب

کھلی آزادی نہیں تھی۔ ان کے سروں پر خطرناک صورت والا گن مین کھڑا تھا اور وہ اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتی تھیں۔

میں پاٹھ شالا کے ٹھٹھرے ہوئے گرد آلود فرش پر پہلو کے بل لیٹا تھا۔ چوہدری انپت رائے پنجوں کے بل میرے قریب بیٹھ گیا اور بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

''دیکھو انسپکٹر نواز! میں تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا لیکن وہ ٹیپ حاصل کرنے کے لئے میں ہر حد تک جا سکتا ہوں۔''

''مثلاً کیا کر لو گے تم؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بہت کچھ...... اور وہ سب کچھ بھی جو تمہارے تھانوں میں عادی مجرموں کے ساتھ ہوتا ہے...... اور وہ کچھ بھی جو ابھی تم لوگوں کے تصور میں نہیں آسکتا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ چوہدراہٹ برقرار رکھنے کے لئے بندے کو تھوڑا سا ظالم ہونا پڑتا ہے اور ظالم ہونے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ بندہ کسی کو تکلیف پہنچانا اور تکلیف پہنچا کر اپنے آگے جھکانا جانتا ہو۔ بھگوان کی کرپا سے میں اس کام میں ماہر ہو چکا ہوں۔ اب ذرا تم تصور کرو، اگر تھوڑی دیر بعد تمہارے سامنے یہ گوبند سنگھ اس خوبصورت اخباری رپورٹر کی عزت تارتار کرے اور اس کی چیخ و پکار تمہارے کانوں میں پڑے تو تم کیا کرو گے...... چلو مان لیا تم بے غیرت بن کر یہ سب کچھ برداشت کر جاؤ گے لیکن پھر جب تمہارے ساتھی اس موٹے بھینسے کو تکبیر پھیرے بغیر اس کی کھال اُتاری جائے گی اور یہ تڑپ تڑپ کر سر فرش سے ٹکرائے گا تو کیا کرو گے تم...... میرا خیال ہے تم برداشت نہیں کر پاؤ گے لیکن اگر کسی طرح اس موٹے کی دردناک موت بھی تم نے برداشت کر لی تو اپنی مصیبت کیسے کاٹو گے۔ یہ سامنے کھڑی شیور لیٹ ہم تمہاری ٹانگوں کے اوپر سے دس بیس مرتبہ اس طرح گزار دیں گے کہ ہر بار چند انچ سے زیادہ ٹانگیں ضائع نہیں ہوں گی...... تمہارے سامنے تمہارے جسم کا قیمہ بنے گا اور تم دیکھنے پر مجبور ہو گے۔''

گفتگو کے دوران چوہدری براہِ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا لیکن اگر وہ میری آنکھوں میں خوف دیکھنا چاہتا تھا تو اسے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہاں ایک طرح کی تشویش ضرور تھی مجھے، لیکن یہ تشویش آنکھوں میں نہیں دل میں تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس ٹھٹھری شب کی تاریکی میں اس ویران پاٹھ شالا کے اندر ہم بُری طرح پھنس گئے تھے اور بظاہر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس پاٹھ شالا میں ہماری آخری آرام گاہیں بھی تیار ہوں گی۔ اس وقت مسئلہ ٹیپ کا بھی نہیں رہا تھا۔ اپنی یا کسی دوسرے کی جان بچانے کے لئے میں ٹیپ

برآمد بھی کروا دیتا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ چوہدری ہمارے ساتھ وہی کرتا جس کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' چوہدری نے عجیب انداز سے میرے بالوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ تمہاری غلط فہمی کیسے دور کی جائے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''دنیا جہان کی غلط فہمیاں مجھے ہی تو ہو رہی ہیں۔ اب تم یہ بھی کہو گے کہ رات تم نے جیپ میں گھس کر گن بکس کا تالا نہیں توڑا اور وہاں سے دوسری گن نہیں نکالی۔''

''کون سی گن؟'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

وہ گوبند سنگھ کی طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ اس بار یقیناً ان لوگوں کو غلط فہمی ہو رہی تھی۔ (میں نے گن بکس میں سے صرف ایک گن نکالی تھی اور گن بکس کا تالا پہلے سے ٹوٹا ہوا تھا)

چوہدری انپت رائے میرے پاس سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری کھال بہت سخت ہے انسپکٹر! تم ایسے نہیں مانو گے۔''

اس نے گوبند سنگھ کو اشارہ کیا۔ وہ خطرناک انداز میں میری طرف بڑھا اور بے دریغ ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے پاؤں میں بھاری فوجی بوٹ تھے۔ میری پسلیاں ان بوٹوں کی زد میں آئیں تو پورے جسم میں درد کی ناقابلِ برداشت لہریں دوڑ گئیں۔ کملا سنہا سے یہ منظر برداشت نہیں ہوا۔ وہ رائفل بردار کی پرواہ کئے بغیر تیر کی طرح میری طرف لپکی اور میرے اوپر گر گئی۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہی تھی۔ ''چھوڑ دے کتے......مت مار...... پیچھے ہٹ جا۔''

گوبند سنگھ نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور دور پھینک دیا۔ گرتے ساتھ ہی وہ ایک رائفل بردار پر جھپٹی اور اس سے رائفل چھیننے لگی۔ ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا کہ وہ رائفل چھیننے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن پھر چوہدری انپت رائے کے ایک کارندے نے ریوالور کا فائر کیا اور گولی کملا سنہا کی ٹانگ میں لگی۔ وہ چیخ مار کر ایک طرف لڑھک گئی۔ گوبند سنگھ نے آگے بڑھ کر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ بڑی بے دردی سے ٹھوکر مارتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پاؤں انسانی جسم کی بجائے ریت سے بھری ہوئی بوری سے ٹکرایا ہو۔ یہ بڑے کٹھن لمحے تھے لیکن یہ لمحے ایک حیران کن واقعے کا آغاز ثابت ہونے والے تھے۔ بے بسی کی انتہا سے امید کی کرن پھوٹنے والی تھی۔ ایک ایسا کردار سامنے آنے والا تھا جسے ہم بالکل فراموش کر چکے تھے۔ یہ اس غیرت مند بھائی کا کردار تھا جس کی اکلوتی بہن کو درندوں نے قتل کر کے اس کی دنیا

اندھیرا کر دی تھی۔ میں جمیلہ اور اس کے بھائی کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس کے بھائی کا نام جمیل تھا اور اسے پولیس کے شکنجے سے نکالنے کے لئے ہی جمیلہ دربدر ہوئی تھی۔ بہن کی موت کے بعد وہ حال ہی میں رہا ہوا تھا۔ نوابی گاؤں آنے سے پہلے میں نے اس سے ملاقات کی کوشش کی تھی لیکن ملاقات ہو نہیں سکی تھی۔ یہی بھائی پچھلے دو گھنٹوں سے اس پاٹھ شالا کے اِردگرد منڈلا رہا تھا اور اپنا کام کرنے کے لئے کسی بہتر موقعے کی تلاش میں تھا۔ اچانک جب تڑتڑ کی خوفناک آواز گونجی اور میں نے چوہدری کے دو کارندوں کو تڑپ کر اپنے قدموں میں گرتے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لئے کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ غالباً کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ چوہدری اور اس کے کارندے چوکس ہوتے، سب مشین گن کا ایک اور طویل برسٹ آیا اور گوبند سنگھ سمیت تین افراد گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ اس برسٹ کی کچھ گولیاں چوہدری انپت رائے کی ٹانگوں میں بھی لگی تھیں۔ میں نے اسے لڑکھڑا کر حوض کے کنارے گرتے دیکھا۔ کملا اور کاجل خوفزدہ ہو کر چیخ رہی تھیں۔ پاٹھ شالا ایک دم ہی میدانِ جنگ بن گئی تھی۔ سب مشین گن چلانے والا جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے اندر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ویسی ہی سب مشین گن ہے جو ایک گھنٹہ پہلے میرے ہاتھ میں تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ گن بکس گھوم گیا جس کا تالا کسی نامعلوم چور نے توڑا تھا اور اس میں سے ایک گن نکال لی تھی۔ پلک جھپکتے میں ذہن اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ وہی چوری ہونے والی گن ہے۔ یہ گن اب اس شخص کے ہاتھ میں تھی جس سے چوہدری نے زندگی کا واحد سہارا چھین کر اسے زندہ درگور کر دیا تھا۔ اب یہ شخص انتقام پر آمادہ تھا اور ہم اپنے چاروں طرف موت کو رقص کرتے دیکھ رہے تھے۔ ایک منٹ کے مختصر وقفے میں اس شخص نے قریباً ڈیڑھ سو راؤنڈ فائر کئے اور پاٹھ شالا میں چوہدری کے کارندوں کی لاشیں بچھا دیں۔ جیسا کہ بعد میں گنتی ہوئی گوبند سمیت دس افراد پاٹھ شالا کے اندر ہلاک ہوئے، جب کہ چوہدری انپت رائے اور اس کا ایک کارندہ رنگ سنگھ شدید زخمی ہو کر احاطے میں حوض کے کنارے گرے۔ زخمی ہونے کے بعد بھی چوہدری انپت رائے نے جدوجہد ترک نہیں کی اور رینگتا ہوا اپنے اس جرمن ریوالور کی طرف بڑھا جو اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا لیکن اس وقت جمیل جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ وہ تہمند قمیص پہنے ہوئے تھا۔ سر پر نیلی پگڑی تھی۔ سب مشین گن پکڑنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسلحے کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتا لیکن کم سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود اس نے وہ سب کچھ کیا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ جب اس نے چوہدری انپت رائے کو قتل کیا، میں صرف چار فٹ کی دوری پر تھا۔ میں نے چوہدری کی آنکھوں میں دنیا جہان کا

خوف سمٹے دیکھا۔ پھر گن نے قہقہہ لگایا اور چوہدری کی نصف کھوپڑی صاف اُڑ گئی۔ اس کھوپڑی کا ایک حصہ بالکل ناریل کے ٹکڑے کی طرح میں نے تالاب کے پانی میں گرتے دیکھا...... ساری عمر فاتح رہنے والا چوہدری آخر اپنی دردناک موت سے ہار چکا تھا...... یہ دردناک موت جمیل کی صورت اس کی لاش کے سرہانے کھڑی تھی۔

☆======☆======☆

اپنی بہن کے قاتلوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد جمیل آزاد علاقے میں رُوپوش ہو گیا۔ اس کی تلاش میں پارٹیاں بھیجی گئیں لیکن سب کی سب ناکام واپس آ گئیں۔ ایس پی نیومن نے ایک بار مجھے بھی بھیجنا چاہا لیکن میں نے بڑی عاجزی سے انکار کر دیا۔ نیومن صاحب جانتے تھے کہ میں کیوں انکار کر رہا ہوں۔ میں یہ کام دل و جان سے نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں نے انکار کر دیا تھا اور صرف انکار کر کے میں نے حق ادا نہیں کیا تھا، میرے بس میں ہوتا تو میں اس شخص کو تمغہ جرأت دیتا جس نے گورداسپور کے ''ہٹلر'' کو پاٹھ شالا میں گولیوں سے چھلنی کیا تھا۔ اس ڈکٹیٹر کے مرنے سے نہ صرف کاجل اور اس کے بھائی کی جان چھوٹی بلکہ نہ جانے کتنے ایسے لوگوں کا مستقبل محفوظ ہو گیا جو آئندہ چوہدری کی سفاک چوہدراہٹ کا شکار ہونے والے تھے۔ وہ ٹیپ جس میں چوہدری کی آواز ریکارڈ تھی چوہدری کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے کام تو نہ آ سکی لیکن اس کے درجنوں کارندے اس ٹیپ کے طفیل پھنس گئے۔ ان میں غدار ہیڈ کانسٹیبل سنت سنگھ بھی شامل تھا۔

اس خونی معرکے میں کملا زخمی ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگ سے گولی نکال دی گئی تھی لیکن وہ کئی ہفتے ہسپتال میں رہی۔ بیٹی کی بیماری کی خبر سن کر اس کا باپ ولایت سے آیا اور اسے زبردستی ساتھ لے گیا۔ جانے سے ایک روز پہلے وہ پھر تھانے آ دھمکی۔ اس روز اس نے بلال شاہ کو خوب جلایا۔ اس کی پرواہ کئے بغیر دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ کھاتی پیتی رہی اور ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی لیکن میں جانتا تھا اس کا سارا ہنسی مذاق دکھاوے کا ہے۔ اندر سے وہ بے حد غمگین تھی...... وہ اس ملاقات کو آخری ملاقات کی حیثیت سے طول دیتی چلی گئی اور بلال شاہ کا کُڑھ کُڑھ کر بُرا حال ہو گیا۔ آخر کوئی دو گھنٹے بعد بلال شاہ کی مشکل آسان ہوئی اور کملا مجھے اور ممتاز گوندل کو الوداع کہہ کر عازمِ ولایت ہو گئی۔

☆======☆======☆

دشمنی اور عورت

وہ بدکار نہیں تھی، ہاں بزدل ضرور تھی، وہ خاموشی سے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی لیکن اس کا محبوب اپنے دل میں شک کا سنپولیا پال رہا تھا...... اور پھر یہ سنپولیا ایک زہریلے ناگ کا روپ دھار گیا۔

دشمنیاں اور رقابتیں پالنے والے مرد ہوتے ہیں لیکن اس کی سزا دونوں فریقوں کی عورتوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ انہیں اجاڑا جاتا ہے اور پامال کیا جاتا ہے۔

سردیوں کے دن تھے، میں ڈکیتی کی ایک واردات کی تفتیش کر کے تھانے پہنچا تو شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ سردیوں میں آٹھ بجے بھی رات ہی سمجھی جاتی ہے۔ میرا محرر مٹی کی انگیٹھی میں اوپلوں کی آگ جلائے چوڑا ہو کر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ سردیوں میں آگ کا نظارہ آنکھوں کو بڑا اچھا لگتا ہے اور آگ سینکنا ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ میں ہاتھوں کو رگڑتا بڑے شوق سے آگ کی طرف بڑھا لیکن آگ تک پہنچنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ تھانے کے دروازے سے میرا سنگی ساتھی بلال شاہ ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا اور اس نے ایک خبر کھٹاک سے میرے سر پر دے ماری۔ کچھ تو خبر ایسی تھی کچھ بلال شاہ کے سنانے کا انداز۔ پورے تھانے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اطلاع یہ تھی کہ گاؤں کی شمالی جانب حاجی رحمت کے کھیتوں میں ایک شخص شدید زخمی حالت میں پڑا ہے۔ بس کوئی کوئی سانس اس میں باقی ہے۔ بلال شاہ نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا تھا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹے ہوئے تھے اور چہرہ خون میں لت پت تھا۔ لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی شہری بندہ ہے۔

میں نے اسی وقت دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور بلال شاہ کے ساتھ موقعہ واردات کی طرف روانہ ہوا۔ سخت سردی نے گلیاں سنسان کر رکھی تھیں اور کھیت کھلیان ویران نظر آتے تھے۔ کوئی تین فرلانگ طے کر کے ہم حاجی رحمت کے کھیتوں میں پہنچے۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ اور بلال شاہ کے پاس لالٹین تھی۔ وہ کماد کے کھیت میں ایک جگہ پہنچ کر رک گیا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی شکل دیکھی اور سمجھ گیا کہ یا تو وہ بھول رہا ہے یا پھر کوئی زخمی کو اُٹھا کر لے گیا ہے۔

''ہاں بھئی بلال شاہ! کہاں گیا تمہارا بندہ؟''

بلال شاہ بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگا لیکن ''بندہ'' وہاں ہوتا تو ملتا۔ دونوں سپاہی

بلال شاہ کی حالت پر ہنسنے کی تیاری کر رہے تھے جب میری ٹارچ کا روشن دائرہ کچی زمین پر خون کے چھوٹے چھوٹے دھبوں پر پڑا۔ بلال شاہ سچا تھا۔ یقیناً تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک زخمی موجود تھا۔ ہم نے اچھی طرح اردگرد کے کھیتوں کا جائزہ لیا لیکن کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا۔ اگر خون کے دھبے موجود نہ ہوتے اور زمین گواہی نہ دیتی تو ہم یہی سمجھتے کہ بلال شاہ کو زبردست دھوکا ہوا ہے۔

دیہاتی زندگی میں اس طرح کے واقعات روزمرہ کا معمول ہوتے ہیں، ایک کھیت میں کسی زخمی کا پایا جانا اور پھر غائب ہو جانا زیادہ انہونی بات نہیں تھی۔ کہیں سے کسی نے کوئی رپورٹ وغیرہ بھی نہیں کی تھی لہٰذا اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی سنگین معاملہ نہیں ہے۔ یہ دوسرے تیسرے روز کا واقعہ ہے صبح کا وقت تھا۔ میں آ کر اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ دو تین آدمی تھانے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھی عورت بھی شامل تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام اللہ وسائی تھا اور یہ گاؤں میں پرچون کی چھوٹی سی دکان کرتی تھی۔ خاوند مر چکا تھا اور یہ اپنی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے بیٹے کا نام سدو تھا۔ وہ بیچارا سیدھا سادہ تھا۔ اللہ وسائی کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

''تھانیدار جی! کوئی میری نوراں کو اُٹھا کر لے گیا ہے ہائے میں اُجڑ گئی۔ ہائے میں برباد ہوگئی۔''

وہ بے تحاشہ واویلا کرنے لگی۔ میں نے اس کے ساتھ آنے والے مردوں سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے بھی یہی بات بتائی کہ کسی نے نوراں کو اُٹھا لیا ہے۔ یہ تین مرد جو ساتھ آئے تھے، دو تو اللہ وسائی کے پڑوسی تھے اور ایک گاؤں کا مؤذن تھا۔ میں نے اللہ وسائی کو تسلی دی اور اسے کہا کہ وہ تفصیل سے ساری بات بتائے تاکہ اگر واقعی لڑکی اغوا ہوئی ہے تو کارروائی میں دیر نہ ہو۔ اللہ وسائی نے کہا۔

''میرے پُتر سدو کو رات سے پیٹ میں درد تھا۔ صبح اذانوں کے وقت میں حکیم کو بلانے کے لئے نکلی۔ حکیم صاحب نماز پڑھنے نکلے ہوئے تھے۔ میں مسجد کے دروازے پر آ بیٹھی۔ وہ نماز پڑھ کر نکلے تو میں انہیں لے کر گھر آئی۔ اس سارے چکر میں مجھے کوئی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ میں دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر گئی تھی۔ گھر آ کر دیکھا تو کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ اندر گئی تو سدو چارپائی پر خاموش بیٹھا تھا اور نوراں اس کے پاس نہیں تھی۔ ورانڈے میں مجھے نوراں کی ایک چپل نظر آئی اور صحن میں اس نصیباں جلی کا دوپٹہ پڑا تھا۔''

اتنا کہہ کر اللہ وسائی پھر دھاڑیں مارنے لگی۔ گاؤں کے مؤذن نے بتایا کہ آج سحری کے وقت جب وہ مسجد کی طرف روانہ ہوا تو اللہ وسائی کے پچھواڑے اسے تین آدمی نظر آئے۔ انہوں نے گرم چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں اور ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ مؤذن نے کہا۔

''مجھے ان پر شک ہوا۔ میں نے قریب جا کر پوچھا۔ کون ہو جوانو؟ ان میں سے ایک نے کہا۔ ہماری گھوڑی کھل گئی ہے۔ تم نے تو کسی سفید گھوڑی والے کو نہیں دیکھا۔ میں نے کہا، میں تو ابھی گھر سے نکلا ہوں۔ وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے اور میں مسجد کی طرف نکل گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اللہ وسائی کی دھی غائب ہے۔''

میں اسی وقت اپنے اے ایس آئی فرزند علی اور دو سپاہیوں کے ساتھ اللہ وسائی کے گھر پہنچا۔ چھوٹا سا دیہاتی مکان تھا تاہم صحن کافی کھلا تھا۔ ایک بھوری بھینس اور دو بکریاں صحن میں بندھی تھیں۔ ایک طرف چارہ کاٹنے کا ٹوکا بھی لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا اللہ وسائی کے پاس اتنی شاندار بھوری بھینس کہاں سے آئی ہے لیکن اس وقت یہ بات چھیڑنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے موقع دیکھا۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ اللہ وسائی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کی بیٹی کو زبردستی لے جایا گیا ہے۔ برآمدے اور صحن کی کچی زمین پر کھینچا تانی کے آثار صاف محسوس کئے جا سکتے تھے۔ جوتی اور دوپٹے کے علاوہ مجھے ایک جگہ ٹوٹی ہوئی چوڑی کے ٹکڑے بھی نظر آئے۔ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ گھر میں گھسنے والے افراد دو سے زیادہ تھے۔ اللہ وسائی کا بائیس سالہ بیٹا سدو دیوار سے ٹیک لگائے بچوں کی طرح ریں ریں رو رہا تھا۔ اس کی ڈاڑھی صرف ٹھوڑی پر تھی اور منہ ہر وقت ہونقوں کے انداز میں کھلا رہتا تھا۔ اس سے کچھ پوچھنا فضول تھا۔ اسے تو شاید احساس بھی نہیں تھا کہ ان کے گھر اتنا بڑا حادثہ ہو چکا ہے۔ وہ صرف اپنے پیٹ کے درد کی وجہ سے رو رہا تھا۔ میں نے اس سے ایک دو سوال کئے جن کے جواب اس نے غوں غاں میں دیئے یا دروازے کی طرف انگلی اُٹھا کر کچھ بے معنی الفاظ بولتا رہا۔ موقعے کا جائزہ لے کر میں نے ایک دو پڑوسیوں سے سوالات پوچھے اور تھانے واپس آ گیا۔

گاؤں میں نوراں اور اس کی ماں کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ شاید گاؤں والے ان دونوں کو کب سے گاؤں بدر کر چکے ہوتے مگر اصل مسئلہ جمالے کا تھا۔ جمالا گاؤں کے نمبردار شاہ دین کا بڑا بیٹا تھا اور پورے علاقے میں اس کا اثر تھا۔ سب جانتے تھے کہ جمالے کا نوراں سے میل جول ہے مگر کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اس پر انگلی اُٹھا سکے۔ ہاں اگر جمالا کسی کمی کمین کا بیٹا ہوتا تو لازمی طور پر اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ چکے ہوتے۔ اس معاملے میں بھی

ہوسکتا تھا جمالے کا ہاتھ ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی اور چکر ہو۔ مجھے معلوم تھا نوراں اس سے پہلے بھی غائب ہو چکی تھی۔ وہ کوئی چھ مہینے غائب رہنے کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے واپس آئی تھی۔ اسے لانے والا جمالا ہی تھا۔ ایک روز صبح سویرے وہ اسے گھوڑی پر اپنے پیچھے بٹھائے گاؤں میں داخل ہوا تھا اور اسے اللہ وسائی کے سپرد کر دیا تھا۔ کسی کو جمالے سے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس پاپ کی گٹھڑی کو کہاں سے لایا ہے اور کیوں لایا ہے۔ نہ ہی اس نے کسی کو بتایا تھا۔ ساری بات اثر و رسوخ کی تھی۔ گاؤں کے کسی نیکوکار کا ضمیر نہیں جاگا تھا اور نہ ہی کسی کی پگ کو داغ لگا تھا اور آج ایک بار پھر نوراں غائب ہو گئی تھی۔

میں ابھی بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ جمال دین عرف جمالا دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ چھ فٹ قد، اوپر کو اُٹھی ہوئی مونچھیں اور کندھے پر عموماً پستول رہتا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''آؤ نمبردار جی! مجھے پتا تھا آپ آنے ہی والے ہوں گے۔''

جمالا کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''تھانیدار جی! آؤ میرے ساتھ، میں بتاتا ہوں آپ کو مجرم کا پتہ۔''

میں نے کہا۔ ''کس مجرم کی بات کر رہے ہو؟''

''وہی جس نے نوراں کو اُٹھایا ہے۔'' وہ آنکھیں نکال کر بولا۔

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟''

''تھانیدار جی! ان چکروں میں نہ پڑو۔ اسے میری شرافت ہی سمجھو کہ آپ کے پاس آیا ہوں۔ ورنہ میں تو اس حرامی کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیتا۔ لاش تک نہ ملتی اس کنجری کے پُتر کی۔ چلو آؤ میرے ساتھ...... نہیں تو میں جا رہا ہوں خود ہی۔''

میں نے جمالے کے تیور دیکھے اور سمجھ گیا کہ وہ آپے سے باہر ہو رہا ہے۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھئی۔ میں چلتا ہوں تیرے ساتھ، لیکن یہ بھی تو پتہ چلے کہ وہ ذات شریف ہے کون اور کہاں ملے گا؟''

وہ بولا۔ ''امرتسر...... محلہ ککے زئیاں تک جانا ہو گا۔''

میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''جمالے...... یہ شخص وہی تو نہیں...... میرا مطلب ہے نوراں پہلے بھی تو غائب رہی ہے کیا یہ وہی معاملہ ہے؟''

وہ لال پیلا ہو کر بولا۔ ''ہاں جی۔ ایسا ہی سمجھ لیں۔ پہلے اس کتے کو گرفتار کر لیں پھر میں سب بتاتا ہوں آپ کو۔''

میں دو کانسٹیبلوں کو لے کر ساتھ چل دیا۔ باہر اس کی جیپ کھڑی تھی۔ امرتسر وہاں سے

چودہ میل پر تھا۔ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں شہر پہنچ گئے۔ جمالے نے محلہ ککے زئیاں کا رخ کیا۔ یہ تو مجرم کی بیوقوفی ہی ہوسکتی تھی کہ وہ مغویہ کو لے کر سیدھا اپنے گھر آیا ہو...... ہاں اس کے گھر سے کوئی سراغ ضرور مل سکتا تھا۔ مقامی تھانے سے ہم نے ایک اے ایس آئی کو ساتھ لیا۔ مختلف گلیوں سے ہو کر ہم ایک چھوٹے سے شکستہ مکان کے سامنے رکے۔ جمالا غصے میں خوب تپا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"دیکھو جمالے! تم اکیلے نہیں ہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں اس لئے تمہیں بولنے یا غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ساری بات ہم خود کریں گے۔"

میں نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا۔ اس نے دھوتی بنیان پہن رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی دھندلی آنکھوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹ آیا۔ گھبرا کر بولا۔

"کک...... کیا بات ہے جی؟"

میں نے کہا۔ "بات اچھی نہیں ہے۔ کپڑے پہن کر ذرا باہر آجاؤ۔"

اس کی آنکھوں کا خوف کچھ اور بڑھ گیا۔ اتنے میں ایک تیس بتیس سالہ شخص بھی دروازے پر نظر آیا۔ اس کی صورت یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ وہ بوڑھے کا بیٹا ہے۔ ہم نے باپ بیٹے کو ساتھ لیا اور جیپ میں آبیٹھے۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے کہ شاید انہیں تھانے لے جایا جارہا ہے۔ ان کی عورتیں جن میں ملزم کی دو جوان بہنیں بھی شامل تھیں دروازے پر کھڑی تھیں۔ ان سب کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ میں نے بوڑھے سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے عبدالکریم بتایا۔ بیٹے کا نام سجاد تھا۔ میں نے عبدالکریم سے پوچھا۔

"لڑکی اور لڑکا کہاں ہیں؟"

وہ مزید گھبرا گیا۔ "کس کا پوچھ رہے ہیں جناب؟"

میں نے کہا۔ "نوراں اور رفیق کا۔"

ایک دم بوڑھے اور اس کے بیٹے کی آنکھیں پھیل گئیں، وہ ایک ساتھ گھگیا کر بولے۔

"ہمیں کچھ معلوم نہیں جناب، ہم غریب آدمی ہیں۔ ہمیں معاف کردیں جناب۔"

میں نے کہا۔ "تم دونوں کو معافی ہی معافی ہے صرف فیقا کا پتہ بتا دو۔"

عبدالکریم نے کہا۔ "ہمارا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں جی۔ نہ میں اس کا باپ ہوں، نہ وہ میرا بیٹا۔ میں اسے گھر سے نکال چکا ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں وہ کیا کرتا ہے کہاں رہتا ہے؟"

جمالا غصے سے پھٹ پڑا۔ "بکواس نہ کراوئے بڈھے۔ بڑا نیکوکار بنتا ہے۔ میں تم سب کو جانتا ہوں۔ ایک سے بڑھ کر ایک مال زادے ہو تم۔ اب گردن پاؤں کے نیچے آئی ہے تو کہتا ہے میں اس کا باپ نہیں ہوں۔ تُو باپ نہیں تو کون باپ تھا اس کا؟"

میں نے جمالے کو بمشکل چپ کرایا۔ اس کے خوفناک تیور دیکھ کر بوڑھا اور اس کا بیٹا تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ ایسی کچی پکی باتوں سے ان کی جان نہیں چھوٹے گی۔ اگر وہ تھانے میں الٹا لٹکنا نہیں چاہتے تو صاف صاف بتائیں کہ فیقا کہاں ہے اور اس کے سنگی ساتھی کون ہیں؟

میرے غصیلے لہجے نے باپ بیٹے کو بولنے پر مجبور کردیا۔ انہوں نے رفیق کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ کچھ یوں ہے۔

"آج سے کوئی آٹھ دس ماہ پہلے ایک رات فیقا کارخانے کی دوسری شفٹ میں کام کر کے واپس آرہا تھا کہ ریلوے لائن کے قریب درختوں میں اسے کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔ وہ اس سنسان جگہ پر یہ آواز سن کر حیران رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا تو یہ آواز ریلوے گارڈ کی کوٹھڑی میں سے آرہی تھی۔ رفیق ہڈ پیر کا اچھا اور جسم کا مضبوط تھا۔ اٹھتی ہوئی جوانی تھی اور دل میں جوش بھی تھا۔ وہ دبے پاؤں کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ اندر مدھم روشنی ہورہی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ دو آدمی ایک خوبصورت دیہاتن لڑکی سے ہاتھ چالاکی کررہے تھے۔ ایک نے اس کا منہ دبا رکھا تھا اور دوسرا ٹانگیں جکڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ لڑکی کا لباس تار تار تھا اور جسم پر تشدد کے آثار تھے۔ رفیق کو لڑکی کی بے بسی پر بہت ترس آیا۔ اس کے پاس لوہے کی ایک لٹھ تھی۔ یہ لٹھ وہ رات کو واپس آتے ہوئے آوارہ کتوں کے لئے رکھتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو زور سے دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اس نے دونوں افراد کو لوہے کی لٹھ پر رکھ لیا اور تاک تاک کر چوٹیں لگائیں۔ وہ اس اچانک حملے سے اس قدر گھبرائے کہ ڈر کر بھاگ نکلے۔ لڑکی اس وقت تک خوف اور صدمے سے بے ہوش ہوچکی تھی۔ اس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا۔ اس نے لڑکی کو کندھے پر ڈالا اور گھر لے آیا۔ نوراں کوئی دس روز اس کے گھر رہی۔ اس دوران اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی کسی طرح یہ پتا چل سکا کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟ وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ محلے والے باتیں بنانے لگے تو عبدالکریم نے بیٹے سے کہا کہ وہ اس مصیبت کو گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ اس نے رفیق سے کہا کہ وہ لڑکی کو پولیس کے حوالے کردے یا پھر اسے بولنے پر مجبور کردے تاکہ اسے وارثوں تک پہنچا دیا جائے...... یہ دونوں باتیں نہ ہوئیں

تو عبدالکریم نے لڑ جھگڑ کر بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ وہ بھی ارادے کا پکا نکلا۔ اس نے شہر سے باہر ایک قریبی بستی میں مکان کرائے پر لے لیا اور وہاں نوراں کے ساتھ رہنے لگا۔ مکان کی بوڑھی مالکن بھی ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ دراصل رفیق نہیں چاہتا تھا کہ نوراں ایک بار پھر غلط ہاتھوں میں پڑ جائے اور اس کی زندگی برباد ہو۔ نوراں خود بھی اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

پھر پتا چلا کہ وہ نوراں سے شادی کر رہا ہے لیکن یہ شادی ہو نہ سکی۔ ایک روز رفیق اجڑا بچڑا گھر آ گیا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور وہ کئی روز کا بھوکا اور بیمار تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ لڑکی دغاباز نکلی۔ ایک روز جب کہ وہ شادی کا سامان لینے گھر سے نکلا ہوا تھا وہ خاموشی سے اس کا گھر چھوڑ گئی۔ یہ حالات جان کر سب گھر والوں نے رفیق کو بُرا بھلا کہا اور لعن طعن کی۔ وہ چند روز ہی گھر میں رہا اور پھر چپکے سے کسی طرف نکل گیا۔ اس کے بعد سے اس کا کچھ پتا نہیں۔''

بوڑھے عبدالکریم اور سجاد کی باتوں پر جمالے نے سخت پیچ و تاب کھائے۔ اس نے کہا، یہ دونوں سفید جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان ساروں نے مل جل کر یہ کھیل کھیلا ہے۔ اس نے کہا۔'' یہ بالکل بکواس ہے کہ فیقا نے نوراں کو غنڈوں سے چھڑایا تھا۔ وہ تو خود بہت بڑا غنڈہ اور لوفر ہے۔ اس نے نوراں کو اس وقت اغوا کیا جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے گاؤں سے مراد پور آئی ہوئی تھی۔ فیقا اور اس کے دوست بھی میلے میں موجود تھے۔ میلے کے دوران آندھی آ گئی۔ اس افراتفری میں کسی طرح ان کا داؤ چل گیا اور وہ نوراں کو جیپ میں ڈال کر لے اُڑے۔ شہر لا کر فیقا کئی ہفتے مختلف جگہوں پر نوراں کی عزت سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے ایک مکان کرائے پر لیا اور وہاں رہنے لگا۔ نوراں اس غنڈے کے چنگل میں بے بس تھی اور فرار کا کوئی راستہ نہیں پاتی تھی۔ محلے والے بھی فیقے کی بدمعاشی کے سامنے چپ تھے لیکن کب تک؟ جب وہ باتیں بنانے لگے تو اس نے نوراں سے شادی رچانے کا اعلان کر دیا۔ خوش قسمتی سے ایک روز نوراں کو موقع مل گیا اور وہ اپنی نگرانی کرنے والی عورت کو چکمہ دے کر اس مکان سے بھاگ نکلی۔ وہ شہر میں میرے ایک جاننے والے کے پاس پہنچی اور اس کے ذریعے مجھے پیغام پہنچایا کہ میں اسے آ کر لے جاؤں۔ میں اسے لینے شہر پہنچ گیا۔ مجھے فیقے اور اس کے ساتھیوں پر سخت طیش تھا مگر نوراں نے مجھے کوئی بھی قدم اُٹھانے سے منع کر دیا۔ اسے اپنی بدنامی اور رسوائی کا خوف تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اب اس معاملے کو اسی جگہ ٹھپ کر دیا جائے۔ میں نے صرف نوراں کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھی بھر لیا اور اسے لے کر چپکے سے

گاؤں آ گیا لیکن وہ کتے کا پلا اپنی اوقات پر آ کر رہا۔ اس نے بڑی چالاکی سے نوراں کا کھوج لگایا اور اپنے چمچوں کے ساتھ مل کر دوبارہ اسے اغوا کر لیا۔''

بوڑھے عبدالکریم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔'' تھانیدار جی! میں کسی اور بات کا تو دعویٰ نہیں کرتا لیکن خدا کو حاضر ناظر جان کر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے نوراں کو زبردستی نہیں رکھا ہوا تھا۔ وہ مرضی سے اس کے ساتھ تھی۔''

میں نے کہا۔'' اچھا، ان ساری باتوں کا تو پتہ چل جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کس کی کیا مرضی تھی۔ فی الحال تم دونوں مجھے اس مکان تک لے چلو جو فیقے نے کرائے پر لے رکھا تھا۔''

عبدالکریم نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اسے مکان کا کچھ پتا نہیں۔ سجاد کچھ خاموش نظر آ رہا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ اس ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہے۔ میں نے پوچھا تو میرا اندازہ درست نکلا وہ بولا۔'' میں صرف ایک بار ماں کی بیماری کی خبر دینے وہاں گیا تھا۔''

جمالا دانت پیس کر غرایا۔'' ایک طرف کہتے ہو کہ ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ دوسری طرف خبریں آتی جاتی تھیں اور پھیرے لگتے تھے۔''

ہم نے بوڑھے عبدالکریم کو تو وہیں چھوڑ دیا اور سجاد کو لے کر شہر کے جنوبی مضافات کی طرف روانہ ہوئے۔

☆======☆======☆

کوئی ایک گھنٹے بعد ہم ایک دومنزلہ مکان کی نچلی منزل میں ایک ادھیڑ عمر موٹی پلپلی سکھ عورت کے سامنے بیٹھے تھے۔ عورت کا نام جنداں کور تھا وہ اس خستہ حال مکان کی مالکن تھی۔ وہ ایک دلیر عورت تھی اور سکون سے ہمارے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

'' ہاں پُتر جی! رفیق کوئی پانچ مہینے رہا ہے میرے مکان میں۔ اس کے ساتھ نوراں بھی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی کچھ کچھ راضی تھی۔ وہ بڑی ڈری سہمی رہتی تھی۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے اپنے وارثوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی بتایا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ باقی ان دونوں نے میرے مکان میں کوئی بے حیائی کی بات نہیں کی۔ دونوں مجھے ماں سمجھتے تھے۔ نوراں رات کو میرے ساتھ سوتی تھی۔ دن میں بھی وہ کبھی زیادہ دیر تک فیقا کے پاس نہیں بیٹھتی۔ محلے والے باتیں بناتے تھے لیکن میں نے کبھی کسی کی پرواہ نہیں کی۔ جب پرواہ والی بات ہی نہیں تھی تو میں کیوں کرتی پرواہ۔ ایک دن بھی میں ان

دونوں کی نیت میں فتور دیکھ لیتی تو دھکے مار کر نکال دیتی۔ وہ ایسے نہیں تھے اور نوراں تو ایسی لڑکی ہے کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ پتہ نہیں اوپر والا اتنے اچھوں کو اتنے بُرے نصیب کیوں دے دیتا ہے۔''

میں نے جنداں سے پوچھا۔ ''تیرا خیال ہے کہ نوراں اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی تھی؟''

وہ بڑے دھڑلے سے بولی۔ ''بالکل مجھے تو کبھی نہیں لگا اس پر زبردستی ہو رہی ہے۔''

جمالا چلایا۔ ''یہ فقّے کٹنی ہے تھانیدار۔ اس کے منہ میں فیقے کی زبان ہے۔ تھانے میں دو چھتر پڑے تو بالکل سیدھی ہو جائے گی۔''

جنداں کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹیں۔ اس نے خونی بلی کی طرح پنجے نکالے اور نمبردار پر جھپٹ پڑی۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکل رہی تھی۔ چیخ کر بولی۔ ''کمینے! مجھے تھانے سے ڈراتا ہے۔ میں خود تھانیدار کی بیٹی ہوں۔ میرے باپ نے تجھ جیسے بڑے خنزیروں کے بوتھے توڑے تھے۔ کبھی سنا ہے ہری سنگھ کا نام۔ تیرے جیسوں کا پیشاب نکل جاتا تھا اسے دیکھ کر۔ اپنے باپ کا ہے تو لے جا مجھے تھانے۔''

جنداں کسی کالے طاقت ور انجن کی طرح سٹارٹ ہو کر جمالے پر چڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں نے بمشکل اسے قابو کیا، وہ ہانپتی اور پھنکارتی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ جمالا بھی خونی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ وہ اپنی چوڑی چکلی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولی۔ ''یہ بات ہے تو ٹھیک ہے میں بیان دوں گی عدالت میں اور ہر جگہ بیان دوں گی کہ نوراں میری منہ بولی دھی تھی اور میں خود اس کی شادی رفیق سے کر رہی تھی۔''

میں نے جنداں کو پُرسکون کرنے کے بعد اس سے پوچھا کہ نوراں کے غائب ہونے کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے؟ وہ کڑک کر بولی۔ ''یہ تیرے ساتھ جو کھڑا ہے اونچی مونچھوں والا، اسی جیسے کسی ڈشکرے سے ڈر کر وہ بھاگی ہوئی تھی۔ وہی لے گیا ہو گا اسے اور اب اپنی مردانگی دکھا رہا ہو گا اور اس بیچاری نے کہاں جانا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''گھر سے وہ خود گئی تھی؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں، دوپہر کا وقت تھا۔ مجھ سے کہنے لگی۔ فیقا آج مجھے کچھ پیسے دے گیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ماں جی کے لئے ایک جوڑا کپڑے کا لے آؤں۔ فیقا کی ماں کو وہ ماں جی کہتی تھی۔ بس جوڑا لینے گھر سے نکلی اور واپس نہیں آئی۔ پتہ نہیں بدنصیب کس کے ہتھے چڑھ گئی۔''

بولنے کے ساتھ ساتھ جنداں گہری نظروں سے جمالے کو بھی گھور رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''یہ ہے کون تیرے ساتھ، مجھے شکل سے ہی کوئی ڈاکو لگتا ہے۔''

جمالا غرایا۔ ''منہ سنبھال مائی کیوں مٹی خراب کرانی ہے۔''

جنداں ایک بار پھر غضب ناک ہو کر اس پر جھپٹی۔ میرے اے ایس آئی نے تقریباً بغل گیر ہو کر اسے قابو کیا اور اندر لے جا کر چارپائی پر بٹھایا۔ جمالا تلملایا ہوا تھا۔ میں اسے لے کر باہر آ گیا۔ اڑوس پڑوس والوں سے کچھ سوالات پوچھنے کے بعد ہم تھانے واپس چلے آئے۔

☆======☆======☆

میں اپنے عملے کے ساتھ گاؤں واپس آ گیا۔ آنے سے پہلے میں نے گلی لگی زئیاں کے مقامی تھانیدار بلدیو سنگھ سے درخواست کی کہ وہ فیقا کے یاروں دوستوں سے پوچھ گچھ کرے اور اگر اس کے بارے میں کچھ پتا چلے تو اطلاع دے۔ اس نے اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا۔ اس کے علاوہ اس نے کہا کہ وہ رفیق کے گھر والوں پر بھی نظر رکھے گا...... گاؤں میں ابھی تک نوراں کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ اللہ وسائی کے گھر سے میرے کھوجی نے چند کھرے اُٹھائے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ ان میں گاؤں کا کھرا کوئی نہیں۔ نمبردار جمالا ایک ہی رٹ لگائے جا رہا تھا کہ نوراں کا اغوا صرف اور صرف رفیق کا کام ہے۔ میں نے کہا۔

''بھائی میرے! ایک طرف تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نوراں کو اپنے دوست کے گھر سے لے کر سیدھے گاؤں آ گئے تھے اور تم نے رفیق سے کوئی جھگڑا نہیں کیا تھا اور نہ ہی یہ پتا چلنے دیا تھا کہ تم نوراں کو کہاں سے لے آئے ہو۔ پھر وہ نوراں کے پیچھے اس گاؤں تک کیسے پہنچا؟''

جمالا میرے اس سوال کا کوئی مناسب جواب نہیں دے سکا۔ اس نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے فیقے نے کسی طرح کھوج لگا لیا ہو۔''

صاف محسوس ہوتا تھا کہ جمالا کچھ چھپا رہا ہے...... اس کے علاوہ بھی کئی معاملات الجھے ہوئے تھے۔ رفیق کے وارثوں کا کہنا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے شہر میں رہ رہی تھی جب کہ جمالے کا بیان کچھ اور کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اللہ وسائی سے کھل کر بات چیت کی۔ اللہ وسائی نے وہی گھسی پٹی کہانی شروع کر دی یعنی ''میری بیٹی تو جی گائے ہے۔ پنج وقت کی نمازن ہے۔ زمین سے نگاہ نہیں اُٹھاتی۔ لوگ صرف اسے بدنام کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

اللہ وسائی کی باتوں سے چڑ کر میں نے کہا۔ ''دیکھ ماسی! زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش

مت کر۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ تُو کتنی بھلی مانس ہے اور تیری بیٹی کتنی اللہ لوک ہے۔ پرچون کی دکان تو صرف بہانہ ہے ورنہ تم دونوں جمالے کا دیا ہوا کھاتی ہو۔ گھر میں بھوری بھینسیں ایسے ہی نہیں بندھ جاتیں۔ نہ ہی نوٹ درختوں پر لگتے ہیں۔“

میری بات پر اللہ وسائی کو چپ لگ گئی۔ کچھ دیر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہی پھر بولی۔ ”تھانیدار جی! میں قسم کھاتی ہوں۔ میں نے کبھی کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ اب وہ نمبردار کا بیٹا ہے میں اسے روک تو نہیں سکتی ناں۔ یہ تو اس کی مہربانی ہے کہ نوراں سے بیاہ کرنا چاہتا ہے نہیں تو چوہدریوں کو کس بات کا ڈر ہوتا ہے۔ اپنی پسند کی شے چھین کر لے جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تُو مانتی ہے کہ تیری بیٹی کے جمالے سے تعلقات تھے؟“

وہ بولی۔ ”بس وہ اسے پسند کرتا تھا۔ شاید اب تک دونوں کی شادی بھی ہو گئی ہوتی۔ اگر وہ مرن جوگا ”لوہار“ بیچ میں نہ آتا۔ میری انمول ہیرے جیسی دھی کو میلے سے اُٹھا کر لے گیا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”لوہار سے تیرا مطلب فیقا ہے؟“

اس نے ہاں میں جواب دیا۔ پھر وہ کتھا شروع کر دی جو میں اس سے پہلے جمالے سے سن چکا تھا۔ اللہ وسائی اور جمالے کا بیان تقریباً ایک تھا اور صاف اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں اندر سے ملے ہوئے ہیں۔

ابھی اللہ وسائی سے میری پوچھ گچھ جاری تھی کہ بلال شاہ آوارد ہوا۔ اس کی آمد کے پیچھے یقیناً کوئی اہم خبر تھی۔ میں اسے شہر چھوڑ کر آیا تھا۔ میں نے مقامی تھانے کے ایس ایچ او بلدیو سنگھ کو بتایا تھا کہ بلال شاہ ایک اچھا مخبر ہے۔ اس سے کام لو اور اس کے ذریعے رفیق کے یاروں دوستوں کی ٹوہ لگاؤ...... آج پانچویں روز بلال شاہ گاؤں واپس آ گیا تھا۔ میں نے اللہ وسائی کو گاؤں میں رہنے کی ہدایت کر کے واپس بھیج دیا اور بلال شاہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ بلال شاہ نے حسبِ معمول تھوڑے سے نخرے دکھانے کے بعد جو کچھ بتایا وہ مختصراً یوں ہے۔

”انسپکٹر بلدیو سنگھ نے رفیق کے یاروں دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے پوچھ گچھ کی تھی۔ اس پوچھ گچھ کے نتیجے میں پتہ چلا کہ رفیق کا ایک بدنام طوائف کے پاس آنا جانا تھا۔ اس طوائف کا نام زری ہے اور اس سے رفیق کے تعلقات کوئی تین مہینے پہلے شروع ہوئے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب نوراں اسے چھوڑ کر جا چکی تھی اور وہ اس کی جدائی میں بے حال پھر

رہا تھا۔ گھر والے بھی اسے قبول نہیں کرتے تھے لہٰذا اس نے آوارگی اختیار کر رکھی تھی۔ ایسے میں اس کا زیادہ وقت زری کے کوٹھے پر یا مشٹنڈوں کی ایک بیٹھک میں گزرتا تھا۔ زری سے اس کے تعلقات اب بھی قائم ہیں اور وہ اکثر وہاں آتا جاتا رہتا ہے......“

بلال شاہ نے میرے شوق کو تیز کرنے کے لئے سگریٹ کے دو گہرے کش لئے اور اطمینان سے بولا۔ ”انسپکٹر بلدیو سنگھ نے مجھے گاہک بنا کر زری کے کوٹھے پر بھیج دیا...... اب میں چار دن سے مسلسل وہاں جا رہا ہوں۔ انسپکٹر بلدیو کا خیال ہے کہ فیقا جہاں کہیں بھی ہے زری کے پاس ضرور آئے گا۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ فیقا جہاں کہیں بھی ہے زری کے پاس ضرور آئے گا۔ وہ بڑے ٹھسکے دار عورت ہے۔ بندہ ایک دفعہ اس کے جال میں پھنس کر نکل نہیں سکتا۔ مجھے تو اپنا خطرہ پیدا ہونے لگا ہے۔ کہیں شیطان دل میں کوئی الٹا سیدھا خیال نہ ڈال دے۔ میری بیوی تو ایسی ولی اللہ ہے کہ چہرے سے دل کا حال جان لیتی ہے۔ اسے پتہ چل جائے کہ مجھ پر کسی طوائف کا سایہ بھی پڑا ہے تو فوراً رنڈوا کر دے مجھے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بلال شاہ تُو عورت پروف ہے مجھے پتہ ہے تیرے دل میں کوئی الٹا سیدھا خیال نہیں آئے گا۔ ویسے خبر تُو بڑی پتے کی لایا ہے۔ اب کیا خیال ہے تیرا۔ اس عورت کی نگرانی جاری رہنی چاہیے یا نہیں؟“

بلال شاہ نے ٹانگ پر ٹانگ جما کر ایک اور گہرا سوٹا لگایا۔ ”خان صاحب! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، کہیں تو پورا سال تماش بین بنا رہتا ہوں۔ مگر مجھے لگتا نہیں کہ یہ ترکیب کامیاب ہو گی۔ فیقا نوراں کی جدائی میں پریشان ہو کر زری کے پاس آتا تھا۔ اب اگر اس نے واقعی نوراں اغوا کر لی ہے تو اس کی دل پشوری کا انتظام تو ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وقتی طور پر زری کو بھول جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی اُدھر کا رخ ہی نہ کرے۔“

میں نے کہا۔ ”پھر کیا ارادہ ہے۔ اس رنگیلی کو ذرا اپنی تھانیداری دکھائی جائے۔“

”ہاں...... اس کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا“ بلال شاہ نے کہا۔ ”یقیناً وہ فیقا کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہو گی مگر چالاک عورت ہے سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔“

میں نے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے، وہاں سے بلدیو سنگھ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ وہ خود ہی ڈرا دھمکا کر پوچھ لے گا اس سے۔“

”نہیں خان صاحب! میرا خیال ہے آپ خود ہی چلیں۔ بات بگڑی تو سنبھال لیں گے۔“

”کیا مطلب؟“

وہ کھسیانا ہو کر اصل بات بتاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل اُدھر تھوڑا سا پھڈا ہو گیا ہے۔ میں نے اس خبیث طوائف سے کہا کہ ذرا علیحدہ کمرے میں چلو میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ پہلے تو راضی ہی نہیں ہوئی۔ پھر بڑے نخرے سے اندر گئی۔ میں نے کہا۔ ''میرا ایک دوست رفیق ہے یہاں سائیکل فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ سنا ہے وہ تمہارے پاس آتا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں پوچھنا تھا۔''

وہ بڑی بدتمیزی سے بولی۔ ''میں نے تماش بینوں کا رجسٹر نہیں رکھا ہوا۔ تیرے جیسے کئی شریف آتے جاتے ہیں۔''

مجھے اس منہ پھٹ پر بہت غصہ آیا۔ میں نے کہا۔ ''ذرا ہوش سے بات کر۔''

وہ غرا کر بولی۔ ''رعب تو ایسے جھاڑتا ہے جیسے تھانیدار ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تھانیدار سے کم بھی نہیں ہوں۔ زیادہ ٹیڑھا ہو کر دکھائے گی تو سیدھا کر دوں گا۔''

اس نے مجھے گالی دے ڈالی اور بولی۔ ''تو ہے کس باغ کی مولی۔''

اب بلال شاہ کی ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ انسپکٹر بلدیو نے اسے صرف نگرانی کے لئے طوائف کے کوٹھے پر بھیجا تھا لیکن بلال شاہ صاحب اپنی طبیعت پر قابو نہ رکھ سکے اور تھانیدار بن کر اس سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ وہ عورت بھی کافی ٹیڑھی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بلال شاہ کو آڑے ہاتھوں لیا تو بلال شاہ غصہ کھا کر یہاں چلا آیا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا۔

''شاہ جی! یہ کام تم نے خراب کیا ہے۔ یا تو اس طوائف کے سامنے فیقا کا نام ہی نہیں لینا تھا۔ اگر لیا تھا تو پھر کوئی نتیجہ نکال کے آنا تھا۔ وہ عورت یقیناً شک میں پڑ گئی ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ اس طرح فیقا ہم سے اور دور ہو جائے۔''

بلال شاہ اپنا منکا سا سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا۔ ''خیر جو بھی ہوا، اب فوری طور پر اس عورت سے دو دو ہاتھ کرنے ہوں گے۔ تم جا کر ذرا نمبردار کی جیپ مانگ لاؤ۔ کہنا امرتسر جانا ہے۔ میں اتنی دیر میں تیار ہو جاتا ہوں۔''

بلال شاہ کے چہرے پر جوش نظر آنے لگا۔ بولا۔ ''ٹھیک ہے خان صاحب...... لیکن ایک بات کہنا چاہتا ہوں، اس خبیث کے سامنے میرا مطلب ہے زری کے سامنے مجھے ذرا عزت سے بلائیں۔ بس ایسا لگے کہ ہم دونوں ہی تھانیدار ہیں۔ کم بخت مجھ سے پوچھ رہی تھی کس باغ کی مولی ہو؟ بڑی بدزبان عورت ہے۔ مجھے تو بےعزت کر کے رکھ دیا ہے اس

نے۔''

میں نے بلال شاہ کو تسلی دی۔ وہ جیپ لینے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم کچے پکے راستے پر سفر کرتے شہر کی طرف جا رہے تھے۔

☆======☆======☆

زری نامی اس طوائف کے گھر خاصا تماشا ہو گیا۔ ہم شام کے وقت وہاں پہنچے تھے۔ میں وردی میں تھا، میرے ساتھ بلال شاہ کے علاوہ ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ ہم اوپر پہنچے تو ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ سفید چادر پر ایک تیس بتیس سالہ طوائف رقص کر رہی تھی اور آٹھ دس تماشائی داد دینے میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھ کر طوائف نے قدم روکے اور ساز بھی چپ ہو گئے۔ چوڑی پاجامے والی ایک بوڑھی نائیکہ نے آگے بڑھ کر ہماری غرض پوچھی۔ بلال شاہ اکڑا ہوا اور پھولا ہوا میرے ساتھ تھا۔ گرج کر نائیکہ سے بولا۔

''اب کیوں بکری کی طرح مَیں مَیں کر رہی ہو۔ اسی طرح ہاتھ نچا کر بولو۔''

نائیکہ ڈری ہوئی تھی۔ طوائف جو یقیناً زری تھی اب ہمارے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی کافی سہمی ہوئی تھی وہ خاصی اونچی لمبی اور پُرکشش عورت تھی۔ بلکہ ذرا سی گنجائش کے ساتھ اسے لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی جاذبیت تھی۔ عام طور پر اس درجے کی طوائفوں میں یہ چیز دیکھنے میں نہیں آتی۔ بلال شاہ نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

''اب کیوں منہ میں گھونگھیاں ڈالے کھڑی ہو۔ پوچھو گی نہیں کس باغ کی مولی ہے؟''

زری گھبراہٹ سے بولی۔ ''معاف کر دیں جی۔ غلطی ہو گئی ہمیں کیا پتہ تھا؟''

وہ اپنے لہجے سے سمجھدار لگتی تھی۔ اتنی منہ پھٹ بھی نہیں تھی جتنی بلال شاہ نے مشہور کر دی تھی۔ یقیناً اس جھگڑے میں کچھ قصور بلال شاہ کا بھی ہوگا۔ میں اس کی شیخی خوری اچھی طرح جانتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! کیا خیال ہے انہیں تھانے لے جانا ہے یا یہیں پوچھ گچھ کرنی ہے؟''

''تھانے لے جاؤ جی۔'' بلال شاہ خطرناک لہجے میں بولا ''یہاں ہماری بات کس کی سمجھ میں آنی ہے۔''

بوڑھی نائیکہ نے بلال شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''نہیں تھانیدار صاحب! ہماری بڑی بدنامی ہوگی۔ آپ نے جو پوچھنا ہے یہیں پوچھ لیں۔ ہم کچھ نہیں چھپائیں گے۔''

بلال شاہ بالکل اکڑا ہوا تھا۔ اس کی گردن ڈپٹی کمشنر کی طرح تنی ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔

''نہیں جی۔ اب تو ان دونوں کو تھانے ہی جانا ہوگا۔''

نائیکہ اور اس کے خیر خواہ منت سماجت کرنے لگے۔ بلال شاہ کی ہوا اور بھی اونچی ہوگئی۔ اتنے میں ایک موٹا مشٹنڈا شخص پیچھے سے آیا اور اس نے بلال شاہ کی گردن پر ایسا مکہ مارا کہ وہ اوندھا گرتا گرتا بچا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی آواز آئی۔ ''پکڑو ان کو، جعلی پولیس والے ہیں۔'' ایک شخص نے عقب سے مجھے دبوچ لیا اور اُٹھا کر پٹخنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر میں نے سنبھالا لیا اور خود سے لپٹنے والے شخص کو گھما کر ایک گول ستون سے دے مارا۔ اس وقت میں نے بلال شاہ کو ایک سازندے کی ٹکر کھا کر صوفے پر گرتے دیکھا۔ مجھے سچ مچ تاؤ آ گیا۔ میں نے تیزی سے ہاتھ پاؤں چلائے اور اپنے سامنے کے دو غنڈوں کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ ایک شخص میرے ہولسٹر سے ریوالور کھینچنے کے لئے جھپٹا لیکن ریوالور اس سے پہلے ہی میرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب شور وغل سن کر گلی سے دو پولیس والے بھاگتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ ان میں ایک حوالدار تھا۔ بلدیو سنگھ کے تھانے میں اس سے ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ دیکھتے ہی مجھے پہچان گیا۔ اس نے نائیکہ اور اس کے ملازموں کو بے دریغ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ان سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ اب سچ مچ ان کی کم بختی آ گئی ہے۔ انہوں نے اصل کو نقل سمجھ کر خود کے لئے زبردست مصیبت کھڑی کر لی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ساری گڑبڑ بلال شاہ کے ایک واقف کار کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ ایک چھابڑی فروش تھا اور بلال شاہ کو شکل سے پہچانتا تھا۔ بلال شاہ کی بڑھکیں سن کر کچھ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی گلی سے کوٹھے پر آ گیا۔ اس نے سارا ماجرا دیکھا تو ایک ایجنٹ سے چپکے سے کہہ دیا کہ یہ تھانیدار نہیں یہ تو دو سال پہلے دربار صاحب کے قریب بادام اخروٹ بیچتا تھا۔ بس ان لوگوں کے لئے یہی اشارہ کافی ثابت ہوا اور وہ ہم سے بھڑ گئے۔ بلال شاہ کی ایک آنکھ بھی نیلی ہو چکی تھی۔ قمیص کا کندھا بھی اُدھڑ گیا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ آدمی کو زیادہ جھکنا چاہیے اور نہ زیادہ اکڑنا۔ بہر حال اس مارکٹائی کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ نائیکہ، رقاصہ زری اور ان کے ساتھی بُری طرح گھبرا گئے اور جب کچھ دیر بعد ہم نے نائیکہ اور زری سے علیحدہ کمرے میں پوچھ گچھ کی تو انہوں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ میں نے زری سے تنہائی میں بھی کچھ دیر بات چیت کی۔ اس بات چیت کے نتیجے میں رقاصہ زری نے اعتراف کیا کہ وہ رفیق عرف فیقے کو اچھی طرح جانتی ہے اور وہ دو ہفتے پہلے تک اس کے پاس آتا رہا ہے۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''فیقے سے میری پہلی ملاقات آج سے کوئی چار ماہ پہلے ہوئی تھی۔ وہ بھی دوسرے تماشائیوں کی طرح گانا سننے آیا تھا اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ گانے کے دوران اچانک اسے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ چلاتا ہوا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے مجھے نیچے گرا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی جگہوں سے میرا لباس پھاڑ دیا۔ میں اس اچانک افتاد پر رونے چلانے لگی۔ کمرے میں موجود لوگوں نے مجھے بمشکل اس کے چنگل سے بچایا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا اور مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ ہمارے بندوں نے اسے بُری طرح مارا۔ وہ اسے سیڑھیوں سے نیچے پھینک دینا چاہتے تھے لیکن مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے۔ ہوش وحواس میں کوئی ایسی حرکت کب کرتا ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اُس کی اس حرکت کے پیچھے کوئی دکھی کہانی ہے۔ میں نے نہ صرف اسے بچا لیا بلکہ مرہم پٹی بھی کروائی۔ اس کا لباس پھٹ چکا تھا۔ اسے نیا لباس دیا۔ وہ دو دن ہمارے گھر رہا۔ پھر اکثر یہاں آنے لگا۔ اس کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ وہ کسی لڑکی سے بے پناہ محبت کرتا تھا، اس کا نام لے لے کر جیتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بے وفا نکلی اور شادی سے چند روز پہلے اسے دھوکہ دے کر کہیں چلی گئی۔ مجھے فیقا کی حالت پر بڑا رحم آتا تھا۔ وہ عام عاشقوں سے مختلف تھا۔ اس کی چوٹ بھی کافی گہری محسوس ہوتی تھی۔ محبوبہ کی بے وفائی کسی پل اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ محبت میں ناکامی کے بعد اسے دنیا کی ہر عورت سے نفرت ہو چکی تھی۔ میں بڑا بول نہیں بولتی لیکن یہ سچ ہے کہ اگر اُن دنوں میں اسے سنبھالا نہ دیتی تو وہ ضرور خونی بن جاتا اور اس کے ہاتھوں سب سے پہلے کسی عورت کا ہی خون ہوتا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جو وارثوں سے بچھڑ کر بھرے میلے میں کھو گیا ہو۔

میرے پاس کبھی کبھار سردار پور گاؤں کا نمبردار چوہدری جمال آیا کرتا ہے۔ کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے ایک شام وہ آیا تو فیقا نشے میں دُھت میری ڈیوڑھی میں پڑا تھا۔ نشے میں وہ بار بار نوراں کا نام پکار رہا تھا اور اُلٹے سیدھے شعر پڑھ رہا تھا۔ نوراں کا نام سن کر چوہدری جمال ٹھٹک گیا۔ اس نے فیقا سے پوچھا کہ وہ کس نوراں کی بات کر رہا ہے۔ فیقا ترنگ میں اسے اپنی کہانی سنانے بیٹھ گیا۔ فیقا کی باتیں سنتے ہوئے جمال کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی نوراں کو جانتا ہے۔ جوش میں اس نے فیقا کا گریبان پکڑ لیا اور اسے جوتوں سے مارنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ چیختا جا رہا تھا۔ ''خبردار! اپنی گندی زبان سے نوراں کا نام لیا تو، خبردار اگر اس کے بارے میں کچھ کہا تو۔'' اس نے فیقا

کو بُری طرح مارا اور غصے میں بھنایا ہوا کوٹھے سے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ اب تک دوبارہ یہاں نہیں آیا۔ صرف دس پندرہ روز پہلے اس کا ایک خاص آدمی میرے پاس پہنچا تھا۔ وہ تنہائی میں مجھ سے ملا اور کہنے لگا کہ چوہدری جمال چاہتا ہے کہ اسے نوراں اور فیقا کے تعلقات کے بارے زیادہ سے زیادہ پتہ چلے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں فیقا سے اس بات کی ٹوہ لوں کہ نوراں اس تک کیسے آئی تھی اور ان دونوں کا معاملہ کہاں تک پہنچا تھا۔ یعنی کرائے کے مکان میں وہ دونوں ''میاں بیوی'' کی طرح رہ رہے تھے یا کسی اور طرح۔ میں نے جمالے کے آدمی سے صاف کہہ دیا کہ میں ایسے کام نہیں کیا کرتی اور میرے لئے ہر گاہک ایک جیسا ہے۔ جمالے کا آدمی ناراض ہو کر واپس چلا گیا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد فیقا نے بھی میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ اب مجھے اس کے بارے کچھ پتہ نہیں۔''

زری کی روئیداد بے حد اہم تھی۔ اس نے جمال عرف جمالے کا نام لے کر میری بہت سی مشکلیں آسان کر دی تھیں۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ فیقا نے زری کے پاس آنا کیوں چھوڑ دیا ہے اور وہ کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ میں اپنے طور پر واقعات کا ایک خاکہ سا بنا سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ جمالے کے رویے نے فیقے کو شک میں ڈال دیا ہوگا۔ جمالے سے مار کھانے کے بعد اس نے ٹھنڈے دل سے سوچا ہوگا کہ جمالا نوراں کے نام سے اتنا کیوں چڑا ہے؟ اور نوراں سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس نے کسی طرح کھوج لگا لیا ہوگا کہ جمالا کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ زری بائی کے کسی آدمی نے اسے جمالے کے سارے کوائف بتا دیئے ہوں۔ (بعدازاں میرا یہ قیافہ درست نکلا۔ فیقا کو جمالے کا پتہ ٹھکانہ بتانے والا ایک ستار نواز، شریف خان کالیہ تھا) کوائف معلوم کرنے کے بعد فیقا اپنی بے وفا محبوبہ کو ڈھونڈتا پوچھتا چوہدری جمالے کے علاقے میں جا پہنچا۔ یہاں قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ اسے ایک دو ساتھی مل گئے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ شہر سے ہی چار آوارہ گرد لے گیا ہو۔ یہ لوگ گھات لگا کر اللہ وسائی کے مکان کے پچھواڑے بیٹھ گئے اور موقع ملتے ہی نوراں کو لے اُڑے...... اب مجھے یہ سمجھ بھی آ رہی تھی کہ جمالا اتنے یقین سے فیقا کو اغوا کا مجرم کیوں ٹھہرا رہا تھا۔ درحقیقت وہ ایک فاش غلطی کر چکا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے بھی کہ فیقا نوراں کا عاشق نامراد ہے اور اس کی دید کے لئے بُری طرح تڑپ رہا ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اس سے ٹکر لی اور اسے مار پیٹ کر اپنے پیچھے لگا لیا۔ اگر وہ زری کے بالاخانے میں جوش کھا کر فیقا سے نہ الجھتا تو شاید فیقا کبھی نوراں تک نہ پہنچ سکتا۔

☆======☆======☆

میں سردار پورا اپنے تھانے میں موجود تھا کہ چوہدری جمال آ دھمکا۔

''ہاں جی...... تھانیدار صاحب کچھ پتہ چلا؟''

''نہیں۔'' میں نے رُکھائی سے کہا اور ایک فائل پر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

جمالے کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کیا بات ہے نواز صاحب! آپ کچھ اوازار سے لگ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اوازار تو نہیں، تم بتاؤ کیا کام ہے؟''

وہ بولا۔ ''سرکار! آج پندرہ دن ہو گئے ہیں، آخر کب پتہ چلائیں گے آپ مجرم کا؟''

میں نے کہا۔ ''تو پندرہ دن کی بات کر رہا ہے، پندرہ سال میں بھی کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود ہی ڈھونڈ لو لڑکی کو بھی اور اُٹھانے والوں کو بھی۔ تمہیں شوق بھی ہے نئے نئے پھڈے ڈالنے کا۔''

وہ سمجھ گیا کہ میرا موڈ اگر خراب ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ فوراً چاپلوسی پر اُتر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ فیقا غائب ہے اور اسے پولیس ہی ڈھونڈ سکتی ہے۔ گاؤں کا معاملہ ہوتا تو شاید وہ سنبھال لیتا لیکن فیقا لڑکی کو شہر لے گیا تھا تو وہاں اس کی نمبرداری کیا کر سکتی تھی۔ اس کی چاپلوسی کے جواب میں مَیں نے اپنا خشک رویہ برقرار رکھا۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ منت ساجت کرنے لگا۔ میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''جمالے! یا تو مجھے سب کچھ صاف صاف بتاؤ، یا پھر آرام سے حویلی میں بیٹھو۔ جب پتہ چل جائے گا نوراں کا تمہیں بتا دوں گا۔''

وہ کہنے لگا۔ ''میں نے آپ سے کیا چھپایا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تم نے چھپایا ہی نہیں، جھوٹ بھی بولا ہے اور اب بھی بول رہے ہو۔''

پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ رقاصہ زری کے کوٹھے سے مجھے کیا کچھ معلوم ہوا ہے اور دوسرے لوگوں کے بیانات سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ میں نے اس سے صاف کہا کہ مجھے شک ہے کہ نوراں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ نہیں آئی تھی بلکہ وہ اسے مجبور کر کے لایا تھا۔

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن نشانے پر لگا۔ میرے اندازے نے جمالے کو سمجھا دیا کہ میں کافی کچھ جانتا ہوں۔ وہ کچھ ڈانواں ڈول سا نظر آنے لگا۔ میں نے لوہا گرم دیکھا تو ایک اور ضرب لگائی۔

''اگر تم کہو تو میں نوراں کی اس سہیلی کو سامنے لے آؤں...... جس نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔''

وہ دانت پیس کر بولا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ یہ سب اسی اصغری کا کام ہے۔''

میں اصغری نامی اس لڑکی کو جانتا تک نہیں تھا۔ پوچھ گچھ تو دور کی بات ہے۔ بہر حال جمالا اپنی بیوقوفی سے خود بخود جال میں آرہا تھا۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''جمالے لیکن ایک بات دھیان میں رہے۔ تم نے اصغری کے ساتھ کوئی اونچ نیچ کی تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔ پھر بات بڑی دور تک جائے گی۔''

جمالا ایک کڑوا سا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی جیسے مجھے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکرادا کرنے لگا کہ ایک راستہ آپوں آپ سیدھا ہوگیا ہے۔ جمالے نے کہا۔

''خان صاحب! یہ سچ ہے کہ نوراں، فیقا کے گھر سے بھاگ کر نہیں آئی تھی لیکن یہ بھی غلط ہے کہ میں اسے زبردستی لایا تھا۔ میں ایک تاریخ بھگتنے شہر گیا ہوا تھا۔ کچہری سے فارغ ہو کر میں کچھ چیزیں خریدنے کے لئے بازار چلا گیا۔ وہیں میں نے نوراں کو دیکھا۔ وہ ایک دکان سے زنانہ کپڑا خرید رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ ہم حیران پریشان اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے۔ میرے دماغ میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس جگہ اس طرح نوراں سے ملاقات ہوجائے گی۔ وہ سکتے میں تھی۔ میں اسے ساتھ لے کر ایک باغیچے میں چلا گیا۔ وہاں ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے۔ نوراں نے مجھے بتایا کہ وہ رفیق نامی ایک شخص کے پاس پھنس گئی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے نوراں کے تمام حالات سننے کے بعد اسے سمجھایا بجھایا اور وہ وہیں سے میرے ساتھ جانے پر راضی ہوگئی۔ میں اسے لے کر گاؤں آگیا۔ وہ جیسی بھی تھی میں اس سے شادی کرنے پر تیار تھا لیکن اسی دوران زری کے گھر اتفاقاً میری مڈبھیڑ فیقا سے ہوگئی۔ اس کے نام سے نوراں کا نام سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ہمارے درمیان جھگڑا ہوگیا اور میں خاموشی سے گاؤں واپس آگیا۔ اس کے بعد میں کبھی شہر نہیں گیا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔

کتے کا بچہ رفیق مجھے پوچھتا پاچھتا گاؤں پہنچ گیا۔ یہاں ایک روز اتفاق سے میں نے اسے دیکھ لیا۔ مجھ سے غلطی ہوئی میں نے تھانے میں اطلاع نہیں دی۔ میں نے اپنے بندوں سے کہا کہ اس کی تھوڑی سی ٹھکائی کردیں تاکہ وہ ڈر کر یہاں سے چلا جائے۔ میرے بندوں نے میرے کہنے پر عمل کیا لیکن وہ بڑا ڈھیٹ ثابت ہوا۔ کوئی سبق حاصل کرنے کی بجائے اس نے دو ہی روز بعد نوراں کو گھر سے اغوا کرلیا....''

میرے ذہن میں اچانک دھماکے سے ہونے لگے۔ نگاہوں میں وہ منظر گھومنے لگا جب

بلال شاہ ہانپتا ہوا مجھے اطلاع دے رہا تھا کہ گنے کے کھیت میں ایک آدھ مرا شخص پڑا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں بعد میں جب میں دو سپاہیوں کے ساتھ موقعے پر پہنچا تھا تو زخمی غائب تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہی شخص فیقا تھا جسے جمالے نے اپنے بقول ''تھوڑی سی ٹھکائی'' کروا کے وہاں پھینکا تھا۔ میں نے جمالے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جمالے! یہ واقعہ نوراں کے اغوا سے دو روز پہلے کا ہے ناں؟'' اس نے ہاں میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''اور تیرے بندوں نے فیقا کو مار پیٹ کر حاجی رحمت کے کھیت میں پھینکا تھا۔''

وہ بولا۔ ''ہاں...... ہاں شاید وہیں پھینکا تھا۔''

میں گہری نظروں سے جمالے کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کا صحت مند چہرہ کئی رنگ بدل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بہت افسوس کی بات ہے نمبردار۔ تُو اب بھی جھوٹ بول رہا ہے...... تیرے بندوں نے فیقا کی جو ''تھوڑی سی ٹھکائی'' کی تھی وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہت مشکل ہے کہ وہ زندہ بچا ہو۔ اگر بچ بھی گیا ہو تو ایک مہینے تک بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں تھا......''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' جمالے نے پوچھا۔

''میں کیا کہوں گا؟ میں تو حیران ہوں کہ فیقا جو تمہاری مہربانی سے جان لیوا طور پر زخمی ہو چکا تھا تیسرے ہی روز نوراں کو اغوا کرنے کیسے پہنچ گیا۔''

جمالے کے چہرے پر اب ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ صفائی پیش کرنے کے لئے بولا۔ ''آپ سے کس نے کہا ہے کہ فیقا شدید زخمی تھا؟''

میں نے انگلی اُٹھا کر کہا۔ ''جمالے! اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں تمہارا بہت لحاظ کر رہا ہوں۔ یہ نہ ہو مجھے غصہ آجائے اور کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے۔ بہتر ہے یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔''

جمالے نے بڑی مشکل سے میرے لہجے کو برداشت کیا اور دیوار پر تھوکتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ کیا چکر تھا، کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ جمالا بار بار جھوٹ بول رہا تھا اور اب مجھے اس پر بالکل اعتبار نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف یہ بات بھی ظاہر تھی کہ نوراں اغوا ہوئی ہے۔ یہ کس کا کام تھا؟ فیقا کا کوئی ساتھی تو اب تک سامنے ہی نہیں آیا تھا کہ جس پر شبہ کیا جاتا۔ عین ممکن تھا

کہ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہو۔ فیقا اور جمالے کے علاوہ بھی نوراں کا کوئی چاہنے والا ہوسکتا تھا...... میں انہی سوچوں میں گم تھا۔ اب یہ بات قارئین بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ جمالے نے مجھ سے زری بائی کے کوٹھے پر پیش آنے والا واقعہ کیوں چھپایا تھا؟ درحقیقت اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر فیقا کو بُری طرح مارا تھا شاید وہ اپنی طرف سے اسے قتل ہی کر آئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجھ پر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ فیقا کو شکل سے جانتا تک نہیں۔ اب پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب جمالے کو معلوم تھا کہ فیقا اس کے ہاتھوں شدید زخمی ہو چکا ہے اور وہ نوراں کو اغوا نہیں کرسکتا تو پھر وہ مجھے غلط راستے پر کیوں ڈال رہا تھا۔ بار بار یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ مجرم فیقا ہی ہے۔ کیا اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ نوراں واپس مل جائے...... اصل بات یہ تھی کہ جمالے کو خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ہوا ہے۔ زخمی رفیق کا یوں اچانک موقعہ واردات سے غائب ہوجانا اسے الجھن میں ڈال رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ہوسکتا ہے فیقا اتنا زخمی نہ ہوا ہو جتنا انہوں نے سمجھا تھا یا اس کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں جو اسے اُٹھا کر لے گئے ہوں اور انہوں نے ہی بعد میں نوراں کو اغوا کرلیا ہو۔ کیونکہ فیقا اس کا رقیب تھا اس لئے وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ نوراں کے اغوا میں اس کی بجائے کسی اور کا ہاتھ ہے۔ اس کی عقل گھوم پھر کر فیقا ہی کی طرف جارہی تھی۔

یہ اسی روز شام کا واقعہ ہے۔ میں تھانے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ اچانک کہیں قریب سے شور سنائی دیا۔ شاید کوئی جھگڑا ہورہا تھا۔ اتنے میں ایک سنتری بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے آواز دی کہ کسی نے نوراں کے بھائی سدو کو چھری ماردی ہے وہ گلی میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ میں بھاگم بھاگ موقعہ پر پہنچا۔ وقوعہ تھانے سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور مجھے مجرم کی دیدہ دلیری پر حیرانی ہورہی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو سدو کو چارپائی پر ڈالا جارہا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اسے ہسپتال پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ وہ آخری دموں پر تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چند ہچکیاں لیں اور راہئ عدم ہوگیا۔ گلی میں کہرام مچ گیا ایک عورت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ سدو کو مارنے والا راجپال سنگھ ہے۔ راجپال سنگھ کا نام سنتے ہی میرے دماغ میں خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بجنے لگیں۔ راجپال علاقے کا مشہور غنڈہ تھا اسے چوہدری شیر علی کا پالتو کتا بھی کہا جاتا تھا اور چوہدری شیر علی اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ وہاں پر موجود ایک دوسرے شخص نے روتے ہوئے بتایا۔

''میں سب کچھ دیکھ رہا تھا جی۔ سدو مجھ سے پرانے کاغذوں کے بدلے کھیلاں پتیسے

لے کر کھا رہا تھا۔ راجپال سنگھ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اچانک سدو کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ بھاگ کر راجپال سنگھ پر جا پڑا۔ اس نے راجپال کا جوڑا مٹھیوں میں جکڑ لیا اور اسے نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا۔ ''نوراں نوراں۔'' راجپال بہت زیادہ گھبرا گیا اور بھاگنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا مگر سدو اسے جونک کی طرح چمٹ گیا وہ بار بار دانتوں سے اسے کاٹ بھی رہا تھا۔ راجپال کو جب اپنی جان چھوٹتی نظر نہ آئی تو اس نے چھری نکال لی۔ اس نے سدو کو چھری سے ڈرایا مگر جب اس نے اسے چھوڑا نہیں تو اس نے چھری ماردی۔ سخت زخمی ہوکر بھی سدو اس کے ساتھ ساتھ گھسٹتا رہا...... یہ دیکھئے خون کے نشانات۔'' چھابڑی فروش نے مجھے زمین پر خون کے دھبے اور پاؤں گھسٹنے کے نشان دکھائے۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور بولا۔ ''وہاں اس نکڑ پر جاکر سدو گر گیا اور راجپال سنگھ کھیتوں کی طرف بھاگ گیا۔''

موقعے پر موجود ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سب افسردہ تھے۔ وہ بھی جنہوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ بھی جو میری طرح دیر سے پہنچے تھے۔ ایک مخبوط الحواس لیکن باہمت نوجوان نے وہ کام کیا تھا جو ہم سب مل کر نہیں کرسکتے تھے۔ اس نے اپنی عزت کے قاتل کی نشاندہی کردی تھی۔ اس شخص کا پتہ بتادیا تھا جو اس رات اس کی بہن کو اغوا کرنے والوں میں شامل تھا۔ وہ سیدھا سادا شخص بڑی سادگی سے اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے نوراں اور اس کی ماں پر بے پناہ طیش آیا اور ان سب بے راہ رو عورتوں پر طیش آیا جن کی غلطیاں ان کے بھائیوں، باپوں اور بیٹوں کی غیرت کا امتحان لیتی ہیں۔ انہیں دشمنی کی آگ میں جھونکتی ہیں اور جان لٹانے پر مجبور کرتی ہیں۔

اگر راجپال سنگھ نوراں کے اغوا میں ملوث تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا یہ سارا کیا دھرا چوہدری شیر علی کا ہے۔ اچانک میرے ذہن میں دھماکہ سا ہوا۔ اگر چوہدری شیر علی نے نوراں کو اغوا کرایا تھا تو یہ نہایت خطرناک بات تھی۔ چوہدری شیر علی اور نمبردار شاہ دین کے گھرانوں میں بہت پرانی دشمنی چلی آرہی تھی۔ دونوں طرف سے کئی افراد ہلاک اور درجنوں زخمی و معذور ہوچکے تھے۔ اب پچھلے چند سالوں سے دشمنی کی یہ آگ کچھ ٹھنڈی پڑی ہوئی تھی۔ دونوں پارٹیوں نے با اثر افراد کے سمجھانے بجھانے پر یہ خاموشی اختیار کررکھی تھی لیکن اب یہ خاموشی ایک خوفناک دھماکے سے ٹوٹ سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے فوراً بڑے نمبردار یعنی جمالے کے باپ شاہ دین سے ملنا چاہیے۔ میں نے اے ایس آئی فرزند علی کو لاش کے پاس چھوڑا اور تیز قدموں سے نمبرداروں کی حویلی کی طرف بڑھا۔ ابھی میں حویلی سے سو گز دور تھا کہ

پندرہ بیس مسلح گھڑ سوار حویلی کے پھاٹک سے برآمد ہوئے اور سرپٹ گھوڑے دوڑاتے کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ ان گھڑسواروں میں سب سے آگے جمالا تھا۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا کہ یہ لوگ خطرناک ارادے سے چوہدری شیر علی کے گاؤں جا رہے ہیں۔ میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ آنکھوں میں قتل و غارت کے مناظر گھومنے لگے۔ میں انہی قدموں پر واپس گھوما اور قریباً بھاگتا ہوا تھانے پہنچا۔ نہایت تیزی سے میں نے عملے کو تیار کیا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم نمبردار جمالے کے پیچھے روانہ ہوئے۔ ابھی ہم گاؤں سے نکل ہی رہے تھے کہ میں نے بلال شاہ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ سرپٹ بھاگا چلا آ رہا تھا اور ہمیں روکنے کے لئے اپنا صافہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ہم لوگ رک گئے۔ بلال شاہ قریب آ کر مجھے ایک طرف لے گیا اور نہایت سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''خان صاحب! کہاں جا رہے ہیں؟''

''چوہدری شیر علی کی طرف۔''

''آپ کا خیال غلط ہے۔ جمالا چوہدری شیر علی کی طرف نہیں گیا۔''

''تو پھر کدھر گیا ہے؟''

''امرتسر کی طرف۔ گلی ککے زئیاں سے فیقا کی بہنوں کو اغوا کرنے کے لئے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں قریباً چلا پڑا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ''میں نے نمبردار کی حویلی میں سب کچھ سن لیا ہے۔ نمبرداروں کا خیال ہے کہ چوہدری شیر علی نے نوراں کو فیقا کے لئے اغوا کرایا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے بے پناہ حیرت سے پوچھا۔ ''فیقے اور شیر علی کا کیا تعلق؟''

وہ بولا۔ ''نمبرداروں کو شک ہے کہ زخمی فیقا کو کھیتوں سے اُٹھانے والے چوہدری شیر علی کے آدمی تھے۔ اب وہ ان کے پاس ہے اور وہ اس کی خیر خواہی میں انہوں نے نوراں کو اغوا کیا ہے۔''

میرے دل و دماغ میں حشر برپا تھا۔ کانوں میں ان دو بے گناہ لڑکیوں کی چیخیں گونج رہی تھیں جن کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جو بے رحم سفاک ہاتھوں میں پہنچ کر دشمنی کی آگ میں بھسم ہونے والی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میری وردی آگ کی طرح تپ رہی ہے۔

میری وردی مجھ پر ایک بہت بھاری ذمے داری ڈال رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ دو لڑکیوں کی عزت جاتی...... دو پھول پتی پتی ہو کر بکھر جاتے مجھے ان کو بچانا تھا۔ میں نے بلال

شاہ کو اپنے ساتھ لیا اور رخ پھیر کر پوری رفتار سے امرتسر شہر کی طرف بڑھا۔ قریباً دو فرلانگ آگے جا کر مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر اغوا شدہ نوراں چوہدری شیر علی کی حویلی میں تھی تو اس کا کچھ کرنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ چوہدری شیر علی ہماری واپسی سے پہلے پہلے اسے کہیں غائب کر دے۔ میں نے گھوڑا روک کر بلال شاہ کو واپس گاؤں جانے کی ہدایت کی اور اس کے ذریعے اپنے اے ایس آئی فرزند علی کو حکم دیا کہ وہ سدو کی لاش سنبھال کر فوراً شیر علی کی حویلی کا رخ کرے اور اس سے نوراں کے بارے میں پوچھ گچھ کرے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے اپنے گھوڑے ایک بار پھر امرتسر کی طرف بھگا دیئے۔

پہلے کچے اور پھر پکے راستے پر سفر کرتے ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں امرتسر کے اندر داخل ہو گئے۔ محلے ککے زئیاں پہنچے تو ایک گلی سے پولیس کی جیپ نکلتی نظر آئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر انسپکٹر بلدیو سنگھ بیٹھا تھا۔ ہمیں گھوڑوں پر سوار دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ میرے گھوڑے کے قریب پہنچ کر اس نے بریک لگائے۔ بلدیو سنگھ کا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

''کہاں جا رہے ہو بلدیو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے تیزی سے کہا۔ ''نواز خان! اس حرام زادے عبدالکریم کی کڑی اغوا ہو گئی ہے۔ کوئی دس منٹ پہلے کی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے گاؤں کے نمبردار کا کام ہے۔ اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔''

میں نے فوراً گھوڑا چھوڑا اور بلدیو سنگھ کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ میں عملے کے چار مسلح آدمی موجود تھے۔ ہم پوری تیز رفتاری سے مشرقی جانب روانہ ہوئے۔

میں نے پوچھا۔ ''کوئی سراغ ملا۔''

بلدیو نے کہا۔ ''ابھی تو یہی سراغ ہے کہ وہ جالندھر روڈ کی طرف نکلے ہیں۔''

ہم کوئی پانچ منٹ بعد شہر سے باہر تھے۔ ہماری جیپ دیکھ کر دو آدمیوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ دس پندرہ اور راہ گیر بھی یہاں ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ وہ جیپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک شخص نے کہا۔

''جناب تین چار منٹ پہلے یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ ''جناب! دس بارہ گھڑ سوار وہ سامنے والے چوک میں رکے۔ انہوں نے ایک لڑکی کو گھوڑے پر بٹھا رکھا تھا۔ لڑکی بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا دے کر مفلر باندھ رکھا تھا۔ وہ اس سامنے والی دکان کے پاس ایک کالے رنگ کی جیپ کھڑی

تھی۔ گھڑسواروں نے لڑکی کو گھوڑے سے اتار کر جیپ میں ڈال لیا اور آناً فاناً لے کر چلے گئے۔''

''کس طرف گئے ہیں؟'' بلدیو نے تیزی سے پوچھا۔

لوگوں نے دائیں جانب ایک پختہ سڑک کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ سڑک پر کیچڑ آلودہ ٹائروں کے نشان موجود تھے۔ ہم نے جیپ آگے بڑھائی اور پوری رفتار سے مجرموں کے تعاقب میں چل دیئے۔ کوئی چار میل جالندھر کی طرف سفر کرنے کے بعد ہمیں ایک دوراہا نظر آیا ایک سڑک جالندھر کی طرف نکل جاتی تھی اور دوسری بائیں طرف ایک موڑ کاٹتی ہوئی مضافاتی علاقے کی طرف چلی جاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہم رک گئے۔ کچھ سمجھ نہیں آئی کہ کدھر کا رخ کریں۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ لوگ بائیں طرف والی سڑک پر گئے ہوں گے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد ہم نے بھی یہی سڑک اختیار کی۔

قریباً دس میل تک ہم نے چپہ چپہ چھان مارا۔ بہت سے لوگوں سے معلوم کیا لیکن کالی جیپ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ مایوس ہو کر ہم دوسری سڑک پر آ گئے۔ یہاں صرف ایک شخص نے بتایا کہ اس نے کالے رنگ کی ایک جیپ دیکھی تھی جو بڑی رفتار سے لہراتی ہوئی جا رہی تھی۔

ہم نے سڑک سے پھوٹنے والے کچے راستوں پر ٹائروں کے نشان وغیرہ دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

مایوس و نامراد ہم امرتسر واپس آ گئے۔ بوڑھے عبدالکریم کے گھر پہنچے تو وہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ بیٹی کا اغوا شریف والدین کے لئے موت سے کم نہیں ہوتا۔ عبدالکریم نے روتے ہوئے کہا۔

''اُس کتے نے ہمیں برباد کر کے رکھ دیا ہے، نہ وہ دوسروں کی عزت کو میلی نظر سے دیکھتا نہ آج اس کی اپنی عزت نیلام ہوتی۔''

میں سمجھ گیا کہ عبدالکریم اپنے بیٹے فیقا کو کوس رہا ہے اور اس کی بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ یہ سارا چکر نوراں کی وجہ سے ہی چلا تھا۔ نامعلوم غنڈوں سے نوراں کی عزت بچانے کے بعد فیقا نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ بعدازاں وہ خاموشی سے چوہدری جمالے کے پاس چلی گئی تھی اور فیقا نئے چکروں میں پھنس گیا تھا۔ میں نے بوڑھے عبدالکریم سے واقعے کی تفصیلات پوچھیں تو اس نے روتے ہوئے بتایا۔

''جناب! ہم رات کے کھانے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے اُدھر سامنے...... چولہے کے پاس۔ میری بیٹیاں صفیہ اور رقیہ بھی پاس تھیں۔ چھوٹی رقیہ تندور میں روٹیاں لگا رہی تھی۔ بڑی

چولہے پر ہانڈی دیکھ رہی تھی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے بیٹے سجاد نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ آٹھ دس آدمی بندوقیں اور خنجر لہراتے ہوئے اندر گھس آئے۔ غصے سے ان کے چہرے بگڑے ہوئے تھے اور وہ ننگی گالیاں دے رہے تھے۔ چند غنڈوں نے صفیہ کو دبوچ لیا۔ میں اور میری بیوی نے اسے بچانا چاہا تو انہوں نے ہمیں بندوق کے دستوں سے بُری طرح مارا۔ یہ دیکھیں میرے بازو، میری پسلیاں، سارا جسم نیل و نیل ہو رہا ہے۔ دو آدمی رقیہ کی طرف بڑھے۔ اس نے تندور پر پاؤں رکھا اور ہمسایوں کے گھر بھاگ گئی۔ وہ ظالم صفیہ کو گھسیٹتے اور کھینچتے ہوئے گلی میں لے گئے اور دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ ہماری چیخوں سے پورے محلے میں کہرام مچا ہوا تھا لیکن کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ ہماری مدد کو آتا۔ سجاد کا سر پھٹ چکا تھا پھر بھی اس نے ہمت کر کے دیوار پھاندی اور گلی میں کود گیا۔ اس وقت تک وہ بدمعاش ہوائی فائرنگ کرتے گلی کے موڑ تک پہنچ چکے تھے۔ سجاد کوئی دو فرلانگ تک دہائی دیتا ان کے پیچھے بھاگا۔ آخر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس وقت وہ ہسپتال میں ہے۔''

بوڑھے کی پوری روئیداد سن کر میں نے اس سے مختلف سوالات کئے۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس نے حملہ آوروں میں سے کسی کو پہچانا ہے؟ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اس کے گھر میں سب سے پہلے گھسنے والا وہی نمبردار جمالا تھا جو کچھ ہفتے پہلے پولیس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر آیا تھا۔

رات کو کوئی گیارہ بجے تک ہم تفتیش میں مصروف رہے۔ پھر انسپکٹر بلدیو سے چند ضروری مشورے کرنے کے بعد میں گاؤں واپس روانہ ہو گیا...... سخت سردی میں گھوڑوں پر سوار ہم نے چودہ میل کا فاصلہ کوئی تین گھنٹے میں طے کیا اور صبح دو بجے گاؤں واپس پہنچے۔ اللہ وسائی کے گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور رات کے سناٹے میں یہ صدا دور دور تک پھیل رہی تھی۔ یہ رونا پیٹنا سدو کے لئے تھا۔ اس مخبوط الحواس لڑکے کے لئے تھا جس نے ایک غیرت مند بھائی کی طرح بہن کی خاطر جان دے دی تھی۔ ایسی ''باغیرت دیوانگی'' پر ہزاروں ''بے غیرت عقلیں'' قربان کی جا سکتی تھیں۔ تھانے میں اے ایس آئی فرزند علی نے مجھے بتایا کہ سدو کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کی جا چکی ہے۔ نمبردار جمالے کے بارے میں اس نے کہا کہ اس کا فی الحال کوئی پتہ نہیں۔ ہاں بڑا نمبردار شاہ دین حویلی ہی میں ہے۔ میں غصے میں بھرا ہوا اسی وقت حویلی روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

حویلی میں نمبردار شاہ دین سے میری ملاقات تو ہوئی لیکن اس ملاقات کا وہی نتیجہ نکلا جو

مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ ہر وڈے وڈیرے اور عیار جرائم پیشہ کی طرح شاہ دین نے بھی پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا اور کہا کہ اس کا بیٹا تو کل صبح سے ایک ڈیزل انجن خریدنے کے لئے لاہور گیا ہوا ہے۔ میں نے حویلی سے روانہ ہوتے وقت نمبردار سے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ وہ جتنی جلدی ہوسکتا ہے لڑکی برآمد کروادے ورنہ میں کسی کا لحاظ نہیں رکھوں گا۔

شاہ دین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بھرا جی! پہلے چوہدری شیر علی سے اللہ وسائی کی دھی تو برآمد کراؤ اور اگر اس کام سے فارغ ہوجاؤ تو پھر اللہ وسائی کے پُتر کے قاتل پکڑو۔ ابھی بڑے کام پڑے ہوئے ہیں تمہارے کرنے کے۔''

شاہ دین کے تلخ لہجے سے میرا دماغ بھی گھوم گیا۔ میں نے کہا۔ ''نمبردار! میں تیری بڑی عزت کرتا ہوں۔ کہیں مجھ سے کچھ سن نہ بیٹھنا۔ مجھے پتہ ہے مجھے کون سا کام کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔ میں تیرے اور شیر علی جیسے بہت سے چوہدریوں کو دیکھ چکا ہوں۔''

شاہ دین نے اپنے لہجے کو ذرا سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''بادشاہو! ہم نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے یہ کیا ہے کہ قانون کے ہوتے ہوئے اپنی دشمنیاں خود نبٹانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ نوراں کو شیر علی نے اُٹھوایا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم پولیس میں رپورٹ کرتے۔ اس کی بجائے تمہارے پُتر نے امرتسر جا کر فیقا کی بہن کو اغوا اور اس کے بھائی کو شدید زخمی کردیا ہے۔ اب تم دونوں مجرم ہو۔ تم بھی اور چوہدری شیر علی بھی بلکہ میرا خیال ہے کہ تمہارا جرم بڑا ہے کیونکہ یہ بات تمہاری طرف سے شروع ہوئی ہے۔ تمہارے بیٹے نے فیقا کو مار کر کھیتوں میں پھینکا تھا جہاں سے اسے چوہدری شیر علی کے بندوں نے اُٹھایا اور اس کی جان بچائی۔''

شاہ دین نے کہا۔ ''میرے بیٹے نے کسی فیقا کو نہیں مارا اور نہ ہی کھیتوں میں پھینکا ہے اور اگر فرض کرلیا جائے کہ ایسا ہوا بھی ہے تو اس میں اُس کنجری کے پُتر کو کیا تکلیف تھی۔''

شاہ دین کا اشارہ شیر علی کی طرف تھا۔ میں نے کہا۔ ''خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے شاہ دین۔ تم نے اس غریب کو پھڑکر کے کھیتوں میں پھینک دیا۔ تم نے اور تمہارے بیٹے نے سوچا ہوگا کہ اس کے پیچھے آنے والا کون ہے۔ قدرت نے اسے ایک ایسے شخص تک پہنچا دیا جو تمہاری طرح زور آور ہے اور تمہارا ناک میں دم کرسکتا ہے جو اس نے کیا ہے اس کی سزا اسے ملے گی لیکن تم بھی قانون کی خلاف ورزی کر کے بچ نہیں سکتے......''

میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل آیا۔ حویلی کے صحن سے گزرتے ہوئے مجھے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ نمبردار شاہ دین پوری تیاری میں ہے۔ حویلی میں کچھ نہیں تو پچیس تیس مسلح

آدمی موجود تھے اور اگر چوہدری شیر علی کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی کی جاتی تو اچھا خاصا خون خرابہ ہوتا۔ یقینی بات تھی کہ اب تک چوہدری شیر علی کو فیقا کی بہن کے اغوا کا پتہ چل چکا ہوگا اور وہ آتش فشاں کی طرح کھول رہا ہوگا۔ یہ رات جتنی سرد اور تاریک تھی اتنی ہی خوفناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ حویلی سے نکلتے ہی میں نے اپنا گھوڑا سنبھالا اور مبارک پور کی طرف روانہ ہوا۔ مبارک پور جو چوہدری شیر علی کا گاؤں تھا جہاں شیر علی کی وسیع دومنزلہ حویلی میں مجھے فیقا اور نوراں کا سراغ مل سکتا تھا اور اس قاتل کا بھی پتہ چل سکتا تھا جس نے کل شام مخبوط الحواس سدو کو چھری مار کر ہلاک کیا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد میں مبارک پور میں شیر علی کی دومنزلہ کوٹھی میں شیر علی کے سامنے بیٹھا تھا۔ شیر علی ایک نوجوان چوہدری تھا۔ زیادہ سے زیادہ تیس سال عمر ہوگی۔ اس کا باپ اور ایک چچازاد بھائی چند سال پہلے اس دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے جو برسوں سے شاہ دین اور شیر علی کے گھرانوں میں چلی آ رہی تھی۔ شیر علی نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے نیچے سے مسکرا کر میرا حال احوال دریافت کیا اور یوں بے وقت آنے کی وجہ پوچھی۔ وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے کچھ بھی پتہ نہیں حالانکہ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ آج رات ایک پل کے لئے بھی نہیں سویا۔ میں نے کہا۔

''شیر علی! میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا نہیں چاہتا۔ دوحرفی بات یہ ہے کہ سدو کے قاتل راجپال سنگھ کو میرے حوالے کردو اور اللہ وسائی کی دھی نوراں کو بھی سامنے لے آؤ۔''

شیر علی نے کہا۔ ''نواز صاحب! میرا خیال تھا کہ آپ کوئی نئی بات کرنے آئے ہوں گے۔ یہ باتیں تو شام کے وقت آپ کا اے ایس آئی بھی کر چکا ہے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ نہ اللہ وسائی کی دھی میرے پاس ہے اور نہ راجپال سے میرا کوئی تعلق ہے۔''

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری حویلی کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

وہ وکیلوں کے انداز میں جرح کرتے ہوئے بولا۔ ''نواز صاحب! آپ سے زیادہ قانون کون جانتا ہے تلاشی کے لئے وارنٹ کا ہونا ضروری ہے۔'' میں نے سن رکھا تھا اور مجھے خود بھی معلوم تھا کہ شیر علی بڑا قانونی بنتا ہے۔ تھانے کچہری کا اسے بہت تجربہ تھا۔ ساری قانونی دفعات اور عدالتی ہیر پھیر اسے آتے تھے۔ مجھے خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔ ''آپ تو اچھی طرح جانتے ہوں گے دفعہ 102 اور دفعہ 103 کے تحت کسی بھی شہری کو بلاوارنٹ خانہ تلاشی دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور تلاشی کے موقعے پر گواہوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو شیر علی! اگر میرے ساتھ قانونی چکروں میں پڑو گے تو تنگ

ہو گئے۔ مجھے کوئی شوق نہیں حویلی کی تلاشی لینے کا۔ تم مجرم کو میرے حوالے کر دو، میں چلا جاتا ہوں۔''

''میں کہہ چکا ہوں نواز صاحب! میرے پاس آپ کو دینے کے لئے کچھ نہیں۔ اگر مجھے پکڑنا چاہتے ہیں تو ضرور پکڑ لیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کا زور مجھ غریب پر ہی چلنا ہے۔ نمبرداروں کی طرف تو آپ آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

''آپ کو سب معلوم ہے بادشاہو۔ بھولے نہ بنو۔ اگر آپ میں ہمت ہوتی تو جمالے کا باپ شاہ دین اس وقت حویلی میں نہ ہوتا۔ حوالات میں چھترول ہو رہی ہوتی اس کی۔ وہ کام تو آپ سے ہو نہیں سکتا اور چڑھ دوڑے ہیں ہم بے گناہوں پر۔''

میرا ہاتھ چوہدری شیر علی کے گریبان کی طرف اُٹھتا اُٹھتا رہ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے تُو فیقا کی بہن کا ذکر کر رہا ہے جو کل شام اغوا ہوئی ہے لیکن ایک بات تُو بھول رہا ہے یہ حادثہ بھی تیری وجہ سے ہوا ہے۔ فیقا کی بہن کو نوراں کے بدلے اغوا کیا گیا ہے اور نوراں کو اغوا کرنے والا تُو ہے......تُو نوراں کو پیش کر دے۔ میں دو گھنٹے کے اندر فیقا کی بہن کو برآمد کرا دوں گا۔''

چوہدری شیر علی عجیب سی ہنسی ہنسا۔ ''بادشاہو، اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اب وہ بدنصیب برآمد ہو بھی گئی تو اس کا گھر والوں نے کیا کرنا ہے۔ وہ تو شاید خود اس کا گلا گھونٹ دیں۔''

''کیوں کیا ہوا ہے اسے؟''

''وہی ہوا ہے جو یہ حرام زادہ نمبردار اُٹھائی ہوئی عورتوں سے کرتا ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

شیر علی نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔ ''بشیرے او بشیرے۔'' ایک لمحے بعد اونچا لمبا بشیرا بھاگتا ہوا اندر آ گیا۔ شیر علی نے کہا۔ ''جا اُن دونوں ٹکڑوں کو اندر لے کر آ۔'' بشیرا چلا گیا اور چند منٹ بعد دو آدمیوں کو اندر لایا۔ ان میں ایک نوجوان اور دوسرا درمیانی عمر کا تھا۔ اپنے لباس سے دونوں غریب کاشت کار نظر آتے تھے۔ ان کے چہروں پر چوٹوں کے نشان تھے اور لباس پھٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں آ کر انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کے خوفزدہ چہرے اور بھی پیلے پڑ گئے۔ دونوں میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئے اور دہائی دینے لگے کہ اُن کا کوئی قصور نہیں۔ وہ بے گناہ ہیں۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے شیر علی کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''ان کے

ڈیرے پر ہی جمالے نے فیقا کی بہن کی عزت لوٹی ہے۔'' میں بھونچکا رہ گیا دونوں افراد پھر دہائی دینے لگے۔

''مائی باپ یہ غلط ہے۔ ہم ان بندوں کو جانتے تک نہیں۔ ہم اندھے ہو جائیں اگر اس سے پہلے کہیں دیکھا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا تو اصل بات کیا ہے؟''

ادھیڑ عمر شخص صافے سے ناک صاف کرتا ہوا بولا۔ ''اصل بات سارے گاؤں والوں کو معلوم ہے جناب۔ ہمارا گاؤں جالندھر روڈ سے تین میل آگے نہر کے پکے کنارے پر ہے۔ نہر کی طرف آئیں تو گاؤں میں سب سے پہلا کنواں ہمارا ہی ہے۔ رات کوئی آٹھ نو بجے ہم دونوں اپنے کنویں پر تھے۔ اتنے میں ایک موٹر کی آواز آئی۔ ہم نے کوٹھے سے نکل کر دیکھا۔ کالے رنگ کی ایک جیپ کنویں کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس میں کوئی آٹھ بندے سوار تھے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ سارے بندوں کے پاس بندوقیں اور لاٹھیاں تھیں۔ جیپ کی اگلی سیٹ سے ایک لمبا تڑنگا منڈا باہر نکلا۔ اس نے ہم سے پوچھا۔ چوہدری اسماعیل کہاں ہے۔ ہم نے کہا وہ تو تین مہینے پہلے یہ کھیت بیچ کر شہر چلا گیا ہے۔ اب اس کنویں پر ہم ہوتے ہیں۔ اس نے ہمیں دو تین گالیاں دیں اور اپنے بندوں سے کہا ان دونوں کو اُدھر درختوں کے نیچے بٹھاؤ اور کسی کو کوٹھے کی طرف نہ آنے دینا۔ دو آدمی ہمیں بندوقوں کی نال سے دھکے دیتے ہوئے درختوں کے نیچے لے گئے اور وہاں چارپائیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ لمبے منڈے نے لڑکی کو کندھے پر اُٹھایا اور لے کر کوٹھے میں چلا گیا۔ وہ بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد گاؤں کی طرف سے آوازیں آئیں۔ لالٹینوں کی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں پچیس تیس بندے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں گاؤں کی عورتیں اور بچے بھی تھے۔ انہیں دیکھ کر جیپ والوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ لوگ ڈر کر زور دور ہٹ گئے۔ جیپ والوں میں سے ایک للکار کر بولا۔

''خبردار کسی نے مامابننے کی کوشش کی۔ گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔''

گاؤں کے ایک جوان منڈے نے سامنے آ کر کہا۔ ''بے غیرت نہ بنو، کُڑی کو چھوڑ دو۔ ہمیں پتہ ہے کہ وہ سامنے والے کوٹھے میں ہے۔''

جواب میں ایک رائفل والے نے تڑتڑ فائرنگ کی۔ ہمارے گاؤں کا منڈا ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی ڈرتا ڈرتا آیا اور اسے اُٹھا کر واپس لے گیا۔ جیپ والے شراب پی کر بڑھکیں لگاتے رہے اور ہوائی فائرنگ کرتے رہے۔ انہوں نے کسی کو کوٹھے کے قریب نہیں آیا

دیا...... کوئی ایک گھنٹے بعد جب پاس والے گاؤں سے بھی لوگ کنویں کے اردگرد جمع ہونے لگے تو انہوں نے گُڈی کو دوبارہ جیپ میں ڈالا اور ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے پکی سڑک کی طرف نکل گئے۔''

اس شخص کی بات ختم ہوئی تو چوہدری شیر علی نے اپنے ملازم بشیرے سے کہا۔ ''چل ان دونوں کو باہر لے جا۔ ہمیں کوئی بات کرنی ہے۔''

بشیرا ان دونوں کو ٹھڈے مارتا ہوا باہر لے گیا۔ شیر علی طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کی پولیس سے تو ہماری سی آئی ڈی تیز نکلی۔ میرے بندے دس منٹ پہلے اس کنویں پر پہنچ جاتے تو اب تک جمالا ہاتھ پاؤں تڑوا کر آپ کی حوالات میں پہنچ چکا ہوتا۔''

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ ہماری طرح شیر علی کے بندے بھی جمالے کی تلاش میں تھے۔ کامیاب تو وہ بھی نہیں ہوئے تھے مگر ہم سے ان کی کارکردگی بہتر رہی تھی۔ اگر صفیہ کی عزت لٹ چکی تھی تو یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا...... بہرحال یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا، یہاں دشمنی کی آگ بھڑک رہی تھی اور شرافت، عزت، جوانی، دوشیزگی سب کچھ اس آگ میں جل رہا تھا۔ میں تو اس علاقے میں صرف دو سال پہلے آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا یہ دشمنی کس کس نوراں اور صفیہ کی عزت کا خون کر چکی تھی۔ کتنے جمالے اور شیر علی اس رقابت کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

میں نے شیر علی سے پوچھا۔ ''اب تمہاری سی آئی ڈی کہاں تک پہنچی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میں نے اپنے دو کارندے امرتسر بھیجے ہیں۔ چوہدری اسماعیل کی طرف۔ یہ شخص جمالے کا دوست رہا ہے اور کوئی تین چار ماہ پہلے اپنے تین کنویں اور زمین بیچ کر امرتسر چلا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس سے جمالے کے کسی ٹھکانے کا پتہ چل جائے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔ ''فیقے کی بہن کی بربادی پر تمہارا خون کھول رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے تم مانتے ہو کہ فیقا اس وقت تمہارے پاس ہے اور اس کی محبوبہ نوراں بھی اس حویلی میں ہے۔''

''میں یہ کیسے مان سکتا ہوں جب کہ مجھے اُن دونوں کے بارے کوئی علم ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں وارنٹ لے کر ہی آؤں گا۔'' میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میری نگاہیں بائیں جانب ایک دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ کوئی اس دروازے کے پیچھے کھڑا ہماری باتیں سن رہا ہے۔ شاید شیر علی کا کوئی ملازم اس سے غداری پر اُترا ہوا تھا۔

شیر علی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ وارنٹ لے کر آئیں گے تو میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔''

شیر علی سے باتیں کرتے ہوئے میں اس دروازے کے بالکل پاس پہنچ گیا۔ اچانک گھوم کر میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور ایک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ ایک سریلی چیخ سنائی دی اور کوئی کمرے میں گرتے گرتے بچا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ اللہ وسائی کی بیٹی نوراں تھی۔ اس نے پھولدار شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور ایک کالی گرم چادر اس کے سر پر تھی۔ وہ چند لمحے پھٹی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر یک دم مڑی اور وحشی ہرنی کی طرح بھاگ گئی۔ میں نے شیر علی کی طرف دیکھا وہ اپنی جگہ دم بخود کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ میں نے اس کے سامنے جاتے ہوئے کہا۔

''اب کیا خیال ہے شیر علی۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے تمہیں۔''

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے غصے پر قابو پایا۔ آگے بڑھ کر زور سے دروازہ بند کیا اور مجھے لے کر واپس کرسی پر آ بیٹھا۔ کچھ دیر سوچ میں گم رہنے کے بعد بولا۔

''نواز صاحب! سچی بات یہ ہے کہ میں آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے ڈر لگتا تھا کہ نوراں اس حویلی سے باہر محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ نمبردار کے دو ٹانگوں والے پالتو کتے اسے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ بھی منہ دیکھتے رہ جائیں...... ٹھہریئے، میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔ کوئی دو ہفتے پہلے میرے کچھ بندے رات کے وقت چوہدری رحمت کے کھیتوں کے پاس سے گزر رہے تھے تو انہیں کسی کی ہائے ہائے سنائی دی۔ انہوں نے جا کر دیکھا ایک لڑکا جس کے جسم پر شہری لباس تھا سخت زخمی حالت میں پڑا سسک رہا تھا۔ انہوں نے اسے اُٹھا کر اپنے ریڑھے میں ڈال لیا اور میرے پاس حویلی لے آئے۔ میں نے اس وقت شہر سے ایک واقف کار ڈاکٹر کو منگوایا۔ اس ڈاکٹر نے آٹھ پہر کی محنت کے بعد زخمی کی جان بچا لی۔ اس کا نام فیقا تھا۔ وہ بولنے کے قابل ہوا تو اس نے رو رو کر مجھے اپنی درد بھری کتھا سنائی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک لڑکی نوراں سے عشق کرتا ہے اور نوراں کو ساتھ والے گاؤں کا نمبردار جمالا شہر سے اُٹھا کر یہاں لے آیا ہے۔ وہ نوراں کو ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا تو نمبردار جمالے نے اپنے کارندوں کے ہاتھوں اسے بُری طرح پٹوا کر کھیتوں میں پھینک دیا۔ فیقا کی کہانی کافی لمبی ہے اور آپ بھی اس کے بارے کچھ نہ کچھ جانتے ہی ہوں گے۔ مختصر بات یہ کہ فیقے کی بات سن کر میرا دل بھر آیا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ فیقا اور نوراں کو ملا کر رہوں گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور جمالا

ان کے رستے کی دیوار بنا ہوا تھا۔ میں نے اگلی رات راجپال سنگھ کو دو آدمیوں کے ساتھ جمالے کے گاؤں بھیجا اور وہ اللہ وسائی کے گھر سے نوراں کو اُٹھا لے آئے۔ میں نے ابھی تک فیقے کو اس بابت میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک دو روز بعد جب اس کی طبیعت سنبھل جائے گی تو نوراں کو اس کے سامنے لے جاؤں گا۔ میں اسے حیران کرنا چاہتا تھا لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ دوسرے روز صبح صبح فیقا اپنے بستر سے غائب پایا گیا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹے ہوئے تھے اور سر پر بھی شدید چوٹیں تھیں مگر وہ اس حالت میں نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے تین چار روز تک اسے بہت تلاش کرایا مگر کوئی کھوج نہیں ملا۔ مجھے بے حد دکھ ہوا۔ پہلے وہ نوراں کو رو رہا تھا، اب نوراں موجود تھی اور وہ نہیں تھا...... اب کوئی بارہ روز سے نوراں اس حویلی میں رہ رہی ہے اسے یہاں کسی طرح کی تکلیف نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اسے اللہ وسائی کی مرضی کے بغیر یہاں لانے کا جرم کیا ہے مگر...... آپ خود اس سے پوچھ سکتے ہیں وہ یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اسے فیقا کی امانت سمجھتا ہوں۔''

میں نے دل میں سوچا، اچھی امانت سنبھالی ہے تم نے فیقا کی۔ محبوبہ کے بدلے اس کی بہن اغوا کرا دی ہے۔ آفرین ہے تم چوہدریوں کی عقلوں پر۔ وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔ ''نواز صاحب! اگر آپ نوراں کو لے جانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ نمبرداروں کی دشمنی کی آگ پھر بھڑک اُٹھی ہے۔ یہ بے چاری کُڑی بھی اس لپیٹ میں نہ آ جائے؟''

میں نے کہا۔ ''تم بے فکر رہو۔ میں اس آگ کو ٹھنڈا ٹھار کر کے یہاں سے جاؤں گا...... اب لگے ہاتھوں تم ذرا راجپال سنگھ کو بھی پیش کر دو۔''

راجپال سنگھ کا نام سن کر چوہدری شیر علی نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''انسپکٹر نواز جی، بات یہ ہے کہ میں اس سکھڑے کے قول و فعل کا ذمے دار نہیں ہوں۔ اگر اس نے کوئی قتل شتل کیا ہے تو یہ اس کا اپنا کام ہے اور اس کی سزا اسے ملنی چاہیے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اور میں یہ وعدہ بھی آپ سے کرتا ہوں کہ اسے پناہ نہیں دوں گا۔''

میں نے شیر علی کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ راجپال نے نوراں کے بھائی کو قتل کر کے شیر علی کو بھی ناراض کر دیا ہے اور اب وہ کسی طرح اس کی پشت پناہی نہیں کرے گا۔ میرے کہنے پر شیر علی نے نوراں کو میرے سامنے بلا لیا۔ وہ خشک ہونٹوں کے ساتھ خاموش خاموش سی میرے سامنے آ بیٹھی۔ یہی وہ لڑکی تھی جس کی وجہ سے جمالے اور فیقا میں رقابت شروع

ہوئی اور جس کی وجہ سے دو چوہدریوں کے درمیان پرانی دشمنی کی آگ پھر بھڑک اُٹھی۔ یہ لڑکی کئی مرتبہ اغوا ہو چکی تھی اور اس کی خوبصورتی نے ابھی اسے نہ جانے کیا کچھ دکھانا تھا۔ میں نے کہا۔

''ہاں نوراں بی بی! اب کیا چاہتی ہے تُو۔ کس کس کا بیڑا غرق کرنا ہے ابھی تُو نے؟''

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔ روتے ہوئے ہر عورت بے گناہ لگتی ہے۔ نوراں بھی لگ رہی تھی۔ مگر اس کی بے گناہی کا کوئی ثبوت میرے پاس نہیں تھا۔ ابھی تک تو یہ بھی پتہ نہیں چل سکا تھا کہ اس کی اپنی مرضی کیا ہے۔ وہ کس سے پیار کرتی ہے۔ جمالے سے جسے بھول کر وہ کئی ماہ فیقا کے ساتھ شہر میں رہ آئی تھی یا فیقا سے جس کی ماں کے لئے سوٹ کا کپڑا خریدنے نکلی تھی اور چپ چاپ جمالے کے ساتھ گاؤں چلی آئی تھی اور اب ایک بار پھر اغوا ہو کر شیر علی کی حویلی میں ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔ آج میں اس لڑکی سے سب کچھ پوچھ لینا چاہتا تھا۔

☆======☆======☆

میں نوراں کو چوہدری شیر علی کی حویلی سے چادر میں لپیٹ کر تھانے لے آیا۔ اس وقت ابھی صبح کے چار ہی بجے تھے۔ کسی نے نوراں کو تھانے میں داخل ہوتے نہیں دیکھا اور اب وہ میرے سامنے بیٹھی مجھے اپنے دل کا حال سنا رہی تھی۔ اس نے کئی جگہ جھوٹ بولنے کی کوشش کی اور کہیں کہیں جان بوجھ کر بات گول کرنا چاہی مگر میں نے ہر موقعے پر اسے پکڑ لیا اور صحیح صحیح بات اگلوا کر ہی چھوڑی۔ نوراں کی طویل گفتگو سے جو صورتِ حال سامنے آئی اس کا مختصر خلاصہ یوں ہے۔

''نوراں ان لڑکیوں میں سے تھی جو جوان اور خوبصورت ہوتی ہیں اور جن کے دل میں نئی نئی امنگیں ہلچل مچاتی رہتی ہیں۔ وہ روز رات سونے سے پہلے کسی چن ماہی یا ڈھول سپاہی کا تصور آنکھوں میں بسا لیتی ہیں اور پھر ساری رات اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر آنے والے کل کے خواب دیکھتی ہیں۔ نوراں نمبردار جمالے سے محبت تو نہیں کرتی تھی مگر وہ اسے کچھ کچھ اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کے قریب آنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف جمالا بھی اسے پسند کرتا تھا لیکن وہ کلی کلی منڈلانے والا بھنورا تھا۔ خوبصورت اور قد کاٹھ کا بھی اچھا تھا۔ گاؤں کی کنواری مٹیاریں اس کے آگے پیچھے آہیں بھرتی تھیں۔ وہ جس شے پر انگلی رکھ دیتا وہ اس کی ہو جاتی تھی۔ کوئی تین چار ماہ پہلے گاؤں سے کچھ دور ایک بہت بڑا میلہ تھا۔ نمبردار جمالے نے اس میلے کے لئے نوراں اور اس کی ماں اللہ وسائی کو بہت سے کپڑے لے کر دیئے

روپے بھی دیئے تا کہ وہ میلے میں خریداری کر سکیں۔ اس نے نوراں سے کہا کہ وہ میلے سے فارغ ہو کر شام سے ذرا پہلے اسے نارنگیوں کے باغ میں ملے۔ وہ اسے وہاں سے شہر لے جائے گا اور وہ ایک دو دن خوب سیر سپاٹا کریں گے۔ اس نے نوراں کی ماں کو بھی سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ نوراں کی ماں سمجھتی تھی کہ جمالا اس کی بیٹی پر ریجھ چکا ہے وہ جمالے کی ساس بن جاتی تو اس کی پانچوں گھی میں ہو جاتا تھیں۔ وہ تھی بھی کھانے پینے والی عورت۔ وہ انکار کیسے کر سکتی تھی...... خیر میلے کے روز شام دیر تک نوراں باغ میں جمالے کا انتظار کرتی رہی لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔ شاید کسی اور چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس دوران آندھی آ گئی اور نوراں گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگی۔ گہری تاریکی میں وہ راستہ بھی بھول چکی تھی۔ اس دوران ساتھ والے گاؤں کا ایک کوچوان اپنے تانگے پر اُدھر سے گزرا۔ اس نے بیٹی کہہ کر نوراں کو تانگے پر بٹھالیا اور تسلی دی کہ وہ اسے اس کے گاؤں تک پہنچا دے گا۔ تیز آندھی اور تاریکی میں انہوں نے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ اپنا سفر جاری رکھا۔ میلے والی جگہ سے نوراں کے گاؤں کا فاصلہ صرف ڈھائی کوس تھا اور تانگہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا تھا مگر دو گھنٹے گزرنے کے باوجود یہ سفر ختم نہیں ہوا تو نوراں کو شبہ ہونے لگا۔ پھر جب کوچوان نے تانگہ ایک پرانے شمشان گھاٹ کی طرف پھیر دیا تو نوراں کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ پچھلی سیٹ سے اُتری اور اندھا دھند بھاگتی چلی گئی۔ اسے اپنے پیچھے کوچوان کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ نوراں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر کوچوان سے چھپتی رہی اور بھاگتی رہی۔ آخر ہانپ کر ایک چھوٹے سے نالے کے پُل پر جا بیٹھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے گاؤں کی مخالف سمت میں سفر کرتی شہر کے مضافات میں پہنچ چکی ہے۔ شہر جہاں شب کی تاریکی میں ہر موڑ پر ایک شیطان کی گھات ہوتی ہے۔ وہ سردی سے نڈھال اور خوف سے سہمی ہوئی نالے کی پُلی پر بیٹھی تھی کہ ایک سائیکل سوار وہاں سے گزرا۔ نوراں نے آواز دے کر اسے روکا اور کہا کہ وہ میلہ دیکھنے آئی تھی راستہ بھول گئی ہے۔ وہ اس پر مہربانی کرے اور اس کے گھر پہنچا دے۔ یہ سائیکل سوار ایک ریلوے ملازم تھا۔ اس نے نوراں سے اس کے گاؤں کا نام پوچھا۔ نوراں نے نام بتایا تو سائیکل سوار سمجھ گیا کہ چڑیا اپنے گھونسلے سے بڑی دور بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔ ''بی بی! تم تو اس وقت شہر کے نزدیک پہنچ چکی ہو۔ یہاں سے تمہارا گاؤں کم از کم پندرہ میل دور ہے۔ اب تم واپس کیسے جا سکتی ہو۔'' نوراں رونے لگی۔ سائیکل سوار نے ہمدرد بن کر اسے تسلی تشفی دی اور بولا۔ ''میرے ساتھ سائیکل پر بیٹھ جاؤ میں تمہیں گھر لے جاتا ہوں۔ وہاں میرے بیوی بچے ہیں۔ رات وہیں کاٹ لینا، صبح میں تمہیں واپس بھجوانے کا انتظام

کر دوں گا۔'' نوراں ڈری ہوئی تھی لیکن رات کی اس تاریکی میں وہ اکیلی جا بھی کہاں سکتی تھی۔ وہ سائیکل سوار کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ گئی۔ وہ اسے سیدھا ریلوے گارڈ کی کوٹھڑی میں لے گیا۔ سکھ ریلوے گارڈ سائیکل سوار کا گہرا دوست تھا۔ بے بس اور خوبصورت نوراں کو دیکھ کر دونوں کی نیت خراب ہونے میں دو منٹ کی دیر بھی نہ لگی۔ انہوں نے نوراں کو ڈرایا دھمکایا کہ وہ آوارہ گردی کے جرم میں تھانے چلی جائے گی۔ پھر وہ اس سے دست درازی کرنے لگے...... جیسا کہ قارئین پڑھ چکے ہیں۔ یہی وہ وقت تھا جب رفیق عرف فیقا کارخانے کی دوسری شفٹ میں کام کر کے واپس آ رہا تھا۔ اس نے نوراں کی چیخ و پکار سنی اور اس کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔

ان دونوں لوفروں سے چھڑا کر وہ اسے گھر لے آیا۔ یہاں وہ کئی ماہ رفیق کے ساتھ رہی۔ رفیق گو بہت خوبصورت نہیں تھا۔ قد کاٹھ بھی معمولی تھا لیکن اس کے دل میں ایک محبت کرنے والا دل تھا۔ وہ جمالے کی طرح نہیں تھا کہ اس سے ملنے کا وعدہ کرتا اور وعدہ بھول کر کسی اور کی بانہوں میں چلا جاتا۔ وہ تو اس کی ایک مسکراہٹ کے لئے اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ زندگی میں پہلی بار نوراں کے دل میں کسی کے لئے پیار کی کونپل پھوٹی۔ وہ فیقا کو پسند کرنے لگی۔ اس کی باتیں سننے کے لئے بے چین رہنے لگی۔ شاموں کو اس کا انتظار کرنے لگی۔ جنداں کا نام تو قارئین کو یاد ہی ہوگا۔ اس عورت کے مکان میں ہی نوراں اور فیقا رہتے تھے۔ جنداں، نوراں کو بیٹی کی طرح سمجھنے لگی تھی اور وہ ہر وقت اس سے اس کے وارثوں کا پتہ ٹھکانہ پوچھتی رہتی تھی لیکن نوراں نے کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ اپنے ماضی کو بھول جانا چاہتی تھی۔ ماتھے پر بدنامی کا داغ لے کر کبھی اپنے جاننے والوں کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ آخر ایک روز فیقے نے اس سے شادی کی درخواست کر دی۔ چند دن سوچ بچار کے بعد نوراں نے ہامی بھر لی۔ اپنی آمدن کے مطابق فیقا شادی کی تیاری کرنے لگا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے اور اپنی اپنی جگہ آنے والے سہانے دنوں کے خواب دیکھ رہے تھے مگر ایک روز نمبردار جمالا، نوراں کو فیقا کی دنیا سے عقاب کی طرح اچک کر لے گیا۔ وہ بازار کپڑا خریدنے گئی تھی کہ جمالے سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ جمالا اسے لے کر ایک باغ میں چلا گیا۔ وہاں اس نے نوراں کو سمجھایا بجھایا، ڈرایا دھمکایا اور وہیں سے لے کر گاؤں واپس آ گیا۔ نوراں جمالے کی خصلت کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے جانے سے انکار کر دیا تو اس کے ساتھ ساتھ فیقا کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس نے حالات کے سامنے سپر ڈال دی۔ محبت میں ٹھوکر کھانے کے بعد جمالے کی سوئی ہوئی محبت اب بیدار ہو چکی تھی۔ وہی نوراں جس سے

میلے میں ملنے کا وعدہ کر کے وہ بھول گیا تھا اور جو اس کے لئے ایک عام لڑکی تھی اب اس کے دل کا روگ بنی ہوئی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران اتفاقاً زری بائی کے کوٹھے پر اس کی ملاقات نوراں کے عاشق نامراد فیقا سے ہوگئی اور حالات دوسرا رخ اختیار کر گئے۔ جمالا رقابت کی آگ میں جلنے لگا اور یہ ٹوہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ نوراں سے فیقا کے تعلقات کس حد تک پہنچے تھے وغیرہ وغیرہ۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

نوراں کی پوری روئیداد سننے کے بعد میں نے اس سے کچھ سوالات پوچھے اور پھر جانے کی اجازت دے دی۔ نوراں کو اس کے بھائی کی موت کا نہ چوہدری شیر علی نے بتایا تھا اور نہ میں نے بتایا۔ گھر جا کر اسے سب کچھ پتہ چل جانا تھا۔ بلکہ اگر وہ غور کرتی تو تھانے تک بھی اس آہ و فغاں کی آواز آرہی تھی جو نوراں کے گھر برپا تھی...... اس کا جھلا بھائی اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

اگلے ایک مہینے میں کوئی اہم واقعہ رُونما نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ چوہدری شیر علی کے کارندے راجپال سنگھ کو میرے اے ایس آئی نے امرتسر کے نواح سے گرفتار کر لیا۔ اس نے سدو کو چھری مارنے کے جرم کا اعتراف کیا۔ حسبِ وعدہ شیر علی نے اس کی بالکل پشت پناہی نہیں کی۔ میں نے اس کا چالان مکمل کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ شیر علی اور نمبردار شاہ دین کے خلاف میں نے ابھی جان بوجھ کر کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ ویسے بھی جب تک مغویہ صفیہ برآمد نہ ہوتی کیس مضبوط نہیں ہو سکتا تھا۔ نوراں اپنی ماں اللہ وسائی کے پاس واپس پہنچ چکی تھی لیکن مجھے اس کی عزت اور جان کی طرف سے خطرہ تھا۔ لہٰذا میں نے بلال شاہ کو ان کے گھر رہنے کی ہدایت کی تھی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل نے بھی اللہ وسائی کے گھر کے سامنے پکا ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ صفیہ اور نمبردار جمالے کا ابھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں نے نمبرداروں کے ایک دو بندے گرفتار بھی کئے تھے لیکن وہ نمائشی بندے تھے، اصل بندہ شاہ دین نے ایک بھی گرفتار نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ ایک ٹھٹھری ہوئی شام تھی جب کمبل کی بکل مارے ایک شخص سردار پور تھانے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ امرتسر سے آیا ہے۔ اسے زری بائی نے بڑی رازداری سے میری طرف بھیجا ہے۔ اس نے کہا۔

''بائی جی کا کہنا ہے کہ میں جتنی جلد ہو سکے امرتسر پہنچ جاؤں فیقا کی بہن صفیہ کا معاملہ ہے۔''

صفیہ کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اسی وقت تیاری کی اور پیغام لانے والے شخص کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ بلال شاہ اور دو کانسٹیبل بھی میں نے ساتھ لئے۔ ایک تانگے میں سوار ہو کر ہم تیزی سے امرتسر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس وقت ہم چودہ میل کا سفر طے کر کے شہر پہنچے، آٹھ بجنے والے تھے۔ زری بائی کے کوٹھے تک پہنچتے پہنچتے آدھ گھنٹہ اور لگ گیا۔ زری بائی بڑے عزت و احترام سے پیش آئی۔ خاص طور پر بلال شاہ کو اس نے بہت جھک کر سلام کیا۔ بلال شاہ کچھ اور بھی اکڑ گیا۔ اسے وہ پٹائی بالکل بھول گئی جو کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے اس کوٹھے پر اس کی ہوئی تھی۔ زری بائی مجھے ایک طرف لے گئی اور سنسنی خیز لہجے میں بولی۔

''انسپکٹر صاحب! آج رات دس بجے نمبردار جمال دین مغویہ صفیہ کو لے کر اس بازار میں آنے والا ہے۔ وہ مشتری بائی کے کوٹھے پر آئیں گے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ ذلیل انسان صفیہ کو بیچنا چاہتا ہے۔'' میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ غصے اور انتقام کی آندھی انسان کی بینائی چھین کر اسے کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ نمبردار جمالا ایک ماہ تک اس شریف زادی کو برباد کرنے کے بعد اب کوٹھے پر چڑھانے لے آیا تھا۔ میں اندر سے کھول کر رہ گیا۔ زری بائی نے ہمیں کوٹھے کے پچھلے کمرے میں بٹھایا اور سوڈا واٹر کی بوتلیں منگوا لیں۔ اس دور میں گولی والی بوتل چلتی تھیں۔ ڈھکن کی جگہ بوتل کے گلے میں شیشے کی گولی پھنسی ہوتی تھی۔ ابھی ہم بوتلیں پی ہی رہے تھے کہ ایک دبلی پتلی عورت گھبرائی ہوئی آئی اور نائیکہ کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ نائیکہ نے زری بائی کے کان میں کچھ کہا۔ زری بائی کے چہرے پر جوش نظر آنے لگا۔ مجھ سے بولی۔

''تھانیدار صاحب! وہ آ گیا ہے آیئے میرے ساتھ میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' اس نے ایک ملازمہ کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے تین چار کمبل لے آئی۔ ان کمبلوں کا انتظام شاید اس نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ ہم نے وہ کمبل اوڑھے اور زری بائی کے ساتھ چل دیئے۔ زری بائی نے بھی اپنا آپ ایک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ وہ ہمیں پچھواڑے کی تاریک سیڑھیوں سے اتار کر ایک تنگ گلی میں لے آئی۔ ہماری وردیاں کمبلوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ میں زری بائی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بلال شاہ اور دونوں کانسٹیبل پیچھے آرہے تھے۔ کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد زری بائی ایک اور تنگ گلی میں مڑی اور پھر ایک دروازے سے گزر کر زینے چڑھنے لگی۔ دوسری منزل پر وہی دبلی پتلی عورت نظر آئی جس نے زری کے کوٹھے پر آ کر نائیکہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ دونوں کانسٹیبلوں کو میں گلی

میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ اب میرے ساتھ صرف بلال شاہ تھا۔ ہم زری بائی کے ساتھ ایک تاریک برآمدے میں پہنچے۔ یہاں ایک روشن کھڑکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ ایک آواز میں فوراً پہچان گیا۔ یہ اسی شہدے جمالے کی آواز تھی۔ میں نے کھڑکی کی درز سے جھانکا۔ اندر کا منظر میری توقع سے ملتا جلتا تھا۔ ایک لڑکی جو یقیناً صفیہ ہی تھی۔ ڈری سہی ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس چمک دار تھا، رخساروں پر غازہ اور ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک تھی۔ لگتا تھا جمالا اسے خاص طور پر تیار کرا کے لایا ہے۔ اس کے ساتھ جمالا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ موٹا ہوگیا تھا۔ شلوار قمیص پر اس نے بند گلے کا سویٹر پہن رکھا تھا۔ انگلیوں میں سگریٹ تھا۔ اس کے ساتھ سردار پور کا ایک واہیات سا آدمی اور تھا۔ سامنے والے صوفے پر کرخت شکل والی ایک موٹی سی عورت بیٹھی تھی۔ غالباً یہی مشتری بائی تھی۔ اس کے ساتھ دو غنڈے براجمان تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہم ذرا دیر سے پہنچے ہیں۔ ''معاملہ'' طے ہو چکا ہے۔ اب جمال صاحب کا چل چلاؤ ہے، وہ صفیہ سے کہہ رہا تھا۔

''بھئی میں نے تم سے کہا ہے یہ اپنے لوگ ہیں، یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں پرسوں تک پیشی بھگت کر لاہور سے واپس آجاؤں گا۔''

صفیہ نے منمنا کر کہا۔ ''مجھے...... مجھے ڈر لگ رہا ہے جمالے۔ تم تو کہتے تھے کہ میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

جمالا صفیہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور سرگوشیوں میں کچھ سمجھانے لگا۔ صفیہ خاموشی سے سر جھکائے سن رہی تھی۔ اس کے مسکین چہرے پر اندیشوں کے سائے تھے۔ جمالے نے جیب سے کچھ روپے نکال کر صفیہ کو تھمائے، پھر مشتری بائی سے بولا۔

''ٹھیک ہے چاچی! میں نے سمجھا دیا ہے اسے۔ اب میں چلتا ہوں، پرسوں ملاقات ہوگی۔''

سب کو رب راکھا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت میں نے دروازہ کھولا اور میرا ایک بھرپور مکہ جمالے کے منہ پر پڑا۔ وہ اس حملے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ الٹ کر کمرے کے وسط میں جا گرا۔ ایک ساتھ کئی چیخیں کمرے میں گونجیں۔ میری وردی دیکھ کر جمالے کے ساتھی نے کھڑکی سے کود کر بھاگنا چاہا تو مشتری بائی نے لپک کر اسے جن جھپا مار لیا۔ ظاہر ہے مشتری بائی کو سب کچھ معلوم تھا اور وہ جمالے سے صرف ڈرامہ کر رہی تھی۔ جمالا میرا مکہ کھا کر ایک لمحے کے لئے تو بھونچکا رہ گیا پھر اس نے تڑپ کر قمیص کے نیچے سے کوئی

فٹ بھر لمبا خنجر نکال لیا اور مجھ پر جھپٹا۔ میں نے پینترا بدل کر اس کا پہلا وار بچایا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا میری ٹانگ اس کے سینے پر پڑی اور وہ لڑکھڑا کر کئی فٹ پیچھے ہٹ گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب بلال شاہ نے یا علیؑ کا نعرہ لگایا اور اسے پیچھے سے بازوؤں میں جکڑ کر ہوا میں اُٹھایا اور دھڑام سے ایک تپائی پر پھینک دیا۔ شیشے کی تپائی چکنا چور ہوگئی اور خنجر جمالے کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر جمالے کو اپنے نیچے لے لیا اور بے بس کر دیا۔ صفیہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی اور چیختی جا رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

جمالا گرفتار ہوا۔ لٹی پٹی صفیہ کو اس کے باپ عبدالکریم کے گھر پہنچا دیا گیا۔ جمالے کے لئے علاقے کے کئی معتبر افراد کی سفارشیں آئیں لیکن میں نے اس سے کوئی رعایت نہیں کی۔ جمالے کی گرفتاری کے بعد چوہدری شیر علی کی گرفتاری بھی ضروری ہو جاتی تھی۔ اس نے بھی تو نوراں کو اغوا کیا تھا۔ شیر علی اس بات کو سمجھتا تھا اس لئے وہ دائیں بائیں ہوگیا۔ شاید امرتسر چلا گیا تھا۔ کوشش کے باوجود میں اس کا کھوج نہ لگا سکا۔ دوسری طرف فیقا کا بھی ابھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ اسے شیر علی کی حویلی سے زخمی حالت میں غائب ہوئے اب کوئی ڈیڑھ مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس چکر میں پڑ گیا تھا...... زندہ بھی تھا یا نہیں۔ سوچنے کی بات تھی کہ وہ کہاں گیا۔ وہ نوراں سے محبت کرتا تھا لیکن حویلی سے نکل کر وہ نوراں کی طرف بھی نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اس نے اپنے رقیب جمالے تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ صفیہ کو اغوا کرنے سے پہلے جمالا پندرہ بیس روز گاؤں میں ہی رہا تھا۔

مجھے ایک اور خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ خطرہ چوہدری شیر علی کی طرف سے تھا۔ میری چھٹی حس بار بار خبردار کر رہی تھی کہ شیر علی فیقا کی بہن کے اغوا کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ بظاہر تو پُرسکون نظر آتا تھا لیکن میں جانتا تھا وہ اندر ہی اندر بُری طرح اُبل رہا ہے۔ دشمن کو معاف کرنا جھگڑالو چوہدریوں کی فطرت میں نہیں ہوتا۔ وہ حریف کے ہر وار کا پورا پورا حساب رکھتے ہیں اور اس کا بدلہ چکاتے ہیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ نمبرداروں کا ایک آدھ بندہ قتل ہو جائے گا یا ان کی کوئی عورت اُٹھالی جائے گی۔ کہنے کو تو صفیہ واپس آگئی تھی مگر اس کا آنا نہ آنا ایک برابر تھا۔ وہ ایک کچلا مسلا پھول بن چکی تھی۔ اس کے رنگ اُڑ چکے تھے اور خوشبو بکھر چکی تھی اور یہ سب کچھ شیر علی کی وجہ سے ہوا تھا کیونکہ شیر علی نے نوراں کو اغوا کیا تھا۔ ظاہر ہے شیر علی بھی یہ بات جانتا ہوگا۔ اس کی اندھی غیرت ضرور اس کے اندر طوفان اُٹھاتی ہوگی۔

پھر ایک روز وہی ہوا جس کا خطرہ تھا...... نمبردار جمالے کا دوسرا ریمانڈ بھی ختم ہو چکا

تھا۔ میں اسے جیل بھیجنے کے لئے امرتسر گیا۔ میرے ساتھ دو ہیڈ کانسٹیبل بھی تھے۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر میں عبدالکریم کے گھر کی طرف چلا گیا۔ جمالے کے خلاف چالان تیار کرنے کے لئے مغویہ صفیہ کے کچھ بیانوں کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے گھر ہی میں مل گئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب بے چینی سی جھلکنے لگی۔ اس کا باپ اسے میرے پاس بٹھا کر خود باہر نکل گیا۔ صفیہ اب مجھ سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ کہنے لگی۔

''انسپکٹر صاحب! اللہ کا شکر ہے آپ خود ہی آ گئے۔ میں تو صبح سے سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ آپ سے کیسے رابطہ کروں؟''

''کیوں خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے جی۔'' وہ ہراساں لہجے میں بولی۔ ''کل چوہدری شیر علی ہمارے گھر آیا تھا۔ اس وقت گھر میں میرے اور ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کوئی گھنٹہ بھر یہاں رہا ہے۔''

صفیہ کی بات نے مجھے حیران کر دیا۔ پچھلے کئی روز سے شیر علی کا اتہ پتہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کا عبدالکریم کے گھر آنا کیا معنی رکھتا تھا۔ صفیہ نے کہا۔ ''اس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں جی۔''

میرے ذہن میں خدشوں اور وسوسوں کی ان گنت گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ صفیہ اغوا ہونے سے پہلے ایک جہانیاں ماڈل نامی سکول میں استانی تھی۔ مگر جب ایک ماہ بعد وہ واپس آئی تو سکول والوں نے ملازمت سے فارغ کر دیا۔ اب بیچاری کو بڑی مشکل سے ایک دوسرے سکول میں کم تنخواہ پر نوکری ملی تھی۔ اسے یہ نوکری دلانے میں میری کوشش کو بھی تھوڑا بہت دخل تھا...... صفیہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پریشان لہجے میں کہا۔

''انسپکٹر صاحب! چوہدری شیر علی، اس...... جمالے کی بھانجی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسی سکول میں پڑھتی ہے جہاں میں اب ملازم ہوئی ہوں۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے یہ سب کچھ شیر علی نے بتایا ہے جی۔ کل مجھ سے کہنے لگا صفیہ! تجھے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا بڑا اچھا موقع ملا ہے۔ جمالے کی سگی بھانجی تیرے ہی سکول میں پڑھتی ہے تُو کسی طرح اسے ہمارے ہتھے چڑھا دے، پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔ میں توبہ توبہ کرنے لگی۔ وہ کہنے لگا۔ ''یہ کام تو ہونا ہی ہے تُو نہ کرے گی تو ہم خود کر لیں گے۔ ذرا سوچ جمالے نے

تیرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ تیری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو سال میں چھوٹ جائے گا۔ تُو تو ساری عمر روتی رہے گی نا...... اس سے بدلہ لے، اس کو کہیں منہ دکھانے جوگا نہ چھوڑ......'' وہ بڑی دیر تک مجھے سمجھاتا رہا اور اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجبوراً میں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ ایسا نہ کرتی تو اور کرتی بھی کیا......''

میں نے پوچھا۔ ''تو پھر اب کیا طے ہوا ہے؟''

وہ بولی۔ ''طے تو بہت کچھ ہوا ہے جی...... لیکن میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرے ساتھ...... جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب میں کسی دوسرے کی زندگی برباد کرنے میں کیوں ہاتھ بٹاؤں...... اس لڑکی کا نام زینو ہے۔ دسویں میں پڑھتی ہے۔ ایک جیپ اسے چھوڑنے آتی ہے اور لے کر جاتی ہے۔ طے یہ ہوا ہے کہ پرسوں جمعرات کے روز میں زینو اور تین چار دوسری لڑکیوں کو چھٹی کے بعد امتحانی تیاری کے بہانے سکول میں ہی روک لوں اور جو انہیں لینے آئیں اسے ایک دو گھنٹے کے لئے واپس بھیج دوں۔ اس دوران چوکیدار اور سکول کے دوسرے ملازم بھی چلے جائیں گے۔ چوہدری شیر علی اپنے دو کارندوں کے ساتھ آئے گا اور وہ سکول کے اندر ہی سے زینو کو اُٹھا کر یا بے ہوش کر کے لے جائیں گے۔ مجھے بھی ایک دو تھپڑ مار دیئے جائیں گے تا کہ مجھ پر کوئی الزام نہ آ سکے۔ ہمیں ڈرا دھمکا کر کسی کمرے کے اندر بند کر دیا جائے گا۔''

یہ اطلاعات میرے لئے نہایت سنسنی خیز تھیں۔ شیر علی نے وہی کیا تھا جو اس جیسے اکھڑ مزاج زمیندار کو کرنا چاہیے تھا۔ میں نے صفیہ سے کہا۔ ''بی بی! وہ بدبخت تجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہت کمزور منصوبہ بنایا ہے اس نے۔ اگر وہ لڑکی اس منصوبے کے مطابق اغوا ہوتی ہے تو پولیس کا دھیان تمہاری طرف جاتے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ایک کوڑھ مغز تھانیدار بھی فوراً یہ نتیجہ نکال لے گا کہ تم نے اپنا بدلہ لیتے ہوئے جمالے کی بھانجی کو اغوا کرایا ہے۔''

صفیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں یہ بات اچھی طرح سمجھ رہی ہوں...... ویسے خدا گواہ ہے اگر یہ بات نہ بھی ہوتی تو میں جمالے کی بے گناہ بھانجی کو ان درندوں کا شکار نہ ہونے دیتی۔''

میں نے کہا۔ ''صفیہ! میں قانون کی مدد کرنے پر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم ایک اچھے ماں باپ کی بیٹی ہو اور ایک اچھی عورت ہو...... شاباش۔'' صفیہ کے پرانے زخم تازہ ہو گئے اور وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

بدھ کے روز دوپہر کے وقت میں نے امرتسر کے مقامی تھانے میں انسپکٹر بلدیو سنگھ کے ساتھ ایک میٹنگ کی۔ چند سب انسپکٹر اور اے ایس آئی بھی اس میٹنگ میں شریک ہوئے۔ ہم نے ملزموں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا تفصیلی منصوبہ بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھا کہ زینو سمیت تمام لڑکیوں اور صفیہ کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔ ہماری حکمت عملی ایسی تھی کہ ملزموں کو سکول کے احاطے میں داخل ہونے کا موقع ہی نہیں ملنا تھا...... بہر حال اس منصوبے پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی اور ایک ایسا واقعہ ہو گیا جو کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ انسپکٹر بلدیو کو اپنے ٹیلی فون سیٹ پر ایک حوالدار کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس نے بتایا کہ ایک جیپ میں سوار چند مسلح افراد گرلز ہائی سکول کی طرف گئے ہیں۔ انہوں نے دیہاتی لباس پہن رکھے تھے اور وہ نشے میں بھی لگتے ہیں۔ حوالدار کا خیال تھا کہ جیپ سواروں کے ارادے ٹھیک نہیں اور غالباً یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے کل آنا تھا۔ آخر میں حوالدار نے کہا کہ اسے گولی چلنے کی آواز آئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ گشت پر موجود حوالدار کی اطلاع سن کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ چوہدری شیر علی کو صفیہ کی مخبری کا علم ہو گیا ہے اور اس نے اپنا پروگرام بدل کر ایک دن پہلے ہی کھڑاک کر دیا ہے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔

ہم میٹنگ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے باہر آئے اور جیپ میں سوار ہو کر موقعۂ واردات کی طرف لپکے۔ بھری پُری سڑکوں پر جیپ چرچراتی ہوئی حسین پور پہنچی اور وہاں سے نہر کے ساتھ ساتھ انجمن پارک کی طرف نکل گئی۔ آخر ہم گرلز سکول کے سامنے پہنچے۔ یہاں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ جیپ کے بریک چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رکی۔ میرے سامنے تین گز کے فاصلے پر پانچ چھ آدمی ایک غنڈہ ٹائپ شخص کو لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے۔ چند آدمی ساتھ والے بازار کی طرف لپک رہے تھے اور اشارے کر کر کے چلا رہے تھے۔ ''پکڑو...... پکڑو...... وہ گیا۔'' سکول کی قریباً تمام لڑکیاں اور استانیاں وغیرہ سکول سے نکل کر مختلف دکانوں کے تھڑوں پر سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ اس وقت میری نگاہ سکول کے پھاٹک سے گزر کر احاطے میں چلی گئی۔ میں نے دیکھا دو تین آدمی صفیہ کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر بھاگے آ رہے ہیں۔ صفیہ کی آنکھیں بند تھیں اور ٹانگوں اور پیٹ سے لگاتار خون بہہ رہا تھا۔ میں بھاگ کر اس کے پاس گیا۔ اسے ریوالور کی کم از کم تین گولیاں لگی تھیں۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ سکول کی موٹی عینک والی ہیڈ مسٹریس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر! وہ بدمعاش ایک لڑکی کو اُٹھا کر لے گئے ہیں جلدی ان کا پیچھا کرو۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں

گے۔''

بلدیو سنگھ نے صفیہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

ایک استانی نے روتے ہوئے کہا۔ ''یہ زینو کو بچانے کے لئے ان بدمعاشوں کے سامنے آ گئی تھی۔ انہوں نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔''

میں نے اے ایس آئی فرزند علی سے کہا۔ ''فرزند! تم اسے ہسپتال پہنچاؤ۔ ہم ان کا پیچھا کرتے ہیں، چلو جلدی کرو۔''

فرزند علی، صفیہ کی طرف بڑھا۔ میں انسپکٹر بلدیو سنگھ کے ساتھ بھاگتا ہوا جیپ تک آ گیا۔ ڈرائیور کو اس کی سیٹ سے ہٹا کر میں نے خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ راہ گیروں نے مجرموں کے ساتھی کو مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا ورنہ وہ اس وقت ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ بہر حال ہم اندازے سے شمال کی جانب روانہ ہوئے۔ تنگ بازار سے نکلتے ہی میں نے جیپ کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ سپیڈو میٹر کی سوئی پچاس ساٹھ کے درمیان تھرکنے لگی۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے خون سا پھیلا ہوا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے عزتوں کے جنازے نکل رہے تھے اور میں بے بس تھا۔ ہر دفعہ چند لمحوں یا چند منٹوں کے فرق سے مجرم میرے ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔ ہر دفعہ کوئی مظلوم لڑکی قانون کے محافظ کی راہ تکتے تکتے اپنی دوشیزگی سے محروم ہو جاتی تھی۔ ہر دفعہ شیطان جیت جاتا تھا اور انسان ہار جاتا تھا...... آج میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ آج ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے پورے عزم کے ساتھ سوچا۔ آج کسی لڑکی کی نگاہ نہیں جھکے گی۔ آج کوئی اپنے الہڑپن کے غرور سے محروم نہیں ہو گی۔ آج کسی کی شوخیوں کا پھول نہیں مرجھائے گا۔ میں نے اسٹیئرنگ مضبوطی سے تھاما اور بے پناہ رفتار سے جیپ کو بھگاتا چلا گیا۔ جگہ جگہ کالی سڑکوں پر ٹائر گھسنے کے نشانات بتا رہے تھے کہ ابھی یہاں سے کوئی آندھی کی طرح گزر کر گیا ہے۔ یہ نشانات چوہدری شیر علی کی طرف ہماری رہنمائی بھی کر رہے تھے۔ آخر الگزنڈا گراؤنڈ کے قرب و جوار میں ہم نے چوہدری شیر علی کی جیپ کو جا لیا۔ وہ طوفانی رفتار سے مضافاتی علاقے کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ ہمارا درمیانی فاصلہ کوئی ڈیڑھ سو گز تھا۔ اتنے فاصلے سے گولی چلانا فضول اور خطرناک تھا...... چند ہی منٹوں میں دونوں جیپیں آگے پیچھے بھاگتی ہائی وے پر پہنچ گئیں۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ شیر علی کو اپنے تعاقب کا پتہ چل گیا ہے۔ اس کی جیپ کی رفتار انتہا درجے کو پہنچ گئی تھی۔ جیپ چلتے ہوئے بُری طرح لہرا رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ ابھی اُلٹ جائے گی۔

''جے رام جی'' کی طرف جانے والی سڑک پر کوئی چھ میل چلنے کے بعد آگے والی جیپ

کچے راستے کی طرف مڑ گئی۔ اس راستے کی دونوں طرف گندم کے کھیت تھے۔ ڈھلتے سورج
کی روشنی میں کہیں کہیں کھیت میں کام کرنے والے مزدور حیرت سے کھڑے دونوں گاڑیوں
کی دوڑ دیکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ شیر علی کی جیپ کچے راستے پر فٹ فٹ بھر اچھلتی ہوئی
ایک بلند چھت والی پختہ عمارت کے سامنے رکی۔ یہ کوئی زیر تعمیر کارخانہ تھا۔ چاروں طرف
لوہے کی زنگ آلود چادریں اور گارڈر وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔
شیر علی کی جیپ کی اُڑائی ہوئی دھول اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں کچھ نظر نہیں آیا اور ہماری جیپ کا اگلا
پہیہ ایک گیلے کھیت میں چلا گیا۔ ہم چھلانگیں لگا کر جیپ سے اُترے اور گرد و غبار میں راستہ
بناتے ہوئے اگلی جیپ کی طرف بھاگے۔ شیر علی اس وقت تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر
گھس چکا تھا۔

''شیر علی!'' میں نے عمارت کے سامنے پہنچ کر اسے للکارا۔ میری آواز خالی عمارت کے
اندر دور تک گونج گئی۔ میری آواز کے جواب میں چند لمحے خاموشی رہی پھر عمارت کی بالائی
کھڑکیوں سے تڑاتڑ کی فائرنگ ہونے لگی۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی تاہم اس سے صاف طور پر
اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کم و بیش بیس آدمی موجود ہیں۔ شاید ہمیں یہی بتانے کے لئے فائرنگ کی
گئی تھی۔ میرا پارہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس حرام زادے چوہدری کا خیال تھا کہ غنڈوں
کی زیادہ تعداد دیکھ کر شاید میں واپس چلا جاؤں گا یا کان لپیٹ کر پیچھے ہٹ جاؤں گا اور اس
شہدے کو نوعمر لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی مہلت دے دوں گا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ چوہدری
اسماعیل کا کنواں نہیں تھا اور نہ ہی یہ بدنصیب لڑکی صفیہ تھی، جو بند کوٹھے میں چلاتی رہی تھی اور
مسلح شیطان باہر فائرنگ کرتے رہے تھے۔ آج کھیل کا نقشہ مختلف تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا
کہ کچھ بھی ہو جائے چوہدری شیر علی کو اپنے ارادے پورے نہیں کرنے دوں گا۔ میں نے
اطمینان سے اپنا ریوالور نکالا اور بلند آواز سے کہا۔

''شیر علی! میں تمہیں صرف دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہاتھ
اُٹھا کر باہر نکل آؤ۔ اس کے بعد تمام نتائج کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔'' میری آواز جذبات کی
شدت سے بدلی ہوئی تھی جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ چاروں طرف گہری خاموشی
طاری ہو گئی۔ میرے ساتھی جیپ کی اوٹ میں پناہ لے چکے تھے لیکن میں کسی آڑ کے بغیر کھڑا
تھا۔ دو منٹ پورے ہو گئے تو میں نے ریوالور مضبوطی سے تھاما اور کارروائی کے لئے تیار
ہو گیا۔ پولیس مقابلہ کرنا یا پولیس پر گولی چلانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ مجھے یقین تھا اگر میں
آناً فاناً عمارت کی طرف دوڑ لگا دوں تو شیر علی اور اس کے ساتھیوں کے سوچتے سوچتے لوہے

کی بڑی بڑی چادروں کی اوٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ وہاں سے عمارت میں داخل ہونا نہایت
آسان تھا۔ عمارت میں داخل ہو کر کیا کرنا تھا، یہ بعد میں سوچنے کی بات تھی۔ میں اپنی جگہ
سے حرکت کرنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ اچانک ایک جانب سے دو تین تانگے سرپٹ
بھاگتے نظر آئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے تانگے عام طور پر تانگہ دوڑ کے لئے استعمال کئے جاتے
ہیں اور ان پر مشکل سے دو تین آدمی بیٹھ سکتے ہیں لیکن اس وقت ہر تانگے سے پانچ پانچ افراد
چمٹے ہوئے تھے۔ تانگوں کے پیچھے مسلح آدمیوں سے لدے ہوئے دو ریڑھے بھی تھے۔ یہ
سب لوگ بڑھکیں اور للکارے مارتے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا
کہ یہ نمبردار شاہ دین کے آدمی ہیں۔ جلد ہی مجھے شاہ دین بھی نظر آ گیا۔ دور سے اس کا گنجا سر
دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو نالی رائفل تھی جسے وہ بار بار ہوا میں لہرا رہا تھا۔
وہ آگ جو کئی ماہ سے سلگ رہی تھی آج ایک دم بھڑک کر شعلہ ہو گئی تھی۔ بندوقیں نکل آئی تھیں
اور ڈانگوں پر برچھیاں چڑھ گئی تھیں۔ اب کچھ ہی لمحوں میں یہاں اچھا خاصا رن پڑنے والا
تھا۔ دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ
نمبردار شاہ دین کو اپنی دوہتی (لڑکی کی لڑکی) کے اغوا کی خبر مل چکی ہے اور اب وہ سراپا قہر بن
کر چوہدری شیر علی پر آن پڑا ہے۔ ہم کل پانچ آدمی تھے۔ تصادم روکنے کی ہماری کوئی کوشش
کامیاب نہیں ہو سکتی تھی بلکہ الٹا اس کوشش میں ہمیں نقصان ہو سکتا تھا۔ میں نے بلدیو سنگھ کو
اشارہ کیا کہ وہ واپس تھانے جائے اور بندے لے کر آئے۔ ابھی بلدیو سنگھ نے عملے کو بٹھا کر
جیپ موڑی ہی تھی کہ دونوں پارٹیوں میں فائرنگ ہونے لگی۔ یہ موقع میرے لئے غنیمت
تھا۔ میں جھک کر بھاگا اور مختلف چیزوں کی اوٹ لیتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ
سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ سامنے ایک پہلوان نما شخص چمکدار لاٹھی
لئے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ میرا مقابلہ کرے یا بھاگ نکلے۔
پھر اس نے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ بے انتہا پھرتی سے اس نے میرے ریوالور پر لاٹھی کا
وار کیا۔ اگر میں ایک سیکنڈ کی غفلت کرتا تو ریوالور میرے ہاتھ سے نکل جاتا یا ہاتھ کی ایک
آدھ ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میں نے لپک کر پہلوان کے سینے پر ٹانگ ماری۔ وہ ڈگمگا کر دیوار
سے جا لگا۔ دیوار سے لگتے ہی وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر آگے آیا اور میرے سر کو نشانہ بنانا
چاہا۔ اس مرتبہ میں نیچے جھک کر ایک قدم اس کی طرف کھسک گیا۔ اس کی لاٹھی سیڑھیوں کی
ریلنگ سے ٹکرائی اور وہ میرے اوپر سے ہو کر سیڑھیوں میں گرا اور قلابازیاں کھاتا نچلی منزل پر
پہنچ گیا۔ باہر ہونے والی فائرنگ میں تیزی آ گئی تھی۔ میرے عین سامنے لوہے کا ایک زنگ

آلودروازہ دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔اس کے ساتھ ہی گھٹی گھٹی نسوانی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔میرے سامنے زینو کھڑی تھی۔ سکول کی وردی میں وہ اپنی عمر سے تین چار سال بڑی نظر آتی تھی۔شکل بھی بُری نہیں تھی۔اس کے ہاتھ پشت پر ایک پگڑی سے بندھے ہوئے تھے۔وہ اپنے پاؤں سے دروازہ کھٹکھٹاتی رہی تھی۔مجھے دیکھتے ہی وہ بھاگ کر میرے ساتھ آ لگی۔

"تھانیدار جی! انہوں نے میری استانی کو مار دیا ہے۔اسے پستول سے گولیاں ماردی ہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔"تمہاری استانی ہسپتال میں ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔چلو آؤ میرے ساتھ۔" میں نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور وہ میرے پیچھے بھاگتی ہوئی عمارت کی پچھلی جانب سے باہر نکل آئی۔فائرنگ جاری تھی۔وقفے وقفے سے للکارے اور غلیظ گالیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ہم گندم اور جری کے کھیتوں میں بھاگتے زیرِ تعمیر عمارت سے کوئی سو گز دور نکل آئے۔میں نے دیکھا عمارت کے سامنے اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پاس چھ سات آدمی گتھم گتھا ہیں۔لاٹھیاں زور وشور سے چل رہی تھیں اور چھریوں کی چمک بھی نظر آ رہی تھی۔کھیتوں میں لوگ دور دور کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔تھوڑی دیر اسی طرح گزری اور پھر دور سے پولیس کی گاڑیوں کا شور سنائی دینے لگا۔بلدیو سنگھ قریبی تھانے سے مدد لے کر پہنچ چکا تھا۔پولیس کی بھاری نفری کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر دونوں پارٹیوں نے فائرنگ روک دی۔میں نے دیکھا ریڑھے اور تانگے حرکت میں آئے اور آگے پیچھے ایک طرف بھاگ نکلے۔نمبردار شاہ دین کے کارندے فرار ہو رہے تھے۔پولیس ہوائی فائرنگ کرتی ہوئی زیرِ تعمیر عمارت میں گھس گئی۔

عمارت کے اندر سے صرف دو آدمی گرفتار ہو سکے۔باقی سب بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔"باقی سب" سے میری مراد وہ افراد ہیں جو زندہ تھے۔اس خونی معرکے میں کم از کم چار آدمی ہلاک اور پانچ شدید زخمی ہو چکے تھے۔ہلاک ہونے والوں میں چوہدری شیر علی اور مخالف پارٹی کا نیک محمد شامل تھا۔نیک محمد نمبردار شاہ دین کا سگا بھتیجا تھا۔شیر علی کے سر میں گولی لگی تھی اور بھیجا پھاڑ کر گدی کی طرف سے نکل گئی تھی۔وہ اپنی تمام قانونی مہارت کے ساتھ دفعہ 302 کے تحت مقتول و مغفور ہو چکا تھا۔اس لڑائی میں زیادہ نقصان نمبرداروں کا ہوا تھا کیونکہ وہ کھلی جگہ پر تھے۔ان کے چار آدمی زخمی اور تین موقعے پر ہلاک ہو گئے تھے۔

☆======☆======☆

دونوں پارٹیوں میں ہونے والے تصادم کا ذکر اخباروں میں آیا۔کئی روز یہ خونی لڑائی خاص و عام کی گفتگو کا موضوع بنی رہی۔میں نے نمبردار شاہ دین سمیت دونوں پارٹیوں کے دس بارہ افراد کو گرفتار کر لیا اور یوں یہ معاملہ وقتی طور پر ٹھنڈا ہو گیا۔صفیہ سکول کے احاطے میں شدید زخمی ہوئی تھی۔تین روز گزرنے کے باوجود ہسپتال میں اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔جمالا جیل میں تھا۔اسے معلوم ہوا کہ صفیہ اس کی بھانجی کو بچاتے ہوئے اپنی جان پر کھیل گئی ہے تو وہ دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔جو لوگ اس سے ملنے گئے تھے ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے کیے پر بہت پچھتا رہا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔وہ بہت گناہ گار ہے۔چوتھے پانچویں روز میں کیس کے سلسلے میں اس سے ملنے جیل گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔

"نواز خان صاحب! میں اس لڑکی کا گناہ گار ہوں۔میں نے اس سے بہت زیادتی کی ہے۔میں انتقام میں اندھا ہو گیا تھا۔میں آپ کے سامنے خدا کو حاضر ناظر جان کو وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی سزا کاٹنے کے بعد اس سے معافی مانگوں گا اور اگر اس نے مجھے قبول کیا تو اس سے شادی کروں گا۔اسے حویلی کی بہو بناؤں گا۔"

مگر جمالے کے ارادے پورے نہ ہو سکے۔اس کے گناہوں کا کفارہ ادھورا رہا۔زخمی ہونے کے آٹھ روز بعد صفیہ ہسپتال میں چل بسی۔اس نے اپنے کندھوں سے شرمناک زندگی کا بوجھ اتار پھینکا اور جوان آرزوؤں کو سینے میں دبا کر دور بہت دور چلی گئی۔مجھے لگا جیسے وہ دنیا کے ہر شخص سے ناراض ہو گئی ہے اور سب سے بڑھ کر جمالے سے...... جو حالانکہ اس کی عزت کا قاتل تھا پھر بھی وہ اس کا بھلا چاہتی تھی۔

کوئی ڈھائی مہینے پہلے نوراں کے اغوا سے جو کہانی شروع ہوئی تھی۔وہ اب ختم ہو چکی تھی۔شیر علی مر چکا تھا۔شاہ دین اور اس کا بیٹا جمالا جیل میں تھے۔صفیہ بھی مر گئی تھی اور سردار پور گاؤں کا باغیرت جھلا سدو بھی...... لیکن ایک کردار ایسا تھا جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ زندوں میں ہے یا مُردوں میں۔اگر زندوں میں ہے تو کہاں ہے اور اگر مُردوں میں ہے تو کہاں ہے......اور وہ تھا فیقا۔وہ چوہدری شیر علی کی حویلی سے ایسا غائب ہوا تھا کہ پھر کہیں جھلک نہیں دکھائی تھی۔قریبی دیہات میں میرے مخبر مسلسل اس کی تلاش میں تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ کسی وقت زری بائی سے رابطہ قائم کرے۔زری بائی سے اس کا خاص تعلق تھا۔پہلے بھی جب وہ نوراں کی جدائی میں نیم پاگل ہو رہا تھا تو زری بائی نے ہی اسے سہارا دیا تھا اور اس کے دل سے عورت کی نفرت ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔میں نے

زری بائی سے کہہ رکھا تھا کہ اگر کسی وقت فیقا کا سراغ ملے تو وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔ اس کے علاوہ میں نے بلدیو سنگھ سے کہہ کر ایک مخبر بھی اس کے کوٹھے پر لگوا رکھا تھا۔ بلال شاہ ابھی تک اللہ وسائی کے گھر ہی رہ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نوراں ہر وقت چپ اور اداس رہتی ہے۔ اس بدنصیب کو اداسی کے سوا اور ملا بھی کیا تھا۔ وہ ان ہزاروں عورتوں میں سے ایک تھی جو سالہا سال سے مردوں کی دشمنی کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ان سے بڑھ کر گناہ گار اور کوئی نہیں ہوتا۔

وہ عیدالفطر سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ چاند رات تھی۔ میں تھانے سے فارغ ہو کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک گلی سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹک گیا۔ کھیس کی بکل مارے ایک شخص بڑے پُراسرار انداز میں میرے آگے آگے جا رہا تھا۔ مجھے اس تھانے میں دو ڈھائی سال ہو چکے تھے اور میں گاؤں کے تقریباً ہر فرد کی چال پہچاننے لگا تھا۔ یہ شخص گاؤں کا نہیں لگتا تھا۔ کچھ آگے جا کر وہ نوراں کے گھر والی تنگ گلی میں مڑ گیا۔ یہ چھوٹی سی گلی آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں وہیں گلی کے ناکے پر رک کر اس شخص کو دیکھنے لگا۔ وہ اللہ وسائی کے دروازے کے سامنے رکا اور دستک دی۔ کسی نے اندر سے دروازہ کھولا۔ وہ شخص جلدی سے اندر چلا گیا اس کے اندر جانے کا انداز مشکوک تھا۔ غالباً وہ دروازہ کھولنے والے کو دھکا دے کر اندر گھسا تھا۔ ایک لمحے بعد مجھے گھر کے اندر سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ اب میرے لئے تماشائی بننا ممکن نہیں تھا۔ میں بھاگتا ہوا اللہ وسائی کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ایک عجیب منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ لالٹین کی روشنی میں بلال شاہ بکل والے شخص سے لپٹا ہوا تھا۔ بکل والے نے نوراں کے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے اور وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ اللہ وسائی ایک موٹی لکڑی سے بکل والے کو مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر مجھے معاملے کی اصل سنگینی کا احساس ہوا۔ اندر گھسنے والے شخص کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر تھا۔ غالباً وہ نوراں کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے بلال شاہ کی مدد کرتے ہوئے ایک زوردار مکہ خنجر والے کے منہ پر لگایا۔ اس وقت میں نے اس کی شکل دیکھی۔ وہ فیقا تھا۔ میرا مکہ کھا کر فیقا چکرایا تو بلال شاہ نے اسے بازوؤں میں اُٹھا کر نیچے پٹخنے کی کوشش کی۔ اس نے اسے پٹخ تو دیا لیکن خود نیچے آ گیا۔ اس سے پہلے کہ فیقا کا خنجر بلال شاہ کے پیٹ میں اُتر کر اسے ''اللہ بخشے'' کر دیتا میں نے فیقا کی کلائی پکڑ لی اور بازو مروڑ کر خنجر نیچے گرا دیا...... اب وہ میری گرفت میں بُری طرح مچل رہا تھا اور نوراں کو شرمناک گالیاں دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سب نے مل کر اسے بے بس کر دیا۔

تھانے میں پہنچ کر فیقا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ وہ نوراں کو بے وفا، بدکردار، بے حیا کے طعنے دے رہا تھا اور ہمارے سامنے علی الاعلان کہہ رہا تھا کہ وہ اس چالو عورت کو قتل کر دے گا۔ اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ نوراں سے بدظن ہے۔ میں نے اسے ڈرا دھمکا کر اور پیار محبت سے بمشکل قابو کیا۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ قدرے پُرسکون ہوا اور اس نے ڈھنگ سے بات کرنی شروع کی...... اسے گاؤں کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کی بہن صفیہ مر چکی ہے اور شیر علی قتل ہو چکا ہے۔ اپنے رقیب جمالے کی گرفتاری سے بھی وہ بے خبر تھا۔ وہ اب تک کراچی میں تھا آج سویرے والی گاڑی سے وہ لاہور پہنچا تھا اور وہاں سے سیدھا گاؤں چلا آیا تھا۔ اس کے سینے میں رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ نوراں کو مار کر خود بھی مر جانا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ نوراں نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ شادی سے چند دن پہلے وہ اس کے گھر سے بھاگ گئی اور اپنے پرانے یار جمالے کے نکاح میں آنے کی تیاری کرنے لگی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ نوراں نے یہ کڑا گھونٹ صرف اس کی زندگی بچانے کے لئے پیا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ جمالے کے ہاتھوں مارا نہ جائے۔ وہ خاموشی سے جمالے کے ساتھ چلی آئی تھی۔ اس نے زندگی میں صرف ایک بار پیار کیا تھا۔ صرف ایک بار اس کے دل کی کلی کھلی تھی اور یہ کلی کھلانے والا فیقا تھا۔ وہ بُری عورت نہیں تھی۔ وہ اچھی عورت تھی۔ صرف تھوڑی سی بزدل تھی۔ وہ آج بھی بڑی خاموشی سے فیقا کا انتظار کر رہی تھی۔ اس دن کا انتظار کر رہی تھی جس کی روشنی میں وہ اپنے محبوب کا چہرہ دیکھ سکے۔ میں نے فیقا کو بڑی تسلی اور بڑی تفصیل سے نوراں اور جمالے کے بارے میں سب کچھ بتایا اور بتایا کہ وہ نوراں کو کیا سمجھتا ہے اور وہ کیا ہے۔

فیقا جو چند گھنٹے پہلے نوراں کو قتل کرنے پر آمادہ تھا۔ ایک دم ہی اس کی یاد میں آنسو بہانے لگا۔ لگتا تھا وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ عشق نے اسے ایسی پٹخنیاں دی تھیں کہ بلال شاہ کے لفظوں میں وہ ''باؤنتر'' گیا تھا۔ وہ اچانک ہی نوراں سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ''حوصلہ رکھو جوان! ملاقاتیں بھی ہو جائیں گی پہلے یہ بتاؤ۔ اب تک تم تھے کہاں؟''

جواب میں اس نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس رات شیر علی کی حویلی سے نکل کر وہ سیدھا امرتسر پہنچا تھا۔ وہاں سے لاہور اور لاہور میو ہسپتال میں چند روز علاج کرانے کے بعد کراچی نکل گیا تھا۔ وہ نوراں اور نوراں کی دنیا سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا...... اس

عورت کو بھول جانا چاہتا تھا جس نے اس سے ماں باپ، بہن بھائی ملازمت اور گھر سب کچھ چھڑا دیا تھا لیکن دل پر کسی کا زور کب چلا ہے۔ فیقا بھی دن رات تڑپتا رہا اور کچھ بھول نہ سکا۔ آخر اس نے اپنی اور نوراں کی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

تھانے میں میرے کمرے کی کھڑکیوں سے باہر چاند رات ڈھل چکی تھی۔ چند گھنٹوں میں عید کا پُر مسرت دن طلوع ہونے والا تھا۔ یہ عید سب کے لئے خوشیوں کا پیغام لا رہی تھی لیکن جو پُر امید چمک فیقا کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی وہ ہر خوشی سے بڑھ کر تھی۔ اجالے کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ نوراں سے ملنے والا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں گر کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے والے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنی کہانی سنانے والے تھے۔ نوراں اسے بتانے والی تھی کہ شادی سے چند روز پہلے وہ اچانک اس کا گھر چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی اور فیقا اسے بتانے والا تھا کہ اس شام جب گھر واپس آ کر اس نے اسے نہیں پایا تھا تو اس پر کیا بیتی تھی۔ محبت کی کہانی پھر وہیں سے شروع ہونے والی تھی جہاں سے اس کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ رات بڑی مختصر تھی اور روزِ عید کی پہلی کرن نمودار ہونے والی تھی۔

☆======☆======☆

سہاگن اور قاتلہ

اس شخص کا فسانۂ عبرت جو خود کو باتدبیر سمجھتا تھا۔ اس نے ایک حسین عورت کے فتنہ خیز حسن میں اندھا ہو کر اس کے گرد ہوس کا جال پھیلا دیا تھا لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ عورت کے جذبۂ انتقام سے لاعلم تھا۔

ایک زخم خوردہ عورت کے انتقام کی کہانی وہ جذبۂ انتقام میں آخری حد تک چلی گئی تھی۔

میں نے زور سے بریک لگائی اور جیپ کو ریورس کر کے بازار کی طرف موڑا......

میرے پہنچنے تک کھیل ختم ہو چکا تھا۔ تین نوجوان لڑکے اپنے جیسے ایک نوجوان کو بُری طرح مار پیٹ کر رفو چکر ہو چکے تھے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا نوجوان کا سر پھٹا ہوا تھا۔ چہرہ خون سے تر بتر تھا۔ ایک ہتھیلی پر تیز دھار آلے کا گہرا کٹ تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کا داہنا ٹخنہ ٹوٹ چکا تھا۔ یہ واقعہ امرتسر کے ایک بھرے پُرے بازار میں ہوا تھا۔ اس بازار میں ''صاحب ہوٹل'' کافی مشہور تھا۔ قریبی کالج کے پڑھے لکھے نوجوان اس میں اکثر بیٹھے نظر آتے تھے۔ سڑک کی طرف بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے ان شیشوں میں سے ہوٹل کے ہال کمرے کا قیمتی فرنیچر اور سرخ قالین پر گھومتے پھرتے باوردی بیرے نظر آتے تھے لیکن اس وقت شیشے تھے نہ بیرے اور فرنیچر بھی سارا اُلٹ پلٹ نظر آتا تھا۔ یہ ساری ابتری اس لڑائی کی وجہ سے پھیلی تھی جو زخمی ہونے والے لڑکے اور دیگر تین لڑکوں میں ہوئی تھی۔ ہال کی کئی کرسیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ دیوار گیر شیشے ٹوٹ کر سڑک پر بکھرے ہوئے تھے اور بیرے ہراساں و پریشاں بھاگے پھر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ہوٹل کا منیجر دہائی دینے لگا کہ اس کا ہزاروں کا نقصان ہو گیا ہے۔ وہ برباد ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

زخمی لڑکے کو فوراً ہسپتال پہنچانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے گاڑی میں ڈالا اور دو گواہوں کو ساتھ لے کر ہسپتال چلا گیا۔ اس لڑکے نے اپنا نام بسواجیت بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ سیٹھ کرشن کمار باڈی والے کا بیٹا ہے۔ باڈی والا ایک مشہور شخص تھا اور میں نے اس کا نام بھی سن رکھا تھا۔ ان دنوں امرتسر میں ڈگی والی چند ہی گاڑیاں تھیں اور اُن میں ایک گاڑی باڈی والا کی بھی تھی۔ لڑکے کو فوراً ایمرجنسی میں پہنچایا گیا اور اس کے دیئے ہوئے فون نمبر کے ذریعے اُس کے گھر میں اطلاع کر دی گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد سوا چھ فٹ قد کا اُونچا لمبا سیٹھ اپنی بھاری بھرکم مونچھوں کے نیچے سے سگار کا دھواں نکالتا ہوا موقعہ پر پہنچ گیا۔ اُس کی عمر پینتالیس سال سے اوپر رہی ہو گی لیکن اچھی صحت اور سوٹ بُوٹ کی وجہ سے وہ پینتیس کے قریب نظر آ رہا تھا۔ ساتھ اُس کی دھرم پتنی بھی تھی۔ وہ عمر میں اُس سے چھوٹی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ سیٹھ نے زیادہ عمر میں شادی کی ہے یا یہ اُس کی دوسری بیوی ہے۔ میاں بیوی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پھر ہدایت کی کہ ہسپتال سے فارغ ہو کر وہ دونوں تھانے آ جائیں تا کہ اُن کے بچے سے مار پیٹ کرنے والوں کے خلاف پرچہ کاٹا جائے۔ یہ واقعہ میرے تھانے کے علاقے میں ہوا تھا اس لیے ظاہر تھا کہ انہیں میرے ہی پاس آنا تھا۔

وہ لوگ قریباً چار بجے شام میرے پاس آئے۔ باڈی والا کے ساتھ اُس کا ایک رشتے دار اور ایک ملازم بھی تھا۔ ملازم باہر تھانے کے احاطے میں بیٹھا رہا۔ باقی دونوں افراد بات کرنے کے لیے اندر میرے پاس کمرے میں آ گئے۔ باڈی والا کے آنے سے پہلے پہلے میرا مخبرِ خاص بلال شاہ مجھے باڈی والا کے پورے خاندانی حالات بتا چکا تھا۔ امرتسر کے قریباً تمام اہم لوگوں کے بارے میں بلال شاہ کے پاس معلومات کا ذخیرہ موجود تھا۔ فلاں شخص کی کتنی جائیداد ہے۔ اُس میں کتنے حصہ دار ہیں، حصے داروں کی کتنی کتنی بیویاں ہیں۔ بیویوں کی کتنی کتنی اولادیں ہیں۔ کون سی اولاد کس اولاد سے خار کھاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اتفاق سے بلال شاہ باڈی والا کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتا تھا۔ اُس نے مجھے جو کچھ بتایا اُس میں سے سب سے اہم بات یہ تھی کہ قریباً ایک سال پہلے باڈی والا کی بیٹی ہیما اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اور باڈی والا نے پریتم نامی ایک لڑکے اور اُس کے گھر والوں کے خلاف ہیما کے اغوا کا کیس درج کرایا تھا۔ (یہ واقعہ میرے اس تھانے میں آنے سے پہلے کا تھا) بلال شاہ نے قیافہ لگایا تھا کہ باڈی والا کے لڑکے سے ہونے والی مار پیٹ اسی واقعہ کا شاخسانہ ہو سکتی ہے۔

بلال شاہ کا یہ قیافہ سو فیصد درست نکلا۔ تنہائی ملتے ہی باڈی والا نے مجھ سے کہا۔ ''انسپکٹر نواز صاحب! اب اس بات کو کوئی ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ میری بڑی بیٹی جس کی عمر ابھی صرف سترہ سال سات ماہ تھی، اغوا کر لی گئی۔ اغوا کرنے والا پریتم نامی نوجوان تھا۔ اُس کے اور اُس کے بے غیرت والدین کے بارے میں سب کچھ آپ کی فائل میں لکھا ہو گا۔ آج میرے بیٹے کو مار مار کر ادھ مؤا کرنے والے بھی وہی لوگ ہیں۔ انہوں نے اُس پر چاقو سے

وار کیے ہیں۔ یہ تو اُس کی قسمت اچھی تھی کہ جان بچ گئی ورنہ انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آپ ابھی اور اِسی وقت اُن لوگوں پر 302 کا کیس درج کریں۔''

باڈی والا بہت طیش میں نظر آتا تھا۔ ساتھ آنے والے رشتے دار کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں کی مونچھیں غصے میں پھڑک رہی تھیں۔ میں نے اُن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں، مجرم بچ نہیں سکیں گے۔ بس مجھے دو تین گھنٹے دے دیں۔ سب کچھ سامنے آجائے گا۔''

باڈی والا پھنکارا۔ ''دو تین گھنٹے، ہم نے پورا سال دیا ہے آپ کو...... اور نتیجہ کیا نکلا ہے۔ وہی رٹا رٹایا فقرہ، گھبرائیں نہیں...... مجرم بچ نہیں سکیں گے۔ کیا وہ اب تک بچے نہیں ہوئے؟''

باڈی والے کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔ میں نے اپنا دھیما لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی دوسرے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔'' آپ سے میرے ملاقات صرف تین گھنٹے پہلے ہوئی ہے اور آپ کے کیس کا پتہ مجھے صرف ایک گھنٹہ پہلے لگا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، جو کچھ میں کر سکا ضرور کروں گا۔''

باڈی والا کا رشتے دار بولا۔ ''معاف کرنا۔ تم لوگ صرف باتیں کر سکتے ہو۔ اگر کچھ کیا ہوتا تم نے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا ہم کو...... ہم یہاں تم سے نہیں تمہارے ایس پی سے بات کرنے آئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟ اُن سے بات کراؤ۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی جی! تم اپنے لہجے کو قابو میں رکھو۔ میں ذرا اور طرح کا بندہ ہوں۔ عزت کرتا ہوں اور کرواتا ہوں۔''

وہ ہتھے سے اکھڑنے لگا۔ ''بڑے دیکھے ہیں عزت کرنے والے اور کروانے والے تم خوامخواہ بات نہ بڑھاؤ۔''

اسی دوران بلال شاہ بھی اندر ٹپک پڑا۔ اُس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ باڈی والا کے ٹھاٹ باٹ اور اپنی خستہ حالی کی پرواہ کیے بغیر بولا۔ ''سیٹھ جی! یہ انسپکٹر صاحب نئے آئے ہیں یہاں۔ مہینہ ڈیڑھ ہوا ہے بس...... آپ ان کو نہیں جانتے۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، کر کے دکھائیں گے۔ آپ خواہ مخواہ الزام دے رہے ہیں ان کو...... ان کو تو آپ کے کیس کی الف ب کا بھی پتہ نہیں۔''

بلال شاہ کا لہجہ اور تیور دیکھ کر باڈی والا اور اُس کا رشتے دار کچھ نرم پڑ گئے۔ رہی سہی کسر ایک انسپکٹر نے پوری کر دی۔ وہ اندر آیا اور بڑے احترام سے مجھے ملا۔ باڈی والا بھی اس انسپکٹر کو جانتا تھا۔ انسپکٹر نے اچھے لفظوں میں میرا تعارف کرایا اور باڈی والا سے تھانے میں

پوچھی...... باڈی والا نے وہی باتیں کہیں جو اس سے پہلے مجھ سے کہہ چکا تھا۔ باڈی والا کی بیٹی والے کیس کا اس انسپکٹر کو بھی پتہ تھا۔ اس نے باڈی والا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ گھبرائیں مت جی...... جو انسپکٹر نواز صاحب کریں گے وہ ایس پی بھی نہیں کرے گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر رپورٹ درج کرائیں اور اس بات پر وشواس رکھیں کہ مجرم بچ نہیں سکیں گے۔''

باڈی والا کے بیان کے مطابق میں نے رپورٹ درج کر لی۔ باڈی والا نے اپنی رپورٹ میں پچھلے کیس کا حوالہ بھی دیا۔ اُس نے بتایا۔ ''میری نابالغ بچی کو اغوا کرنے والا پریتم کمار نامی نوجوان ہے۔ اس کا والد ایک ریٹائرڈ کلرک ہے اور بہت خرانٹ شخص ہے۔ بیٹے کے جرم میں وہ برابر کا شریک رہا ہے۔ یہ لوگ ہمارے پڑوس میں کرائے دار تھے۔ ملزم پریتم کمار اکثر تاک جھانک میں مصروف رہتا تھا۔ آخر وہ نابالغ بچی کو ورغلا کر لے گیا۔ اس واقعے کو اب پورے گیارہ ماہ اور دس دن بیت چکے ہیں۔ پولیس ابھی تک ملزم اور مغویہ کا کوئی کھوج نہیں لگا سکی۔ ملزم کے گھر والے اُس سے لاتعلقی کا اظہار کرتے رہے ہیں حالانکہ انہیں یقین تھا کہ ملزم پریتم کمار اُن سے ملنے کے لیے چوری چھپے آتا رہتا ہے۔ ہم نے اس بارے میں ایس ایچ او کو آگاہ بھی کیا تھا مگر اُس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ میرا بیٹا بسواجیت دہلی کے کیڈٹ کالج میں پڑھتا ہے اور وہیں ہاسٹل میں رہتا ہے۔ ان دنوں وہ امرتسر آیا ہوا ہے۔ آج کسی طرح اُسے پتہ چلا کہ ملزم پریتم امرتسر میں ہی ہے اور ''صاحب ہوٹل'' میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ جوان خون تھا، اس نے جوش کھانا تھا۔ بسواجیت موٹر سائیکل لے کر ''صاحب ہوٹل'' پہنچ گیا۔ اطلاع بالکل درست نکلی۔ پریتم کمار وہاں موجود تھا۔ بسواجیت نے اُس کا گریبان پکڑا اور پریتم کمار اپنے ساتھیوں سمیت اُس پر ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے نہ صرف اس کا پاؤں توڑ دیا بلکہ جان سے مارنے کے لیے اُس پر چاقو کے وار کیے۔ یہ وار بسواجیت نے اپنے ہاتھوں پر روکے۔ قسمت اچھی تھی کہ لوگ جمع ہو گئے اور ملزم بسواجیت کو نیم جان چھوڑ کر بھاگ گئے۔''

مکمل رپورٹ درج کرنے کے بعد میں نے باڈی والا سے ملزم کے والدین کا پتہ پوچھا اور انہیں اس وعدے کے ساتھ رخصت کر دیا کہ آج رات نو بجے سے پہلے پہلے میں خود آ کر انہیں تفتیش سے آگاہ کروں گا۔

باڈی والا کے جاتے ہی میں نے اپنے سب انسپکٹر فرزند علی کو ہدایت کی اور وہ ''بھگتاں والا دروازہ'' سے جا کر ملزم پریتم کے والد اور چچا کو لے کر تھانے آ گیا۔ پریتم کے والد کا نام رام لعل تھا۔ وہ سفید سر اور موٹے شیشوں کی عینک والا ریٹائرڈ شخص تھا۔ سفید شلوار قمیص، گلے

میں مفلر، پاؤں میں چپل، پہلی نظر میں وہ مجھے خرانٹ نظر آیا اور نہ ہی چکر باز۔ اُس کے چہرے پر مظلومیت برس رہی تھی۔ یہی حال اُس کے بھائی کا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ لوگ بے قصور ہیں۔ کیونکہ اگر یہ بے قصور نہ ہوتے اور انہیں پریتم کے بارے میں کچھ پتہ ہوتا تو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ''باڑی والا'' جیسا بااثر شخص اُن سے کچھ اگلوا نہ لیتا۔ وہ تو انہیں حوالات سے باہر ہی نہ آنے دیتا جب تک وہ سب کچھ قبول نہ کر لیتے۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے رام لعل کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ عینک اتار کر آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب، ہم نردوش ہیں۔ میرا کوئی دوش ہے تو صرف یہ کہ میں پریتم کا باپ ہوں۔ اس ''دوش'' کی سزا میں پچھلے ایک برس سے مجھ پر اتنے ظلم توڑے گئے ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔'' اُس نے اپنی قمیص کی آستینیں اوپر اُٹھا کر سگریٹ کے داغے جانے کے نشان دکھائے۔ اپنی انگلیاں دکھائیں جن میں سے کئی ایک ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی تشدد کے کئی نشان اُس کے جسم پر موجود تھے۔ وہ بولا۔ ''کسی کے ساتھ ظلم زیادتی ہو تو وہ پولیس کے پاس جاتا ہے۔ میں کس کے پاس جاتا اور کیا شکایت کرتا۔ تھانیدار باڑی والا کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اسی کمرے میں اسی جگہ کھڑے ہو کر رو رو کر دہائی دی تھی کہ باڑی والا کے آدمی مجھے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ مارتے پیٹتے ہیں۔ سگریٹ سے جلاتے ہیں۔ بجلی لگاتے ہیں...... میں نے اپنا جلا ہوا جسم بھی دکھایا تھا لیکن کسی نے میری بات پر وشواس نہیں کیا۔ انسپکٹر بولا تھا۔ ''بڈھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پھر میرا دماغ ٹھکانے پر لانے کے لیے انسپکٹر مجھے اور میرے اس بھائی کو پکڑ کر تھانے لے آیا تھا۔ سخت سردی میں انسپکٹر نے ہمیں ننگا کر کے ساری رات اُلٹا لٹکائے رکھا اور وہ ظلم کیا کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ وہ ہم سے پریتم کا پتہ پوچھتا تھا۔ کہتا تھا تم نے پریتم کے ساتھ مل کر باڑی والا کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اب اُن دونوں کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ سات روز بعد پانچ سو روپیہ رشوت دے کر اور منتوں واسطوں سے ہماری جان چھوٹی تھی......'' عمر رسیدہ شخص ہچکیوں سے رونے لگا۔ پھر روتے روتے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! جان نکالنی ہے تو ایک ہی بار نکال لو۔ یوں تھوڑا تھوڑا کر کے مت مارو۔ پھانسی پر چڑھا دو مجھے اور میرے گھر والوں کو اور باڑی والا کا کلیجہ ٹھنڈا کر دو۔''

مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ رام لعل پر زیادتی ہوئی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ جاتے جاتے باڑی والا نے مجھ سے کہا تھا، انسپکٹر! وہ بڑا خرانٹ شخص ہے۔ اس کی باتوں پر نہ جانا۔ وہ اندر سے شیطان ہے شیطان۔

مجھے وہ اندر اور باہر کہیں سے شیطان نظر نہیں آیا تھا۔ بہت ہوشیاری چالاکی والی بات بھی اس میں نہیں تھی۔ بیٹے سے والدین کی محبت تو قدرتی بات ہے اور ہو سکتا تھا کسی موقع پر اُس نے بیٹے کو بچانے کی کوشش کی ہو لیکن یہ سمجھنا کہ اُس نے بیٹے کو کہیں چھپا رکھا ہے، صحیح نہیں تھا۔ میں نے اُسے تسلی تشفی دی اور کہا کہ وہ مجھے انسپکٹر نہیں اپنا بیٹا سمجھے اور اس بات کا یقین رکھ کر کہ ہر ممکن اس کی مدد کی جائے گی۔ ہر بات کھول کر بتا دے۔

وہ بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا درجنوں مرتبہ پولیس والوں کو بتا چکا ہوں۔ جن دنوں یہ واقعہ ہوا میں نے ایک جنرل سٹور کھول رکھا تھا۔ سارا دن وہاں بیٹھتا تھا۔ مجھے اُس بد بخت پریتم کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے۔ اُس نے بی ایس سی کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ چند ہفتے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کی۔ پھر نوکری چھوٹ گئی اور وہ نئی نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ اُس میں ہمت اور لگن تھی۔ مجھے وشواس تھا کہ مجھے اُس کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑیں گے۔ کہیں نہ کہیں سے روزگار ڈھونڈ ہی لے گا وہ...... لیکن پھر کہیں سے باڑی والا کی بیٹی ٹپک پڑی۔ باڑی والا غلط کہتا ہے کہ وہ نابالغ تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی بسواجیت سے صرف ایک برس چھوٹی تھی اور بسواجیت نے تین سال پہلے ایف ایس سی کا امتحان دیا تھا۔ میرے خیال میں ہیما کی عمر بیس سال سے کم نہیں تھی۔ باڑی والا کی اولاد میں وہ سب سے تیز طرار لڑکی ہے۔ معلوم نہیں اُس نے پریتم پر کیا جادو کیا کہ وہ سب کچھ بھول بھال کر اُس کے چکر میں پڑ گیا۔ ہمیں تو اُس وقت پتہ چلا جب وہ دونوں گھر سے غائب ہو چکے تھے...... اُن کے غائب ہوتے ہی باڑی والا نے اور انسپکٹر جانی نے ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دیئے اور تو اور میری بیوی تک کو نہیں بخشا گیا۔ انسپکٹر جانی نے پورے اڑتالیس گھنٹے اُسے بھوکا پیاسا تھانے میں بٹھائے رکھا اور ٹھوکریں مار مار کر اُس کی ٹانگیں نیلی کر دیں۔''

رام لعل نے عینک اتار کر ایک بار پھر آنسو پونچھے اور بولا۔ ''میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں انسپکٹر۔ پچھلے ایک برس میں مجھے پریتم کا صرف ایک خط ملا ہے۔ یہ اُس کے جانے کے ایک مہینے بعد کی بات ہے۔ اُس وقت ہم نے ابھی ایشور کالونی والا مکان بدلا نہیں تھا۔ خط اُسی مکان کے پتے پر تھا۔ خط میں پریتم نے ماں کا حال پوچھا تھا اور اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا تھا۔ اس خط پر جالندھر کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی نام پتہ اُس پر موجود نہیں تھا۔ یہ خط انسپکٹر جانی نے کیس کی فائل میں لگا لیا تھا۔ میرے خیال میں اب بھی لگا ہوا ہو گا۔''

میں نے فائل نکلوا کر دیکھی اُس میں دس ماہ پہلے لکھا ہوا وہ خط موجود تھا...... ضروری

پوچھ گچھ کے بعد میں نے رام لعل اور اُس کے بھائی کو واپس بھیج دیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ امرتسر سے باہر نہ جائیں۔ رام لعل بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا کہ اگر باڈی والا کی طرف سے اُس پر کسی قسم کی زیادتی ہو تو وہ مجھے اطلاع پہنچائے میں فوراً سدباب کروں گا۔

☆======☆======☆

اگلے روز میں نے زخمی بسواجیت کے علاوہ ہوٹل منیجر کرم سنگھ کا تفصیلی بیان بھی لیا۔ کرم سنگھ نے بتایا کہ جن نوجوانوں نے باڈی والا کے بیٹے سے جھگڑا کیا وہ اکثر ہوٹل میں آتے رہتے تھے۔ اُن کے پاس نیلے رنگ کی ایک اسکوڈا کار تھی۔ کبھی موٹر سائیکلوں پر بھی آ جاتے تھے۔ عام طور پر وہ پیدل ہی آتے تھے۔ کرم سنگھ نے کہا کہ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے والوں کے نام پتے انہیں معلوم نہیں ہوتے۔ ایسے گاہک کتنے بھی پرانے ہوں اکثر ہوٹل یا ریستوران والوں کے لیے اجنبی ہی رہتے ہیں۔ کرم سنگھ صرف ایک لڑکے کا نام بتا سکا۔ وہ اُن میں سب سے لمبا اور صحت مند تھا۔ اُسے دوسرے لڑکے سونی کہتے تھے۔ بسواجیت کو مارنے والوں میں یہ لمبا لڑکا سب سے آگے آگے تھا اور اُسی نے شیشم کی وزنی کرسی مار کر بسواجیت کا تختہ توڑا تھا۔ کرم سنگھ نے بتایا کہ لڑائی ایک دم شروع ہو گئی تھی۔ بسواجیت ہال کمرے میں آ کر سیدھا لڑکوں والی میز پر گیا۔ اس نے پیلی جرسی والے ایک لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کے ساتھ ہی مارا ماری ہونے لگی۔ بسواجیت دلیر لڑکا ہے۔ اُس نے شروع میں تینوں لڑکوں کو اچھی خاص چوٹیں لگائیں لیکن پھر ایک لڑکے نے چاقو نکال لیا۔ دوسرے نے اس کی گردن پر پیچھے سے مکہ مارا اور وہ گر گیا۔ اس کے بعد وہ سارے اُسے پیٹنے لگے۔

میں نے منیجر کرم سنگھ سے پوچھا۔ ''پیلی جرسی والا دوبارہ تمہارے سامنے آئے تو اسے تو پہچان لوگے؟''

وہ بولا۔ ''کیوں نہیں جناب! میں نے اُسے درجنوں مرتبہ دیکھا ہے۔''

میں نے جیب سے پریتم کی تصویر نکال کر اُسے دکھائی۔ یہ تصویر میں نے فائل سے حاصل کی تھی۔ تصویر دیکھ کر کرم سنگھ فوراً اقرار میں سر ہلانے لگا۔ اُس نے کہا۔ ''بالکل جناب یہی وہ لڑکا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ یہ لڑکے کبھی کبھی کار یا موٹر سائیکلوں پر بھی آتے تھے۔ کسی گاڑی کا نمبر یاد ہے تمہیں۔''

وہ بولا۔ ''میں پھر وہی بات کہوں گا جناب۔ ہمیں کبھی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ اُن کے نام پتے پوچھیں یا گاڑی کا نمبر نوٹ کریں۔ ہاں آئندہ کے لیے یہ وعدہ ہے کہ اُن میں سے کسی پر کہیں بھی نظر پڑی فوراً آپ کو اطلاع پہنچائیں گے۔''

میں نے منیجر سے پوچھا۔ ''تمہارے نقصان کا کیا بنا؟''

وہ بولا۔ ''بھگوان کی کرپا سے سب پورا ہو گیا جی۔ باڈی والا نے حساب کر کے سب ادا کر دیا ہے۔''

منیجر سے فارغ ہو کر میں ہسپتال پہنچا تا کہ بسواجیت کا تفصیلی بیان لے سکوں۔ بسواجیت اب ہوش میں تھا۔ وہ کسرتی جسم والا ایک گورا چٹا لڑکا تھا۔ بلال شاہ نے بتایا تھا کہ ہیما، بسواجیت اور اُن کی چھوٹی بہن نینی باڈی والا کی پہلی بیوی سے ہیں۔ وہ بیوی طلاق حاصل کر چکی ہے اور ان دنوں جالندھر میں رہتی ہے۔ باڈی والا نے دوسری شادی کی تھی۔ اِس دوسری بیوی کا تعلق چندی گڑھ کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس شادی کو اب چار سال ہو چکے تھے لیکن اولاد نہیں ہوئی تھی۔

بسواجیت نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے مجھے طویل بیان دیا۔ لڑائی کے متعلق تمام باتیں وہی تھیں جو اس سے پہلے منیجر کرم سنگھ بتا چکا تھا۔ بسواجیت نے شروع میں تو چھپایا تھا لیکن اب بتا دیا کہ پریتم کے بارے میں اطلاع اُسے اپنی چھوٹی ماں کے ذریعے ملی تھی۔ وہ چھوٹی ماں کو آپو کہتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''آپو ملازمہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھیں۔ لنچ کا وقت گزر رہا تھا اس لیے انہوں نے سوچا کہ پکا پکایا کھانا لے جائیں۔ صاحب ہوٹل کے سامنے انہوں نے گاڑی رکوائی اور بنگالی ڈرائیور کو کھانا لانے کے لیے بھیجا۔ اسی دوران اُن کی نظر شیشوں کی دوسری طرف پریتم پر پڑ گئی۔ وہ دوستوں کے ساتھ گپ بازی کر رہا تھا۔ آپو فوراً گھر پہنچیں اور مجھے بتایا کہ رام لعل کا لڑکا ''صاحب ہوٹل'' میں بیٹھا ہوا ہے۔ میرا خون کھول اُٹھا اور میں موٹر سائیکل پکڑ کر سیدھا صاحب ہوٹل پہنچ گیا۔''

میں نے کہا۔ ''دماغ گرم کرنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ اگر تم خود ہلہ بولنے کی بجائے تھانے کی طرف سے ہوتے ہوئے گزر جاتے تو اس وقت وہ بدمعاش سلاخوں کے پیچھے ہوتا...... ہوتا یا نہیں؟''

بسواجیت سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ یقیناً اب اُسے بھی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اُس سے چند مزید سوال جواب کیے اور پھر اُس کی مصروفیات کے بارے میں پوچھ کر تھانے واپس آ گیا۔

میں نے سارے شہر کی پولیس کو چوکس کر دیا تھا۔ مخبروں کو بھی پریتم کی تصویر دکھا دی گئی تھی۔ اب امید تو نہیں تھی کہ اُن لڑکوں میں سے کوئی ''صاحب ہوٹل'' کا رُخ کرے گا پھر بھی میں نے سادہ کپڑوں میں ایک کانسٹیبل وہاں مقرر کر دیا۔ دو تین ہفتے سرگرمی سے ملزمان کی تلاش جاری رہی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ پریتم اس شہر میں رہتا ہی نہیں۔ شاید وہ دوستوں سے ملنے آیا تھا اور مل کر واپس چلا گیا تھا۔ اُس نے اپنے گھر میں جو واحد خط لکھا وہ جالندھر سے تھا۔ میں نے کیس کی فائل دیکھی۔ انسپکٹر جانی نے اس لائن پر کافی تفتیش کی تھی...... جالندھر شہر سے اُس نے دو تین آدمی بھی پکڑے تھے مگر کوئی کلیو نہیں ملا تھا۔ بعدازاں ہوشیار پور سے پریتم کے ایک دوست کو پکڑا گیا تھا۔ بعد میں اس کا جسمانی ریمانڈ بھی لیا گیا مگر ''یہ محنت'' بھی کارگر نہیں ہوئی تھی۔

میں نے بھی مختلف طریقوں سے تفتیش جاری رکھی۔ گاہے بگاہے رام لعل سے بھی ملاقات کرتا رہا۔ اسی طرح تین چار ماہ گزر گئے۔ کوئی ایسی پیش رفت نہیں ہوئی جسے کامیابی قرار دیا جا سکتا۔

☆======☆======☆

اگست کی آخری تاریخوں میں مجھے ایک نجی کام کے سلسلے میں سیالکوٹ جانا پڑا۔ پندرہ بیس روز بعد واپسی ہوئی۔ اُس روز میں پہلی مرتبہ تھانے آیا تھا جب صبح سویرے مجھے بلال شاہ نے ایک دھماکہ خیز خبر سنائی۔ وہ حسبِ عادت طوفانی بگولے کی طرح کمرے میں داخل ہوا' دہلیز پر ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ ''خان صاحب! وہ باڈی والا کا بیٹا تھا ناں بسواجیت؟''

میں نے کہا ''ہاں تھا۔ کیا ہوا اُسے؟''

''وہ قتل ہو گیا جناب...... ابھی تھوڑی دیر پہلے گشتی پارٹی کے حوالدار احمد رضا نے اطلاع دی ہے۔ وہ نہر کے کنارے کنارے گاڑی چلاتا جالندھر روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ چھوٹے پُل کے پاس کسی نے اُسے گولی مار دی۔ گاڑی سڑک سے اُتر کر درخت میں لگی ہے اور وہیں کھڑی ہے۔ حوالدار نے بتایا ہے کہ لاش بھی اندر ہی موجود ہے۔''

یہ ایک دردناک اطلاع تھی۔ بسواجیت کا ورزشی جسم اور سرخ و سپید چہرہ میری نگاہوں میں آیا اور مجھے اس کی موت کی اطلاع جھوٹی محسوس ہونے لگی۔ میں نے بلال شاہ سے کہا۔ ''کہیں احمد رضا کو دھوکا تو نہیں ہوا۔''

وہ بولا۔ ''نہیں خان صاحب! بڑا کھڑکناں ہے احمد رضا۔ اُس نے بڑی اچھی طرح

پہچانا ہے اور باڈی والا کی گاڑی کا نمبر بھی درج کرایا ہے۔'' اسی دوران میرا اسسٹنٹ انسپکٹر فرزند علی بھی اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ بلال شاہ کی اطلاع درست ہے۔

مشکل سے ساڑھے سات بجے ہوں گے۔ ابھی سڑکوں پر رش شروع نہیں ہوا تھا۔ ہم جیپ پر سوار ہو کر بڑی سڑک پر آئے اور کمپنی باغ کے سامنے سے گزر کر دس منٹ کے اندر جائے واردات پر پہنچ گئے۔ نہر کے کنارے پر سڑک اتنی مصروف نہیں تھی پھر بھی تیس چالیس افراد موقعہ پر اکٹھے ہو چکے تھے۔ کچھ سائیکلیں، موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں بھی اِدھر اُدھر کھڑی تھیں۔ میں نے باڈی والا کی ڈگی والی گاڑی دور ہی سے پہچان لی۔ وہ پختہ سڑک پر بیس تیس گز لہرانے کے بعد کچے میں اُتری تھی اور ایک کیکر سے ٹکرا گئی تھی۔ گاڑی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ صرف بونٹ ٹیڑھا ہوا تھا یا سائیڈ کا ایک شیشہ ٹوٹا تھا۔ حوالدار اور اس کے عملے نے گاڑی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔

ہم موقعہ پر پہنچے تو بسواجیت کی لاش فرنٹ سیٹ پر پڑی نظر آئی۔ وہ اپنے بائیں پہلو پر لڑھکا ہوا تھا۔ گولی اُس کے سر میں کان سے ذرا اوپر لگی تھی اور زخم سے نکلنے والا خون اس کے کپڑوں اور سیٹ پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ چار ساڑھے چار ماہ پہلے میں نے اسی نوجوان کو شدید زخمی حالت میں ''صاحب ہوٹل'' کے فرش پر پڑے پایا تھا اور آج وہ مُردہ حالت میں گاڑی کی نشست پر پڑا تھا۔ ان ساڑھے چار مہینوں میں اُس کے پہلے زخم مندمل ہو چکے تھے لیکن آج جو زخم لگا تھا وہ کبھی مندمل نہیں ہونا تھا۔

اس قتل کے سلسلے میں دھیان فوری طور پر انہی لڑکوں کی طرف جاتا تھا جن سے بسواجیت کی جنگ ہوئی تھی اور جن کو وہ اب بھی امرتسر کے گلی کوچوں میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ اُس کی عزت کے قاتل تھے اور آج...... اُس کے قاتل بھی بن گئے تھے۔ میں نے بڑے دھیان سے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ موقعہ پر موجود عملے کا خیال تھا کہ مقتول کو سڑک کے کنارے سے گولی ماری گئی ہے۔ میرا خیال مختلف تھا۔ اس کی ایک وجہ تو ''زخم'' کا زاویہ تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ گولی بلندی سے کافی قریب سے چلائی گئی ہے۔ دوسرے مجھے گاڑی کے اندر بھی جدوجہد کے معمولی سے آثار نظر آ رہے تھے۔ پچھلی سیٹ پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ ایک سیٹ کا غلاف سرکا ہوا تھا اور عقب نما آئینہ ٹیڑھا نظر آ رہا تھا یہ عین ممکن تھا کہ قاتل گاڑی کے اندر ہی ہو۔ چلتی گاڑی میں دونوں نے ہاتھا پائی کی ہو اور گاڑی درخت سے ٹکرا گئی ہو۔ بعدازاں قاتل یا قاتلوں نے بسواجیت کو گولی ماری ہو اور بھاگ نکلے ہوں۔

جب ہم لاش کو ایمبولینس میں ڈال رہے تھے، باڈی والا خود بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اُس

کی سرخ آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے تھے اور چہرہ برسوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ دو آدمیوں نے اُسے دائیں بائیں سے سہارا دے رکھا تھا۔ اُس نے بیٹے کا چہرہ دیکھا اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ واقعی اُس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ پتہ نہیں کن کرموں کا پھل تھا۔ پہلے اُس کی جوان بیٹی گھر سے غائب ہوئی۔ اب اکلوتا بیٹا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا اور پچھلی سیٹ پر راکھ کے پہاڑ کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

اس موقع پر پریتم کے والد اور چچا کو حراست میں لینا ضروری تھا۔ تفتیش کے لیے بھی اور اُن کی حفاظت کے لیے بھی۔ عین ممکن تھا کہ باڈی والا کی فیملی کا کوئی شخص جوشِ انتقام میں اُن کو نقصان پہنچاتا۔ اُن کو پکڑ کر تھانے لایا گیا۔ وہ دونوں ایک بار پھر زار و قطار رو رہے تھے اور بڑی بڑی قسمیں کھا رہے تھے کہ انہیں کچھ پتہ نہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔ رام لعل نے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میری بیوی ہسپتال میں ہے۔ اُس کی حالت بڑی خراب ہے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ ورنہ وہ زندہ نہیں بچے گی۔''

میں نے رام لعل کو تسلی دی کہ اُس کی گرفتاری کے بارے میں مریضہ کو خبر نہیں ہوگی......

بسواجیت کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جا چکی تھی۔ دوپہر کے بعد میں بسواجیت کے غمزدہ باپ کا بیان قلمبند کرنے اُس کی کوٹھی واقعہ ایشور کالونی پہنچا۔ باڈی والا صدمے سے نڈھال ایک صوفے پر نیم جان پڑا تھا۔ اُس نے بتایا۔ ''میں روزانہ صبح سیر کے لیے کمپنی باغ جاتا ہوں لیکن رات کو بسوا نے مجھ سے کہا' پاپا صبح مجھے گاڑی چاہیے۔ میں نے کہا' ٹھیک ہے لے جانا۔ وہ گڈ نائٹ کر کے چلا گیا...... بس یہ اُس کی آخری گڈ نائٹ تھی۔ صبح پانچ بجے کے قریب میں نے اپنے بیڈ روم میں گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ میں اُٹھ کر باہر لان میں ٹہلنے کے لیے آ گیا۔ بسوا اس وقت تک جا چکا تھا...... ساڑھے سات بجے کے قریب فون آ گیا کہ بسوا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

میں نے گھر کے ملازموں سے بھی بیانات لیے۔ بسواجیت جس وقت گھر سے گیا ایک خانساماں کے سوا سب ملازم سو رہے تھے۔ چوکیدار چھٹی پر تھا۔ خانساماں نے بتایا کہ اُس نے چھوٹے مالک کو گاڑی لے جاتے تو نہیں دیکھا لیکن پانچ بجے کے قریب گاڑی کی آواز ضرور سنی تھی۔ اُس نے سوچا کہ شاید بڑے مالک سیر کے لیے جا رہے ہیں۔ وہ نماز پڑھنے میں مصروف تھا اس لیے گیٹ کھولنے اور بند کرنے نہیں جا سکا۔

میں نے باڈی والا کی دوسری بیوی کا بیان بھی لیا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کی خوبصورت عورت تھی بلکہ اُسے لڑکی کہنا چاہیے۔ اُس کا نام شاردا تھا۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں بھی سوجی

ہوئی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ رات تک بسواجیت بالکل ہشاش بشاش اور مطمئن تھا۔ اُس نے صبح سویرے اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے جانا تھا اور اسی لیے اپنے پاپا سے گاڑی لے کر گیا تھا۔ شاردا نے یہ بھی بتایا کہ ''صاحب ہوٹل'' والے واقعے کے بعد پریتم یا اُس کے دوستوں سے بسواجیت کی مڈھ بھیڑ پھر نہیں ہوئی۔ کم از کم شاردا کو اُس بارے میں معلوم نہیں تھا۔ ویسے بھی زخمی ٹانگ کی وجہ سے بسواجیت نے پچھلے چار ماہ گھر میں ہی بند ہو کر گزارے تھے۔

اگلے روز صبح کو جواں مرگ بسواجیت کی ارتھی جلائی گئی اور اُسی روز شام کو اُس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی۔ بسواجیت کی موت دماغ میں گولی لگنے سے ہوئی تھی۔ پولیس سرجن نے میرے اس اندازے کی تصدیق کی تھی کہ گولی گاڑی کے اندر سے ہی چلائی گئی ہے۔ گولی کے سر میں گھسنے کا زاویہ بھی ایسا تھا جس سے اس اندازے کی تصدیق ہوتی تھی۔ متوفی کے جسم پر معمولی جدوجہد کے آثار بھی تھے۔ رپورٹ کا سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے چند انسانی بال ملے تھے۔ یہ بال کسی ادھیڑ عمر شخص کے تھے۔ ایسے ہی چند بال متوفی کے لباس پر بھی تھے۔ بالوں کو تفصیلی معائنے کے لیے لاہور بھجوا دیا گیا تھا۔

یہ بہت خاص پوائنٹ تھا۔ ہمارا شبہ اب تک اُنہی لڑکوں پر تھا جو اس سے پہلے بسواجیت کو قتل کرنے کی کوشش کر چکے تھے مگر رپورٹ بتا رہی تھی کہ مرنے سے پہلے بسواجیت کی کسی ادھیڑ عمر شخص سے ہاتھا پائی ہوئی ہے۔ یہ ادھیڑ عمر کون ہو سکتا تھا...... تفتیش کے اس مرحلے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ''کار چھیننے'' کی سیدھی سادی واردات ہو۔ کوئی شخص بسواجیت سے لفٹ لے کر گاڑی میں سوار ہو گیا ہو اور بعد میں اس پر پستول تان لیا ہو اور یہ بھی امکان موجود تھا کہ اس واردات کا تعلق کسی ایسے معاملے سے ہو جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ بسواجیت دہلی میں پڑھتا تھا اور وہیں ہوسٹل میں رہتا تھا۔ نوجوان جہاں رہتے ہیں وہاں کئی کہانیاں بھی بنا لیتے ہیں۔ ممکن تھا کہ کوئی ایسی ہی کہانی بسواجیت کے لیے جان لیوا ثابت ہو گئی ہو۔ پھر یہ کوئی گھریلو تنازعہ بھی ہو سکتا تھا۔ عیال دار شخص جب دوسری شادی کرتا ہے تو بیوی کے ساتھ ہی کئی جھگڑے بھی گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان تمام راستوں پر تفتیش کرنی تھی۔ تاکہ ٹھیک راستہ اختیار کر کے سچائی تک پہنچا جا سکے۔

میں نے اپنے سب انسپکٹر فرزند علی کو ضروری ہدایات دے کر دہلی روانہ کر دیا تاکہ وہ بسواجیت کے کالج سے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کرے اور اُس کے دوستوں سے

مل جل کر اُس کے ''پرائیویٹ'' حالات کا پتہ چلائے۔ بلال شاہ کے ذمے میں نے یہ کام لگایا کہ وہ باڈی والا کے گھریلو حالات کا کھوج لگائے اور اگر کوئی جائیداد وغیرہ کی اُلجھن ہے تو اُس کی تفصیلات معلوم کرے۔ تیسری جانب پریتم اور اُس کے دوستوں کی تلاش بھی نئے جوش وخروش سے شروع کر دی گئی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اس بھاگ دوڑ کا کوئی نتیجہ سامنے آ جائے گا۔

وہ ستمبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ موسم بدل رہا تھا۔ میں اپنے دفتر سے نکلا اور باہر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ گھر سے ناشتہ کیے بغیر نکل آیا تھا۔ اس لیے بھوک لگ رہی تھی۔ سوچا آج بلال شاہ والا ناشتہ ہی کر لیا جائے۔ وہ دہی کی میٹھی لسی کے ساتھ گرما گرم کلچے کھاتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس ناشتے کی مخالفت کی تھی لیکن کبھی کبھی دل میں آتا تھا کہ ایک بار دیکھا تو جائے کیا ''سواد'' ہے۔ میں نے سنتری سے کہا اور وہ میرے اور اے ایس آئی کے لیے لسی اور کلچے لے آیا۔ چھ کلچے تھے اور ایک بڑا جگ لسی کا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ شیطان کو یاد کرو تو شیطان حاضر ہو جاتا ہے۔ ابھی سنتری نے ناشتہ میز پر رکھا ہی تھا کہ مین گیٹ کے پاس بلال شاہ کی آواز سنائی دی...... ناشتہ سخت ''خطرے'' میں تھا۔ نہ اس سے ہمارا کچھ بنتا تھا اور نہ بلال شاہ کا، بلکہ اُس کی تو داڑھ بھی گیلی نہیں ہونی تھی۔ میں نے سنتری کو اشارہ کیا اور وہ فوراً ناشتہ سمیت کر رجسٹرار کے کمرے میں رکھ آیا۔ بلال شاہ نے آ کر سلام دعا کی اور کرسی پر بیٹھتے ہی ناک سکوڑنے لگا۔

''کیا بات ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کہیں سے کلچوں کی خوشبو آ رہی ہے۔'' اُس نے اعلان کیا۔

''خوشبو......؟ مجھے تو نہیں آ رہی۔''

''نہیں جی...... آ رہی ہے...... میں شرط لگا سکتا ہوں۔''

''بھئی کلچے کون کھائے گا یہاں۔'' میں نے اُس کی تسلی کرائی۔ ''میں نے تو آج تک نہیں کھائے...... اور کون لا سکتا ہے کلچے۔''

وہ بُو ہلی کتے کی طرح ناک سے سُوں سُوں کرتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی تیز ناک تھی کم بخت کی۔ سیدھا رجسٹرار کے کمرے میں گھسا اور چند ہی سیکنڈ بعد وہاں سے لسی کلچے لے کر برآمد ہو گیا۔ بٹنوں جیسی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''میں نے کہا تھا ناں آپ سے۔'' وہ سینہ پھلا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں۔ یہ سب حوالدار کنگن سنگھ کا کام ہے۔ بڑا پیٹو رام ہے وہ۔ وہاں صندوقوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا سب

کچھ......'' اُس نے تیز نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا۔ ''اب کہاں گیا ہے وہ...... کہیں آپ نے تو نہیں بھیجا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کے نفی میں سر ہلایا۔

بلال شاہ نے شیطانی نظروں سے کلچوں کو گھورا اور دست درازی شروع کر دی۔ ایک پورا کلچہ اُس کے دو نوالوں کی مار تھا اور لسی پینے کے لیے تو وہ گلاس استعمال ہی نہیں کرتا تھا بس جگ اُٹھایا اور دو گھونٹوں میں آدھا کر دیا۔ مجھے دعوت دینے کی اُس نے ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ وہ جانتا تھا میں کلچے نہیں کھاتا اور اگر کھاتا بھی ہوتا تو ایسے موقعوں پر بلال شاہ کان، آنکھیں سب کچھ بند کر لیتا تھا صرف منہ کھلا رکھتا تھا۔

ناشتے کو چاروں شانے چت کرنے کے بعد بلال شاہ نے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک مخمور ڈکار لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ جگ اور گلاس وہ پہلے ہی میز کے نیچے کھسکا چکا تھا۔ شرارتی لہجے میں بولا۔ ''کنگن سنگھ کو پتہ نہیں چلنا چاہیے جی۔''

''نہیں چلے گا'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''تم بتاؤ...... کیا رپورٹ لائے ہو؟''

''کیسی رپورٹ؟'' اُس نے حیرانی سے کہا۔

جی چاہا جوتا اتار کر اُس کے سر پر ماروں۔ چار روز پہلے میں نے اُس کی ''ذمے داری'' لگائی تھی کہ وہ باڈی والا کے نوکروں سے سن گن لے اور آج وہ کہہ رہا تھا کیسی رپورٹ۔ میں نے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھائی میرے! وہی رپورٹ جو تم لینے کے لیے گئے تھے۔''

''آچھا......'' اُس نے رانوں پر ہاتھ مارا، میرا دھیان کسی اور طرف چلا گیا تھا۔ ''گھر والی آج کل پھر اچار وغیرہ کھا رہی ہے ناں!''

میں نے کہا۔ ''بھاڑ میں جائے تمہارا اچار...... مجھے باڈی والا کے بارے میں بتاؤ۔''

بلال شاہ نے سگریٹ سلگا کر دو گہرے کش لیے اور آہستہ آہستہ اس کے لمبے چوڑے چہرے پر سوچ کے سائے لہرانے لگے۔ بلال شاہ کو سوچتے دیکھ کر ایسے ہی لگتا تھا جیسے کوئی بیل الجبرے کے مشکل سوال پر غور کر رہا ہو۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''خان صاحب! باڈی والا کا خانساماں رمضان علی بڑا گڈ آدمی ہے۔ میں نے اس سے جان پہچان پیدا کر لی ہے۔ ادھر ریلوے لائن کے پار کچی آبادی میں رہائش ہے اُس کی۔ ویسے وہ خود باڈی والا کے گھر میں ہی رہتا ہے۔ میں نے اُسے بتایا ہے کہ میں خود بھی خانساماں رہا ہوں اور کئی اونچے گھرانوں میں کام کرنے کے علاوہ گجرات میں اپنا ہوٹل بھی چلاتا رہا ہوں۔ کھانے تو مجھے سارے ہی پکانے آتے ہیں۔ رمضان علی کو میری کسی بات پر شک نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے بڑا بے تکلف ہو گیا ہے اور کھل کر باتیں کرنے لگا ہے۔ باڈی والا کے بارے میں بھی میں نے اس سے کئی

باتیں پوچھی ہیں۔ کل باتوں باتوں میں رمضان علی نے مجھے ایک عجیب بات بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قتل کے روز جب صبح سویرے گاڑی کوٹھی سے گئی تو وہ جاگ رہا تھا اور اپنے کوارٹر میں نماز پڑھ رہا تھا۔ یہ بات اُس نے اپنے بیان میں بھی بتائی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُسے شک ہے کہ اُس وقت گاڑی چھوٹے صاحب نہیں بڑے صاحب لے کر گئے تھے...... اپنے اس شک کی وجہ وہ گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اتنا عرصہ اس گھر میں ملازم رہنے کے بعد وہ اپنے مالکوں کی کئی چھوٹی بڑی عادتیں جان چکا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ بڑے مالک جب صبح گاڑی اسٹارٹ کرتے ہیں تو انجن ڈیڑھ دو منٹ بالکل دھیمی آواز میں چلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ دو یا تین مرتبہ زور سے ریس دیتے ہیں اور مین گیٹ سے نکلتے وقت ہارن بالکل نہیں بجاتے لیکن جب چھوٹے صاحب صبح کے وقت گاڑی نکالتے ہیں تو اسٹارٹ کرتے ہی فوراً زور زور سے ریس دیتے ہیں اور ایک منٹ کے اندر اندر گیٹ سے نکل جاتے ہیں۔ اکثر وہ مین گیٹ سے نکلتے ہوئے ہارن بھی بجاتے ہیں۔ اُس روز نماز پڑھتے ہوئے رمضان علی نے جو آوازیں سنیں اُن سے اُسے شک ہوتا ہے کہ بائیس ستمبر کی صبح پانچ بجے کوٹھی سے گاڑی نکالنے والے چھوٹے صاحب نہیں بڑے صاحب تھے۔''

یہاں تک بتا کر بلال شاہ نے میرے پیکٹ سے نیا سگریٹ نکالا اور اُسے سلگا کر بولا۔ ''رمضان علی نماز پڑھنے کے بعد پورچ میں آیا تھا۔ گاڑی جا چکی تھی۔ ناشتہ آٹھ بجے کے بعد تیار ہونا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کوارٹر میں آکر تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ دوبارہ اُس کی آنکھ رونے چلانے کی آوازوں سے کھلی۔ ایک ملازمہ نے اُسے روتے ہوئے بتایا کہ چھوٹے صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

رمضان علی کا تازہ بیان اہم تھا۔ یہ بیان اُس نے پولیس کے سامنے نہیں دیا تھا ایک ایسے شخص کے سامنے دیا تھا جسے وہ اپنا ہم پیشہ اور دوست سمجھ رہا تھا۔ بلال شاہ نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''رمضان علی نے ''باڈی والا'' کے گھریلو حالات ویسے تو پُرسکون ہی بتائے ہیں لیکن ایک خاص بات کا ذکر اُس نے ضرور کیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ اکیس ستمبر کی رات یعنی جس رات کی صبح بسواجیت قتل ہوا، نو بجے کے قریب کوٹھی کی بالائی منزل سے ''باڈی والا'' کے بہت زور سے بولنے کی آواز آئی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ کسی پر بڑے زور سے گرج رہے ہوں۔ اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ رمضان علی اُس وقت باورچی خانہ سنبھال رہا تھا۔ باورچی خانہ سنبھال کر اُس نے اپنے ایک ملازم سے پوچھا تھا کہ کیا اُس نے بھی بڑے صاحب کی آواز سنی ہے۔ اُس نے انکار میں جواب دیا تھا۔ بعد میں رمضان علی عشاء کی نماز

پڑھ کر سو گیا تھا۔ رمضان علی کا کہنا ہے کہ بڑے صاحب کی وہ ڈانٹ چھوٹے صاحب کو پڑی ہو۔''

بلال شاہ کی اس رپورٹ سے تفتیش کو آگے بڑھانے میں بہت مدد مل سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد بلال شاہ تو سونے کے لیے اپنے گھر چلا گیا اور میں خالی پیٹ کمرے میں ٹہل ٹہل کر اس کیس کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ مجھے رہ رہ کر اُن بالوں کا خیال بھی آ رہا تھا جو مقتول کی اُنگلیوں سے نکلے تھے اور جن کے بارے میں پولیس سرجن کا ابتدائی اندازہ یہ تھا کہ وہ کسی ادھیڑ عمر شخص کے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ حیرت ناک سوال اُبھرنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ باڈی والا کا اکلوتا بیٹا خود اُس کے اپنے ہاتھوں ہی قتل ہو گیا ہو۔

یہ بات ویسے تو ناممکن نظر آتی تھی لیکن تفتیش کے دوران کسی چیز کو بھی ناممکن نہیں سمجھا جاتا۔ تاریکی کے پردے میں سے کوئی چیز بھی سامنے آ سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ اندرونِ خانہ باڈی والا اور اُس کے بیٹے میں کچھ ایسے شدید اختلافات پیدا ہو چکے ہوں جو بڑھتے بڑھتے اس قتل کا سبب بن گئے ہوں۔

اگر واقعی کوئی ایسا واقعہ رُونما ہوا تھا تو ہمیں اُس کی تہہ تک پہنچانے کے لیے ایک راستہ موجود تھا۔ مقتول کے پاس سے برآمد ہونے والے بالوں کا موازنہ باڈی والا کے بالوں سے کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ باڈی والا کے بال بھی سفیدی مائل ہیں اور اُن کی لمبائی کم و بیش اتنی ہی ہے جتنی پولیس سرجن اور ایگزامینر کی رپورٹ میں لکھی ہے۔ یہ کیس اب ایک بالکل نیا رخ اختیار کر رہا تھا۔ اگر رمضان علی کا بیان درست تھا اور وقوعہ کے روز صبح پانچ بجے بسواجیت کی بجائے باڈی والا خود گاڑی لے کر گیا تھا تو اُسے کیا ضرورت تھی یہ بات چھپانے کی اور یہ کہنے کی کہ اُسے بیٹے کی موت کا علم گھر میں بیٹھے ہوا ہے۔ اُس وقت گیٹ پر چوکیدار بھی موجود نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ چوکیدار کو کسی منصوبے کے تحت چھٹی پر بھیجا گیا ہو۔ یہ اور اس طرح کے کئی سوال میرے ذہن میں اُبھر رہے تھے۔ میرے پاس سب سے اہم سراغ اس وقت وہ بال تھے جو تجزیے کے لیے لاہور کی لیبارٹری میں تھے۔ ان بالوں کا موازنہ باڈی والا کے بالوں سے کر کے بات کی تہہ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ اب مسئلہ باڈی والا کے بالوں کا تھا۔ میں یہ بال اس طرح حاصل کرنا چاہتا تھا کہ باڈی والا کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو لیکن یہ کام کافی مشکل تھا۔ لہٰذا میں ایک روز باڈی والا کے دفتر واقع جالندھر روڈ پہنچا۔ باڈی والا دراصل بسوں اور ٹرکوں وغیرہ کے ڈھانچے بنانے کا کام کرتا تھا۔ مضافاتی علاقے میں اُس کی ایک وسیع و عریض فیکٹری تھی۔ اسی حوالے سے اُس کا نام ''باڈی والا'' پڑا تھا۔ میں

نے اس کے خوبصورت دفتر میں اُس سے ملاقات کی۔ وہ بے حد غمگین نظر آتا تھا۔ غالباً شراب نوشی بھی کررہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور چہرے پر جھریاں تھیں۔ پچھلے چھ سات روز میں وہ اپنی عمر سے آٹھ دس سال بڑا لگ رہا تھا۔ یعنی پورا حساب لگایا جاتا تو بیٹے کی موت نے اُسے چند دنوں میں بیس سال آگے پھینک دیا تھا۔ نہ اُس میں پہلے والی تن فن نظر آرہی تھی اور نہ ہی آواز میں کرارا پن تھا۔

"کیا بات ہے انسپکٹر؟" وہ مجھے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ چونک گیا۔ "کیوں......کیا کرنے ہیں میرے بال؟"

میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "ایگزامینر کو ضرورت تھی۔ وہ کہتا ہے کہ مقتول کے بالوں کا موازنہ اُس کے والد یا والدہ کے بالوں سے کرنا ہے۔ ہوگا اُس کا کوئی مسئلہ۔ یہ لوگ ایسی ہی فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔"

باڈی والا نے نکتہ اُٹھایا۔ "لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ تو مکمل ہوکر آچکی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مقتول کے بالوں کے کچھ گچھے مزید معائنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔"

میری باتوں سے "باڈی والا" کی پوری تسلی تو نہیں ہوئی۔ بہرحال اُس نے چھوٹی قینچی منگوا کر اپنے بالوں کی دو لٹیں مجھے کاٹ دیں۔

اُسی روز میں نے یہ بال اپنے انسپکٹر فرزند علی کے ہاتھ لاہور بھجوا دیئے اور شدت سے رپورٹ کا انتظار کرنے لگا...... اگلے روز مجھے تھانے کے پتے پر ایک گمنام خط ملا۔ ایسے خط اکثر تھانوں میں آتے رہتے ہیں۔ لوگ اپنا نام چھپا کر مخبری کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف دشمنیاں چکاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان خطوں کے ذریعے کی جانے والی مخبری ہمارے لیے بڑی فائدے مند ثابت ہوتی ہے۔ میں نے لفافہ کھولا۔ یہ کاپی سائز کے دو صفحوں کا خط تھا۔ تحریر سے اندازہ ہوتا تھا کہ لکھنے والا تعلیم یافتہ ہے۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا:

"انسپکٹر نواز خاں صاحب! اخباری خبروں سے مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ باڈی والا کے بیٹے کے قتل کی تفتیش کررہے ہیں۔ مجھے اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن ایک قانون پسند شہری ہونے کی بنا پر اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کیس کے حوالے سے میرے پاس کوئی اطلاع ہو تو آپ کو پہنچاؤں۔ میں پولیس کچہری کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا اس لیے اس خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ جو اطلاع میں آپ کو دے رہا ہوں یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے نہیں دے رہا۔ آگے آپ کی مرضی کہ اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔

باڈی والا کے بیٹے بسواجیت کا قتل بائیس ستمبر کو ہوا۔ اکیس ستمبر کو رات نو دس بجے میں ایشور کالونی کے مارکیٹ والے گول چکر میں موجود تھا۔ آپ نے یہ گول چکر دیکھا ہی ہوگا۔ یہاں گراؤنڈ بنی ہے اور پودے وغیرہ لگے ہیں۔ لوگ رات گئے تک یہاں بیٹھے رہتے ہیں اور کئی سوئے بھی رہتے ہیں۔ یہاں ایک دو "تیل مالش" والے بھی گھومتے رہتے ہیں۔ اُس رات میں بھی ایک مالشیے سے مالش کرا رہا تھا۔ اچانک میری نظر باڈی والا کے بیٹے بسواجیت پر پڑی۔ محلے دار ہونے کے سبب میں اُسے دور ہی سے پہچان گیا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے ہونٹوں میں سگریٹ تھا اور وہ ہاتھ پاؤں پھینک پھینک کر چل رہا تھا۔ ٹانگ کی چوٹ ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ ذرا لنگڑا رہا تھا۔ لنگڑاتا ہوا وہ ہمارے پاس سے گزرا اور تھوڑی دور ایک پودے کے پیچھے گھاس پر لیٹ گیا۔

میں چونکہ اندھیرے میں تھا' وہ مجھے دیکھ نہیں سکا۔ وہ بے حد پریشان نظر آرہا تھا۔ کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا' کبھی گھاس مٹھیوں میں بھر کر اکھاڑنے لگتا' کبھی پتھر کے بنچ پر لیٹ جاتا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ گھر میں کسی سے لڑ جھگڑ کر آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سگریٹ کا پیکٹ ختم ہوگیا تو اُس نے ایک قریبی ریسٹورنٹ کے ملازم کو بلایا۔ اس ریسٹورنٹ کے ملازم ہاتھوں میں خالی ٹرے لیے اکثر گول چکر میں گھومتے رہتے ہیں۔ بسواجیت نے اُس ملازم کے ہاتھوں سگریٹ منگوائے۔ ساتھ میں شامی کباب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتل بھی تھی۔

میں رات قریباً بارہ بجے تک گول چکر میں موجود رہا۔ میرے آنے تک بسواجیت وہیں تھا۔ اگلے روز نو بجے کے قریب مجھے پتہ چلا کہ وہ قتل ہوگیا ہے۔ میں اس معاملے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ جو جانتا ہوں وہ بتا دیا ہے۔ اگر میری اطلاع سے آپ کو تفتیش میں فائدہ پہنچ سکے تو مجھے خوشی ہوگی...... فقط ایک شہری۔"

میں نے یہ خط دو تین دفعہ پڑھا اور ہر دفعہ یہی اندازہ ہوا کہ لکھنے والا پُرخلوص ہے اُس نے جو کچھ دیکھا ہے بتا دیا ہے۔ اس خط کی کڑی دوسرے واقعات کی کڑیوں میں ٹھیک بیٹھ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خود بخود ایک زنجیر سی بنتی جارہی ہے۔ میں نے تنہائی میں بیٹھ کر اپنے ذہن میں اس زنجیر کا جو نقشہ کھینچا وہ کچھ اس طرح تھا۔

یوں لگتا تھا کہ پچھلے دنوں باڈی والا اور اُس کے بیٹے میں کسی بات پر شدید قسم کا تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ اکیس ستمبر کی رات یہ تنازعہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اس سلسلے میں خانساماں

رمضان علی کا بیان خاصا اہم تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ رات نو بجے کے لگ بھگ باڈی والا کسی پر بری طرح گرج برس رہا تھا اور عین ممکن ہے کہ اُس کا یہ غیض وغضب بیٹے کے لیے ہو۔ اگر اس بات کو درست تسلیم کرلیا جاتا تو گمنام خط کے مضمون کی تصدیق خود بخود ہو جاتی تھی۔ باپ کی سرزنش سے دل برداشتہ ہو کر بسواجیت گھر سے نکل آیا...... اور یہ بھی ممکن تھا کہ باپ نے اُسے نکل جانے کا حکم دیا ہو۔ وہ اپنے گھر سے چند فرلانگ دور مارکیٹ گول چکر میں جا بیٹھا اور اپنے آپ میں کھولنے لگا۔ آخر اس کا طیش اس انتہا کو پہنچ گیا کہ اس نے اپنے باپ کو جان سے مارنے کا فیصلہ کرلیا...... اب یہاں دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ بسواجیت صبح سویرے باپ کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور جب وہ سیر پر جاتے ہوئے اُدھر سے گزرا تو بسواجیت نے ہاتھ دے کر گاڑی روک لی اور زبردستی یا حیلے سے اُس میں سوار ہو گیا۔ دوسری صورت یہ تھی وہ غصے میں کھولتا ہوا رات آخری پہر واپس گھر پہنچا۔ بیرونی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا اور پورچ میں پہنچ گیا۔ گاڑی کی ایک چابی اُس کے پاس بھی موجود تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور پچھلی نشست کے عقبی خلا میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ بھرا ہوا ریوالور اُس کے پاس موجود تھا۔ پانچ بجے حسبِ معمول باڈی والا صاحب آئے اور گاڑی میں سوار ہو کر کمپنی باغ کی طرف چل دیئے۔ نہر کے سنسان علاقے میں بسواجیت عقب سے نکلا اور باپ پر ریوالور سیدھا کرلیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں گولی چلی اور بسواجیت اپنے ہی ریوالور کا شکار ہو گیا۔ مُردہ بیٹے کو دیکھ کر ''باڈی والا'' سکتے میں رہ گیا لیکن پھر اُس نے خود کو سنبھالا دیا۔ اُس نے اگنیشن سے اپنی چابی نکال کر بسواجیت والی چابی لگائی۔ اسٹیئرنگ وغیرہ سے انگلیوں کے نشان صاف کیے اور گاڑی وہیں چھوڑ کر ایشور کالونی واپس آ گیا۔

ان دونوں صورتوں کے علاوہ بھی اس قتل کی کئی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ریوالور بیٹے کی بجائے باپ کے پاس ہو' اور باپ نے غصے میں حواس کھو کر اُسے گولی ماردی ہو۔ بہر طور آخری نتیجہ بالوں کی رپورٹ آنے کے بعد نکلنا تھا...... اس کام میں قریباً ایک ہفتہ لگ گیا۔ میں ایک واردات کا موقعہ دیکھنے ''لونگاں والی کھوئی'' گیا ہوا تھا۔ وہیں پر ایک ہیڈ کانسٹیبل کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ شہر سے لیبارٹری کی رپورٹ آگئی ہے اور رپورٹ والا لفافہ تھانے میں میری میز پر رکھا ہے۔

میں نے موقعہ پر اپنا کام ادھورا چھوڑا اور بھاگم بھاگ تھانے پہنچا۔ رپورٹ لانے والا کانسٹیبل بھی میرے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے لفافہ کھولا...... بالوں کی رپورٹ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی بسواجیت اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ اُس کی انگلیوں میں پھنسے ہوئے

اور لباس پر پائے جانے والے بال ''باڈی والا'' کے تھے۔ اب شک وشبے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میں نے اسی وقت گارد اپنے ساتھ لی اور باڈی والا کو حراست میں لینے کے لیے ایشور کالونی روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

شام ہو چکی تھی لیکن ''باڈی والا'' کی وسیع وعریض کوٹھی تاریک نظر آ رہی تھی۔ پورچ میں باڈی والا کی گاڑی بھی دکھائی نہیں دی۔ آثار دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اتنے میں باڈی والا کا چوکیدار بھی گیٹ پر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا مالک کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''گھر پر نہیں ہے جناب۔''

میں نے پوچھا۔ ''اور بیگم صاحب۔''

''وہ بھی نہیں ہے جناب!''

''کہاں گئے ہیں؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب۔ میری ڈیوٹی یہاں گیٹ پر ہے۔ میں تو یہ بتا سکتا ہوں جناب کہ کون گھر میں ہے اور کون نہیں۔ باقی بات کا مجھے پتہ نہیں ہوتا جناب۔ میں رمضان علی اور کا کا رام کو بلاتا ہوں جناب۔ وہ آپ کو بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے جناب۔''

''ذرا جلدی کرو جناب!'' میں نے اُس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد باقی دونوں نوکر بھی موقعہ پر پہنچ گئے۔ خانساماں رمضان علی اُن میں سینئر تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر تھوڑا سا گھبرایا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ''آپ اندر آ جائیں جی۔''

وہ ''اجازت'' نہ بھی دیتا تو اندر تو ہم کو جانا ہی تھا۔ ہم کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔ ''ہاں بھئی رمضان علی۔ کہاں ہیں تمہارے صاحب اور تمہاری بیگم صاحبہ۔''

وہ روہانسا ہو کر بولا۔ ''ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی جی۔ پتہ نہیں اس گھر پر کیا گزر رہی ہے اور کیا گزرنے والی ہے۔ ہر کام یہاں الٹا ہو رہا ہے۔ میں نے ابھی مالک کے چھوٹے بھائی صاحب کو فون کیا ہے۔ وہ ابھی آتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ جی اپنا گھر سنبھالیں اور ہمیں چھٹی عنایت فرمائیں۔ ہمیں تنخواہ کے علاوہ اور کیا لینا دینا ہے۔ خواہ مخواہ تھانے کچہری کے چکروں میں پھنس رہے ہیں۔''

''کیوں کیا بات ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اتنے مایوس کیوں نظر آ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''مایوس نہیں ہیں جی...... ڈر رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے اس گھر میں۔ کل

رات گیارہ بارہ بجے بیگم صاحبہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لے کر گھر سے نکلیں اور پیدل ہی مارکیٹ چوک کی طرف نکل گئیں۔ ہم حیران تھے کہ یہ کیا وقت ہے گھر سے نکلنے کا اور وہ بھی تن تنہا بغیر سواری کے...... مگر ملازم پیشہ ہیں۔ نہ بیگم صاحبہ کو روک سکتے تھے اور نہ اُن کے جانے پر اعتراض کر سکتے تھے...... صبح بڑے مالک نے پوچھا کہ مالکن کہاں ہیں؟ ہم نے بتایا کہ وہ رات کو چلی گئی تھیں۔ مالک اندر چلے گئے۔ کچھ دیر الماریوں میں کچھ تلاش کرتے رہے۔ پھر اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ناشتہ کیا اور نہ ہی دوپہر کا کھانا کھایا۔ ڈھائی بجے کے قریب گاڑی لے کر نکلے اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ سارا گھر اُسی طرح کھلا پڑا ہے۔ کوئی بے ایمان نوکر ہوتا تو پتہ نہیں کیا کر گزرتا۔ خدا گواہ ہے ہم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا...... آیئے میرے ساتھ۔ میں آپ کو دکھاؤں۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں اُس کے ساتھ کوٹھی کی اوپری منزل پر پہنچا۔ گھر کی دونوں نوکرانیاں صحن میں چٹائی بچھائے بیٹھی تھیں۔ رمضان علی ہمیں اندر کمروں میں لے گیا۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ الماریوں کے پٹ کھلے تھے۔ دراز نکلے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ آہنی سیف بھی مقفل نہیں تھا۔ میں نے سیف کا دروازہ کھولا۔ اند، دس بارہ تولے سونے کے علاوہ نقدی بھی موجود تھی۔ لکڑی کی الماریوں سے نکلنے والے قیمتی پارچات اور دیگر سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ باہر جانے سے پہلے ''باڈی والا'' یہاں کوئی چیز تلاش کرتا رہا ہے۔ اُس کی پریشان حالی اور غائب دماغی اس بات سے ظاہر تھی کہ وہ سب الماریاں دروازے یونہی کھلے چھوڑ کر نکل گیا تھا اور اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ کب واپس آئے گا اور آئے گا بھی یا نہیں۔ یوں لگتا تھا کہ اُس کی دماغی حالت کچھ ٹھیک نہیں رہی۔ اُس کے ہاتھوں اپنا اکلوتا بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ اپنے وارث کو اُس کے اپنے ہاتھوں سے گولی لگ گئی تھی...... اُس کی بیٹی پہلے ہی اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا چکی تھی۔ اب بیوی بھی اُس سے روٹھ کر یا اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایسی حالت میں بندے کا دماغ خراب نہ ہو تو اور کیا ہو۔ آخر باڈی والا کے ساتھ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ مجھے اُس کے پیچھے کوئی گہرا راز نظر آ رہا تھا۔

دن ہوا اور پھر اگلی رات آ گئی۔ باڈی والا گھر واپس آیا اور نہ اُس کی بیوی۔ باڈی والا کا چھوٹا بھائی دیپک پرشاد ایشور کالونی پہنچ چکا تھا اور اُس نے بھائی کے گھر کی چابیاں سنبھال لی تھیں۔ دیپک پرشاد ایک سرکاری ملازم تھا اور پہلی نظر میں وہ مجھے بھلا مانس نظر آیا۔ کم از کم باڈی والا سے تو بھلا مانس تھا۔ اُس نے گھر کے سب کمروں کو تالے لگا دیئے اور اپنے استعمال کے لیے بالائی منزل پر صرف ایک کمرہ کھلا رکھا۔ وہ اس بات کا اظہار کھلے لفظوں میں کر رہا تھا

کہ باڈی والا کی دوسری بیوی اس کے گھر میں نحوست بن کر آئی ہے۔ چار پانچ برس پہلے باڈی والا جتنا خوش و خرم تھا آج اتنا ہی غمزدہ اور بدحال ہے۔ دیپک نے بڑے وثوق سے کہا کہ شاردا مخلص عورت نہیں۔ وہ صرف بھائی صاحب کی دولت سے محبت کرتی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ بھائی صاحب کی آنکھیں بند ہوں اور وہ جائیداد سے اپنا حصہ حاصل کرے۔

میں نے کہا۔ ''دیپک صاحب! آپس میں محبت کرنا یا نہ کرنا میاں بیوی کا ذاتی معاملہ ہے اور جہاں تک جائیداد کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ حصے کی حق دار ہے۔ وہ باڈی والا کی قانونی پتنی ہے۔ ہم تو شاردا کو تب ہی الزام دے سکتے ہیں۔ جب اُس نے کسی طرح باڈی والا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔''

باڈی والا کا بھائی تنک کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! اور نقصان کیسا ہوتا ہے۔ اُس عورت نے گھر تو برباد کر دیا ہے ہمارے بھائی کا، جو کچھ ہے گھر میں سمیٹ سمیٹ کر پچھلوں کو بھیجتی رہتی ہے۔ اس کے بھائی کرتے ورتے کچھ نہیں بس دنیا کو دکھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کام کر رکھے ہیں انہوں نے۔ کوئی موٹر مکینک ہے کوئی سکول میں نوکری کرتا ہے، کسی نے دکان کھول رکھی ہے۔ نظریں اُن سب کی بہن کی طرف ہی لگی رہتی ہیں۔ وہ ہر دوسرے ہفتے جاتی ہے اور اگلے پندرہ دنوں کا خرچہ اُن کے گھروں میں ڈال آتی ہے۔ بالکل منگتے ہیں وہ لوگ...... پتہ نہیں یہ عورت کس جنم کا بدلہ لے رہی ہے بھائی سے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہیما جو گھر چھوڑ کر گئی ہے تو اس میں بھی شاردا کا ہاتھ ہے۔ ماں جیسا رویہ تو اس کا تھا ہی نہیں۔ ہر وقت سہیلی بن کر گھسی رہتی تھی اُس کی بغل میں...... میں اب کیا بتاؤں آپ کو۔ کپڑا اُٹھانے سے اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کس نیچ ذات کی عورت ہے یہ۔ مجھے یقین ہے کہ اُسے ہیما اور اس حرامی پریتم کے میل جول کا پتہ تھا بلکہ ہو سکتا ہے یہ وچولی بن کر ان کی ملاقاتیں بھی کراتی رہی ہو۔ ہمارے بھائی صاحب کی تو بس آنکھیں ہی بند ہیں شاردا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا انہیں اور اب سب کچھ لٹا کر بھی اندھے بنے ہوئے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اور بسواجیت کے قتل کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا۔''

وہ بولا۔ ''یہ بھی ہیما والے قصے کا شاخسانہ ہے۔ کم بخت نے برباد کر دیا ہے سارے گھرانے کو۔ نہ ہیما گھر سے جاتی نہ غیرت مند بھائی کا خون کھولتا اور نہ وہ اُن لڑکوں کو تلاش کرتا کرتا اُن کے ہاتھوں مارا جاتا۔''

میں نے دیپک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ بسواجیت پریتم

وغیرہ کے ہاتھوں نہیں مارا گیا تو......؟''

''تو......تو کس کے ہاتھوں مارا گیا؟''

''کسی کے ہاتھوں بھی یہ کام ہوسکتا تھا۔ مثلاً خود باڈی والا۔''

دیپک کا چہرہ حیرت میں ڈوب گیا۔ ''یہ......یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بسواجیت، بھائی صاحب کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُن کا واحد وارث۔ وہ اُسے کیسے مار سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم کچھ زیادہ پریشان ہوگئے ہو۔ میں نے تو ایک مفروضہ پیش کیا تھا۔ تفتیش میں ایسے مفروضے گھڑنے ہی پڑتے ہیں۔ ویسے ایک بات بتاؤ تم باڈی والا کے سب سے قریبی عزیز ہو۔ ظاہر ہے اس گھر کے حالات کا تمہیں کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ علم ہے......باڈی والا کے تعلقات اپنے بیٹے سے کیسے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ کیا اُن کے درمیان کوئی ایسا معاملہ تھا جو کسی وقت بڑھ کر تنازعے کی شکل اختیار کرلیتا۔''

دیپک تشویشناک نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھے معلوم نہیں آپ اس طور سے کیوں سوچ رہے ہیں۔ کم از کم میرے علم میں تو کوئی ایسا واقعہ نہیں کہ باپ بیٹے میں کوئی شدید جھگڑا ہوا ہو۔ بسواجیت اپنے بزرگوں کے سامنے سر اُٹھانے والا لڑکا نہیں تھا۔ ویسے بھی ابھی وہ عمر کے اُس حصے میں تھا جہاں لڑکوں کو اپنا جیب خرچ پورا ملتا رہے تو انہیں کسی اور بات کی فکر نہیں ہوتی......وہ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ دو مہینے بعد گھر آتا تھا اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ وقت گزار دیتا تھا۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ بسواجیت کی ماں کو بھائی صاحب نے طلاق دی تھی اور اس بات کی رنجش بسوا کے دل میں ہوگی۔ ایسا ہونا کوئی بڑی بات نہیں اور ممکن ہے کہ بسوا اور ہیما وغیرہ بھی اس غم کو محسوس کرتے ہوں لیکن وہ باپ سے اور اپنے حالات سے سمجھوتہ کرچکے تھے اور سچی بات تو یہ ہے بھائی صاحب نے بھی باپ کے فرائض ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ اگر یہ منحوس عورت شاردا اس گھر میں نہ آتی تو پہلی بیوی سے علیحدہ ہونے کے باوجود بھائی صاحب کا گھر سورگ رہتا۔''

میں نے دیپک پرشاد سے کہا۔ ''مجھ سے پہلے اس تھانے کا انسپکٹر جانی ہیما والے کیس کی تفتیش کرتا رہا ہے۔ کیا اُس کے سامنے بھی تم نے یہ بیان دیا تھا کہ ہیما کو ''پریم چکر'' میں ڈالنے اور گھر سے بھگانے میں شاردا کا ہاتھ ہے۔''

''بالکل دیا تھا۔'' دیپک نے اقرار کیا۔ ''اور اس بدبخت نے یہ ساری باتیں بھائی

صاحب کو بتادی تھیں۔ بھائی صاحب سے بڑی راہ و رسم تھی اُس کی......بھائی صاحب راشن لے کر مجھ پر چڑھ دوڑے تھے۔ بڑی بے عزتی کی تھی میری۔ وہ تو شاردا کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ ساری دنیا کی بات جھٹلا دیں گے لیکن اُس ڈائن کے کہے پر اعتبار کرلیں گے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ناں کہ ساری خدائی اک پاسے، میرا ڈھولن ماہی اک پاسے۔ یہ مثال صادق آتی ہے اُن پر۔'' دیپک پرشاد کا دل شاردا کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاردا کے چلتروں نے کام دکھایا ہو اور باپ بیٹے میں اندر ہی اندر اختلاف پیدا ہوچکا ہو۔'' دیپک پرشاد سوچ میں پڑ گیا۔ جیسے اس سوال کا کوئی صحیح جواب اُسے نہ سوجھ رہا ہو۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں......باڈی والا کی چھوٹی بیٹی بھی تو ہے وہ کہاں ہے؟''

دیپک بولا۔ ''وہ کپورتھلہ میں اپنے چھوٹے چچا کے پاس رہتی ہے۔ وہیں پانچویں کلاس میں پڑھ رہی ہے......''

ہماری یہ گفتگو باڈی والا کی کوٹھی میں ہی ہو رہی تھی۔ ہم بالائی منزل کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ اچانک زینوں کا دروازہ کھلا اور بلال شاہ دندناتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ اس کا تمتماتا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ یا تو کسی سے لڑ کر آیا ہے یا اُس کے پاس کوئی اہم خبر ہے......خبر والی بات درست تھی۔ آتے ساتھ ہی اُس نے میرے کان سے منہ لگایا اور بولا۔ ''خان صاحب! باڈی والا کی گاڑی مل گئی ہے۔ موضع جھمرہ کے قریب کھیتوں میں کھڑی ہے۔''

یہ بڑے کام کی خبر تھی۔ میں نے دیپک پرشاد سے اجازت لی اور بلال شاہ کے ساتھ کوٹھی سے نکل آیا۔ نیچے میری جیپ کھڑی تھی۔ ٹینکی میں پٹرول بھی موجود تھا۔ ہم نے سیدھے موضع جھمرہ کا رخ کیا۔ جھمرہ امرتسر کا ایک نواحی گاؤں ہے۔ فاصلہ تقریباً اٹھارہ کچے میل کا ہے۔ رستہ دس میل تک پختہ اور اس کے بعد نیم پختہ ہے۔

بلال شاہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ کار کا کھوج مرکزی تھانے کے ایک کانسٹیبل نے لگایا ہے۔ وہ ''ایک شادی'' کھا کر قریبی گاؤں سے آرہا تھا۔ جھمرہ کے قریب کیکر اور شیشم کے ایک جھنڈ میں اُس نے کار دیکھی۔ نمبر دیکھ کر وہ پہچان گیا کہ یہ باڈی والا کی کار ہے۔ اُس نے قریبی کھیت میں کام کرتے ہوئے دو آدمیوں سے پوچھا کہ یہ کس کی کار ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں نہیں معلوم۔ یہ کل دوپہر سے اسی جگہ کھڑی ہے۔ کانسٹیبل نے گاڑی کے پہیوں

کی ہوا نکال دی اور اطلاع دینے کے لیے فوراً تھانے پہنچ گیا۔

جیون نامی یہ کانسٹیبل ابھی تک تھانے میں تھا۔ ہم نے دو منٹ کے لیے جیپ روک کر اسے ساتھ لیا اور شہر سے نکل کر جھمرہ گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیون اور بلال شاہ کی طرح میں بھی سادہ لباس میں تھا۔ بلال شاہ کے پاس ایک دیسی پستول تھا جبکہ میری قمیص کے نیچے ۳۸ بور کا سرکاری ریوالور بندھا ہوا تھا۔ ہم بارہ بجے کے قریب روانہ ہوئے تھے۔ ڈیڑھ بجے موقعہ پر پہنچ سکے۔ راستے میں مسلسل اس بات پر تبصرہ ہوتا رہا کہ باڈی والا کی کار اس ویران علاقے میں کیسے پہنچی اور اگر کار یہاں ہے تو باڈی والا خود کہاں ہے۔ نوکروں کے بیانات سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی لاڈلی بیوی کی تلاش میں نکلا ہے لیکن ابھی تک باڈی والا کا پتہ چلا تھا اور نہ اس کی لاڈلی بیوی کا۔ (شاردا کے والدین امرتسر ہی کی ایک نواحی بستی میں رہتے تھے۔ میں نے وہاں اپنے سب انسپکٹر کو بھیجا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ شاردا وہاں نہیں آئی اور نہ ہی اپنے کسی دوسرے عزیز کے پاس گئی ہے)

کانسٹیبل جیون سنگھ ہمیں سیدھا اُس جھنڈ میں لے گیا جہاں باڈی والا کی شاندار گاڑی لاوارث کھڑی تھی۔ اُس پر گرد کی موٹی تہہ جمی تھی اور درختوں کے زرد پتے گرے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کھیتوں میں کام کرتے ہوئے چند افراد ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہم سادہ لباس میں تھے اور جیپ کا رنگ روپ بھی پرائیویٹ گاڑیوں جیسا تھا۔ کاشت کاروں کو بالکل شبہ نہیں ہوا کہ ہم پولیس والے ہیں۔ ایک شخص نے ہمیں بتایا کہ اس گاڑی کا مالک گرو جی مہاراج کے استھان پر بیٹھا بھجن سن رہا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”کون ہے یہ گرو جی مہاراج!؟“

جواب دینے والا مسلمان تھا لیکن اُس نے گرو کا نام بڑے احترام سے لیا اور بولا۔ ”وہ جی اللہ کے نیک بندے ہیں۔ سکھ مسلمان عیسائی سب اُن کو مانتے ہیں۔ یہاں قریب ہی نالے کے پار اُن کا ڈیرہ ہے...... وہ دیکھیے...... وہ پیلے جھنڈے والی برجی نظر آرہی ہے۔“

ہم چاروں خانے چوکس ہوگئے۔ ظاہر ہے باڈی والا قاتل تھا اور قاتل گرفتاری سے بچنے کے لیے کچھ بھی کرگزرتا ہے۔ جیپ لاک کر کے ہم ڈیرے کی طرف بڑھے۔ دو تین کاشتکار بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اُن میں سے ایک بولا۔

”عجیب مجذوب سا بندہ ہے جی وہ۔ کل سے ایک کونے میں گم صم بیٹھا ہے۔ نہ کچھ کھایا پیا ہے نہ کسی سے بات کی ہے۔ ہم نے ابھی اُسے بتایا کہ کوئی شخص تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا اور جاتے جاتے تمہاری گاڑی کی ہوا نکال گیا ہے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔“

باتیں کرتے کرتے ہم ڈیرے کے سامنے پہنچ گئے۔ جو برجی ہم نے دور سے دیکھی وہ چھوٹی سی تھی لیکن ڈیرہ اس کے مقابلے میں بہت بڑا تھا۔ لمبی چوڑی چار دیواری، بڑے بڑے دروازے، گنبد اور برجیاں۔ عجیب سی عمارت تھی یہ۔ نہ مسجد نظر آتی تھی' نہ مندر اور نہ گردوارہ۔ بس یہ کوئی ملی جلی چیز تھی۔ بڑے دروازے کے سامنے دو ہٹے کٹے پہریدار کھڑے تھے۔ اُن کے حلیے بھی عجیب سے تھے۔ لمبے زرد چوغے' گلے میں مالائیں' ہاتھوں میں کڑے اور پاؤں ننگے۔ وہ بظاہر بہت اللہ لوک نظر آتے تھے لیکن اُن کی آنکھوں کی تیز چمک میری نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ ہر آنے جانے والے کو بہت گہری نظروں سے دیکھتے تھے۔

ڈیرے کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ یہاں ٹائیلوں کا فرش لگا تھا اور دیہاتی عقیدت مند ننگے پاؤں گھوم رہے تھے۔ ان عقیدت مندوں میں بچے بوڑھے عورتیں مرد سب شامل تھے۔

ہمارے ساتھ آنے والے کاشت کار نے انگلی سے ایک ستون کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں بیٹھا ہوا تھا جی۔“

اب وہ جگہ خالی تھی۔ ہمیں دھچکا سا لگا۔ ”کہاں گیا ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہیں کہیں ہوگا جی۔ جانا کہاں ہے۔“ دیہاتی نے کہا۔

یہاں ایک طرف رسیوں پر بہت سے زرد رومال جھول رہے تھے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی زرد رومالوں سے اپنے سر ڈھانپ لیے۔ بہت سے لوگ ایک ستون کے گرد آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے اور منہ میں کچھ بدبدا رہے تھے۔ ان میں ہندو مسلمان سکھ سب ہی شامل تھے۔ ہم نے بھی ستون کے سامنے بیٹھ کر چند منٹ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ صحن میں ایک طرف دیوار کے ساتھ چند بڑے بڑے دیگچے رکھے تھے اور اُن میں پرشاد قسم کی کوئی شے پک رہی تھی۔ شاید حلوہ تھا۔ یہ خوشبو بلال شاہ کو بہت بے چین کر رہی تھی اور وہ بار بار مڑ کر دیگچوں کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”بلال شاہ! ہمیں باڈی والا کو ڈھونڈنا ہے۔ ظاہر ہے وہ اسی چار دیواری میں ہے۔ تم اور کانسٹیبل سامنے کے حصے میں دیکھو۔ میں پچھلے برآمدوں میں جاتا ہوں۔ باہر کے دروازے پر خاص طور سے نظر رکھنا۔“ بلال شاہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

ہم تینوں ستون کے سامنے سے اُٹھے اور ڈیرے پر گھومنے پھرنے لگے۔ میں ایک تنگ دروازے سے گزر کر عقبی برآمدوں کی طرف چلا گیا۔ یہاں بھی زائرین کا ہجوم تھا۔ چھتوں سے بے شمار گھنٹیاں لٹک رہی تھیں۔ کہیں کہیں دیواروں میں محرابیں سی بھی بنی ہوئی تھیں اور اس میں اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ کئی جگہ دیواروں کو جھنڈیوں اور رنگ برنگے کاغذی پھولوں

سے سجایا گیا تھا۔ میں ٹہلنے والے انداز میں گھومتا رہا اور باڈی والا کو تلاش کرتا رہا۔ ایک تنگ راہداری میں سے بہت سے لوگ گزر رہے تھے۔ میں بھی اس میں سے گزر کر ایک تکونے برآمدے میں آ گیا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ آٹھ دس عورتیں ایک قطار بنائے چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ اُن میں جوان بھی تھیں اور اُدھیڑ عمر بھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال سر اٹھانے لگا کہ باڈی والا کی چہیتی بیوی شاردا نے بھی تو کہیں اس ڈیرے کا رخ نہیں کیا...... ممکن تھا کہ وہ یہاں پہنچی ہو اور باڈی والا اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا ہو لیکن اگر ایسا تھا تو پھر وہ دونوں کہاں تھے؟ میں ایک طرف کھڑا ہو کر غور سے عورتوں کا جائزہ لینے لگا۔ اُن میں سے اکثر نے چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ مجھے اُن میں کوئی بھی شاردا کے قد کاٹھ کی دکھائی نہیں دی۔ ان عورتوں نے ایک چھوٹے سے دروازے کے سامنے قطار بنا رکھی تھی۔ دروازے پر ایک زرد پردہ جھول رہا تھا اور فربہ جسم کی ایک ملنگنی سی عورت ہاتھ میں ڈنڈا لیے دہلیز پر کھڑی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت اپنے بھدے جسم کو گھسیٹتی اور ہائے ہائے کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ میرے قریب کھڑے ایک نوجوان نے لپک کر عورت کو سنبھال لیا اور آہستہ آہستہ چلتا برآمدے میں لے گیا۔

اب قطار میں سب سے آگے بیٹھی ہوئی دو عورتیں اُٹھیں۔ ان میں ایک پندرہ سالہ لڑکی تھی اور دوسری ادھیڑ عمر۔ غالباً وہ ماں بیٹی تھیں۔ لڑکی چہرے مہرے سے بیمار نظر آتی تھی۔ ماں نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ پردہ اُٹھا کر دونوں تاریک دروازے میں گم ہوگئیں...... دو یا تین منٹ بعد ادھیڑ عمر عورت باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں لڑکی کی کریم کلر چادر تھی۔ اس کے علاوہ لڑکی کی بالیاں، پیتل کی چوڑیاں اور غالباً بالوں کا کلپ بھی تھا۔ ملنگنی نے یہ چیزیں دیکھیں تو غصے سے بڑبڑانے لگی۔ پھر قطار میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو ڈانٹ کر بولی۔

''کسی کے جسم پر دھات کی کوئی شے نہ ہو۔ اگر ہے تو اتار کر یہیں رکھ دو۔''

جن عورتوں نے بالیاں یا چوڑیاں وغیرہ پہن رکھی تھیں فوراً اتار دیں۔ دفعتاً میں چونک گیا۔ اندر سے رونے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ دبی دبی آوازیں یقیناً اسی لڑکی کی تھیں جو تھوڑی دیر پہلے اندر گئی تھی۔ ''ہائے میں مرگئی...... مجھے بچاؤ...... مجھے چھوڑ دو...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا رسول کا واسطہ چھوڑ دو۔'' پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ اُس کی ماں کبھی کانوں میں انگلیاں دیتی تھی اور کبھی ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ جیسے اپنی بیٹی کی مشکل آسان ہونے کی دعائیں مانگ رہی ہو۔ اردگرد موجود جن دوسرے لوگوں تک یہ آوازیں پہنچ رہی تھیں وہ بھی غمزدہ اور خاموش نظر آتے تھے۔

یکا یک ایک بھاری ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ لمبے زرد چوغے والے دو پہریدار میرے پیچھے کھڑے تھے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھنے والا پہریدار وہی تھا جسے میں نے بیرونی دروازے پر دیکھا تھا۔

وہ مدھم لیکن بھاری آواز میں بولا۔ ''تمہیں چھوٹے مہاراج نے بلایا ہے۔'' اُس کے لہجے میں رعب تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ میرے انکار یا اقرار سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے ہر صورت جانا ہی ہوگا۔

میں خاموشی سے چل دیا۔ دونوں ڈشکرے، سنتریوں کی طرح میرے دائیں بائیں چلنے لگے۔ تنگ راہداری سے گزار کر وہ مجھے ایک ہال نما کمرے میں لے آئے۔ یہاں بہت سے جڑواں ستون کھڑے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اس ویران سے دیہاتی علاقے میں اتنی بڑی عمارت موجود ہے...... وہ کہانی جو امرتسر کے صاحب ہوٹل میں ہونے والی لڑائی سے شروع ہوئی تھی۔ راستے بدلتی ہوئی گرو مہاراج کے اس پُراسرار ڈیرے پر آ گئی تھی۔

میرے سامنے ایک دروازہ کھلا اور دونوں پہریداروں سمیت میں ایک کشادہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ چھوٹے سے سرخ قالین پر ایک شخص گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کے جسم پر زرد کپڑے کا ایک تہبند تھا۔ بالائی جسم ننگا تھا اور بالوں بھرے سینے پر بے شمار مالائیں لٹک رہی تھیں۔ اس شخص نے سکھوں کی طرح چہرے اور سر کے بال بڑھا رکھے تھے۔ مجھے بہت گہری نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

''باڈی والا کے پیچھے آئے ہو۔''

یہ بڑا اچانک سوال تھا۔ سوال کرنے کے بعد اُس شخص کی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئی تھیں۔ یہ وہی داؤ تھا جو ہم ملزموں پر آزماتے ہیں۔ اچانک کوئی انکشاف کر کے اُن کے چہرے کے تاثرات دیکھے جاتے ہیں۔ وہ شخص بھی میرے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''کون باڈی والا؟'' میں نے پوچھا۔

اُس شخص نے چہرہ سرخ کر کے مجھے ایک ناقابلِ اشاعت گالی سے نوازا اور گرج کر بولا۔ ''مختار حسن! اس کی قمیص کے نیچے سے ریوالور نکال لو۔''

میرے دائیں بائیں کھڑے ڈشکروں نے ایک دم مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ پھر دائیں جانب والے شخص نے قمیص کے نیچے میرے ریوالور پر ہاتھ ڈالا۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ میں کچھ خطرناک لوگوں میں گھر گیا ہوں اور اس موقع پر اپنے ریوالور سے محروم ہونا بہت گھاٹے کا سودا ہے۔

جونہی مختار حسن نامی شخص کا ہاتھ میرے ریوالور سے ٹکرایا میں نے ذرا سا جھک کر کہنی پوری قوت سے اُس کی پسلیوں میں ماری اور پھر ٹانگ سے دھکیل کر دور پھینک گیا۔ بائیں طرف والا ''دشکرا'' ایک سیکنڈ کے لیے جیسے سکتے کی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ اس ایک سیکنڈ کی غفلت اسے مہنگی پڑی۔ میں نے اسے اس کی وزنی مالاؤں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ اُڑتا ہوا سامنے گاؤ تکیے والے گرو جی پر جا پڑا۔ گرو کے قریب رکھا ہوا رنگین حقہ الٹ گیا اور چلم کے انگارے سرخ قالین پر بکھر گئے...... عین اُس وقت کمرے کا بغلی دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے اپنے سامنے ایک ''قیامت'' کو کھڑے پایا۔

وہ خوبصورت جوان لڑکی تھی۔ اُس کے جسم پر کسی ہوئی ساڑھی تھی۔ ساڑھی کی چولی نہایت مختصر تھی اور پیٹ عریاں ہو رہا تھا۔ لڑکی نے سارے گہنے پہن رکھے تھے۔ زبردست چکا چوند تھی لڑکی کے حسن میں۔ مجھے یاد آیا کہ لڑکی کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی مجھے پہچان رہی تھی، بلکہ پہچان چکی تھی۔ ''آپ...... آپ تھانیدار صاحب۔'' اُس کے ہونٹوں سے نکلا۔

تھانیدار کا ذکر سن کر میری طرف بڑھتا ہوا وہ شخص رک گیا جسے میں نے دھکیل کر چھوٹے مہاراج پر پھینکا تھا اور جس کی آنکھوں میں اب خون اُترا ہوا تھا۔ ایک شخص لوٹا لے کر آگے بڑھا اور قالین پر بکھرے کوئلوں پر جلدی جلدی چھینٹے دینے لگا۔ چھوٹا مہاراج اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ کبھی حیرت سے میری طرف اور کبھی اُس لڑکی کی طرف دیکھتا تھا جو دروازے سے برآمد ہوئی تھی۔

لڑکی بولی۔ ''ہاں جی...... یہ تھانیدار ہیں۔ انہوں نے ہی تو ہفتے کے روز اسٹیشن پر میری جان بچائی تھی۔''

اب مجھے سب کچھ یاد آیا۔ یہ لڑکی امرتسر ریلوے اسٹیشن پر کچھ لوگوں میں گھر گئی تھی۔ بات کوئی بھی نہیں تھی۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے تماشہ لگ گیا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت اور زرد کپڑوں والے دو ملازم تھے۔ غالباً وہ اسی استھان کے پجاری تھے۔ لڑکی لاہور سے ٹرین پر آئی تھی۔ پلیٹ فارم پر اُترتے ہی کچھ دیہاتی عورتوں نے اُسے پہچان لیا اور ''مہارانی مہارانی'' کہہ کر اس کے پاؤں چومنے لگیں۔ لڑکی کو مہارانی اس لیے نہیں کہا گیا تھا کہ وہ سچ مچ کسی ریاست کی رانی تھی۔ دراصل اُسے اس شخص کی وجہ سے مہارانی کہا گیا تھا جو صرف ایک تہبند باندھے میرے سامنے کھڑا تھا اور جس کے سینے پر بے شمار مالائیں جھول رہی تھیں۔ اُسے اس استھان میں مہاراج کہا جاتا تھا اور لڑکی چونکہ اُس کی پتنی تھی اس لیے دیہاتی

عورتوں نے اسے مہارانی کہہ دیا اور عقیدت سے اُس کے پاؤں چومنے لگیں۔ جب ہجوم ہوا تو مہارانی کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس ہجوم میں صرف پاؤں چومنے والے ہی نہیں تھے' چٹکیاں لینے والے مشٹنڈے بھی تھے۔ مہارانی چلانے لگی۔ مجمع دیکھ کر میں دوڑا۔ میرے ساتھ چند دوسرے افراد بھی شریک ہو گئے اور ہم نے بمشکل مہارانی کی جان چھڑائی۔

اُس واقعے کے حوالے سے لڑکی نے مجھے پہچان لیا تھا۔ زرد تہبند والا حیران ہو کر بولا۔ ''آپ انسپکٹر صاحب ہیں۔ بھگوان شما کرے۔ یہ تو بڑا اپرادھ ہو گیا ہے ہم سے۔ ہم تو کچھ اور سمجھ رہے تھے۔ ہم کو معاف کر دو انسپکٹر صاحب۔''

اُس نے اپنے آدمی کو زوردار جھانپڑ رسید کیا اور باقی لوگوں کو بھی جلدی جلدی کمرے سے باہر نکال دیا۔ عاجزی سے کہنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب! ہم سمجھے تھے کہ شاید آپ اُسی باڑی والا کے ساتھی ہیں اور کسی بُرے ارادے سے آئے ہیں یہاں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ باڑی والا بھی یہاں کسی بُرے ارادے سے آیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''یہ بات تو ہم سے بہتر آپ جانتے ہیں جناب۔ ہمیں تو اتنا پتہ ہے کہ وہ قاتل ہے اور ایک قتل کرنے کے بعد وہ اب دس قتل بھی کر دے تو اُسے ایک ہی بار پھانسی ہونی ہے۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ وہ یہاں کسی کو قتل کرنے آیا ہے؟''

''یہ بات ہو بھی سکتی ہے جناب! یہاں اس سے پہلے اُسے کبھی نہیں دیکھا گیا نہ ہی وہ اس قسم کا بندہ ہے۔ اگر وہ یہاں پہنچا ہے تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ وجہ تم جانتے ہو۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اُس نے جواب دیا۔ پھر زرق برق لباس والی لڑکی سے بولا۔ ''چاندنی! باڑی والا کی بیوی کو لے آؤ۔''

چاندنی سر جھکا کر باہر چلی گئی۔ میرا شبہہ یقین میں بدل چکا تھا۔ باڑی والا کی بیوی یہاں تھی اور وہ اسے تلاش کرتا ہوا اس استھان تک پہنچا تھا۔ انکشاف انگیز بات یہ تھی کہ مہاراج کے خیال میں باڑی والا بیوی کو محبت کی وجہ سے نہیں نفرت کی وجہ سے تلاش کر رہا تھا...... بلکہ اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

چند ہی لمحے بعد چاندنی باڑی والا کی بیوی شاردا کو لے کر میرے سامنے آ گئی۔ شاردا سادہ لباس میں تھی۔ اُس کے چہرے سے افسردگی اور ناامیدی ٹپکتی تھی۔ وہ حسین تھی اور حسین

چہرے افسردہ ہو کر بھی خوبصورت ہی لگتے ہیں۔ مہاراج نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! بے سہارا کو سہارا دینا کسی بھی مذہب میں گناہ نہیں۔ ہم نے اس عورت کو بے سہارا جان کر اور اس کی جان خطرے میں دیکھ کر اسے یہاں پناہ دی ہے۔''

میں نے شادرا کو مخاطب کیا۔ ''شادرا! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔''

وہ کچھ دیر دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی پھر بولی۔ ''مہاراج ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب! مجھے لگ رہا تھا کہ اُس گھر میں میری جان محفوظ نہیں ہے۔ مجھے اپنے پتی سے جان کا خطرہ تھا۔ میں خاموشی سے اس استھان میں آ گئی۔ شادی سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ میں اکثر یہاں آیا کرتی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ یہاں مجھے سر چھپانے کو جگہ مل سکتی ہے...... لیکن پتہ نہیں کیسے میرے پتی کو اس جگہ کا بھی پتہ چل گیا اور وہ میرے پیچھے یہاں پہنچ گیا۔''

یہ بالکل دوسرا ہی نقشہ سامنے آ رہا ہے۔ اکلوتے بیٹے کو قتل کرنے کے بعد اب باڈی والا اپنی پتنی کے در پے تھا۔ کم از کم وہ تو یہی سمجھ رہی تھی اور اگر وہ سمجھ رہی تھی تو یقیناً کوئی بات ہو گی۔

میرا دھیان فوراً باڈی والا کی طرف چلا گیا۔ میں نے چھوٹے مہاراج سے پوچھا۔

''اب کہاں ہے باڈی والا؟''

وہ بولا۔ ''اسی استھان میں ہے انسپکٹر صاحب۔ ہمارے آدمیوں نے اُس پر گہری نگاہ رکھی ہوئی ہے......''

ابھی چھوٹے مہاراج کے ہونٹوں سے بمشکل یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ حجرہ نما کمرے سے باہر چند افراد کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی نے گھبراہٹ بھرے انداز میں دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' چھوٹے مہاراج اپنی جگہ کھڑے کھڑے بارعب آواز میں بولا۔

''میں ہوں مہاراج کمل کمار...... آپ سے بات کرنی ہے۔''

''آ جاؤ۔'' مہاراج نے کہا۔

لمبی بودی والا ایک ادھیڑ عمر ہندو پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہوا۔ پہلے اس نے جھجک کر ہماری طرف دیکھا پھر کانپتی آواز میں بولا۔ ''مہاراج! وہ لالو راجہ بے ہوش پڑا ہے اشنان گھاٹ کی طرف اور...... اور......''

''اور کیا؟'' چھوٹے مہاراج کڑک کر بولا۔

''اور جی...... وہ گاڑی والا غائب ہے۔''

''اوہ رام!'' چھوٹے مہاراج کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اُس کے کارندے بڑے ادب کے ساتھ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ابھی جو مختصر گفتگو ہوئی ہے وہ ''باڈی والا'' کے بارے میں ہے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں بھی ان لوگوں کے ساتھ چل دیا۔ جڑواں ستونوں والے ہال کمرے سے گزر کر ہم اُس تکونی برآمدے میں پہنچے جہاں ایک بند دروازے کے سامنے بہت سی ''حاجت مند'' عورتوں کی قطار لگی تھی۔ اندر سے نوجوان لڑکی کے رونے چلانے اور منتیں سماجتیں کرنے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اس تکونی برآمدے میں آنے کے لیے میں ایک تنگ راہداری سے گزرا تھا لیکن چھوٹے مہاراج نے اس راہداری سے گزرنے کی بجائے ایک دروازہ استعمال کیا۔ یہ شارٹ کٹ راستہ تھا۔ دروازے سے گزرتے ہی ہم استھان کے عقبی احاطے میں نکل آئے۔ یہاں بھی عقیدت مندوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ چھوٹے مہاراج کو دیکھتے ہی وہ ایک دم راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اُن کے سر جھک جاتے تھے اور نظریں زمین میں گڑ جاتی تھیں۔ کچھ دیوانگی کے بارے باقاعدہ مہاراج کے پاؤں چھونے کی کوشش کرتے تھے۔ مہاراج کسی کو خاطر میں لائے بغیر تیز قدموں سے اشنان گھاٹ کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

اشنان گھاٹ ڈیرے کے اندر ہی واقع تھا۔ یہاں تین کنویں تھے اور ٹونٹیوں کی طویل قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف بہت سے غسل خانے اور بیت الخلا بنے ہوئے تھے۔ یہاں ایک مقام پر تیس چالیس افراد کا مجمع لگ چکا تھا۔ مزید بہت سے لوگ تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے۔ چھوٹے مہاراج مجمعے کے پاس پہنچے تو لوگ ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ ایک میلی سی چٹائی پر ایک موٹا تازہ ہندو ڈشکرا بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کی بائیں کنپٹی پر کسی وزنی چیز سے شدید ضرب لگائی گئی تھی۔ نیلے رنگ کا بڑا سا گومڑ نظر آ رہا تھا اور اس گومڑ میں سے خون رس رس کر گردن تک پہنچا ہوا تھا۔ زرد چوغے والے ایک شخص نے چھوٹے مہاراج سے سرگوشیوں میں گفتگو کی اور سامنے بیت الخلا کی طرف اشارہ کر کے اسے کچھ بتایا۔ چھوٹے مہاراج گرج کر بولا۔ ''وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ چاروں طرف دیکھو...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں استھان میں ہی چھپا ہوا ہو۔''

حکم ملتے ہی اس کے کارندے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ چھوٹے مہاراج میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''لگتا ہے اسے آپ کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔''

''تم باڈی والا کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" چھوٹے مہاراج نے جواب دیا۔ "ہم نے کل سے چار آدمی اُس کی نگرانی پر لگا رکھے تھے۔ وہ استھان میں جہاں بھی جاتا تھا اُس پر نظر رکھی جاتی تھی۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے وہ اشنان گھاٹ کی طرف آیا اور اُس سامنے والے ٹٹی خانے میں چلا گیا۔ ہمارا یہ سیوک لالو راجہ اس کے پیچھے تھا۔ اب یہ بے ہوش پڑا ہے اور باڈی والا غائب ہے۔ ہمارا خیال ہے اُس نے لالو کے سر پر اینٹ سے چوٹ لگائی ہے۔ وہ سامنے اینٹ دیکھ رہے ہیں آپ؟ وہ ٹٹی خانے کی اینٹ ہے اور باہر پڑی ہوئی ہے۔"

اس گفتگو کے دوران ہی بلال شاہ اور کانسٹیبل جیون بھی میرے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے چھوٹے مہاراج سے کہا۔ "اگر قاتل بھاگا تو اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ جب تم جان چکے تھے کہ یہ شخص مجرم ہے تو پھر پولیس کو بے خبر رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بہرحال استھان کے اندر اور باہر اُسے تلاش کرو اور ہم بھی دیکھتے ہیں لیکن یہ نہ ہو کہ اب وہ لڑکی بھی غائب ہو جائے۔ میرے واپس آنے تک باڈی والا کی بیوی کو یہیں استھان پر موجود رہنا چاہیے۔"

چھوٹے مہاراج جلدی جلدی اقرار میں سر ہلانے لگا۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے بلال شاہ کو تو وہیں استھان میں چھوڑا اور کانسٹیبل جیون کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ استھان کے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں ہماری جیپ موجود تھی۔ پاس ہی باڈی والا کی گرد آلود گاڑی بھی کھڑی تھی۔ مہاراج کے ایک دو سیوک بڑی پریشان حالت میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ میں نے اُن میں سے ایک سیوک کو ساتھ بٹھا لیا اور ارد گرد کے علاقے میں باڈی والا کو تلاش کرنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد ہماری جیپ دوبارہ استھان کے سامنے رکی۔ ہماری تمام دوڑ دھوپ بیکار گئی تھی۔ اب صرف یہی امید تھی کہ شاید استھان میں کوئی اچھی خبر موجود ہو لیکن یہ امید بھی پوری نہیں ہو سکی۔ استھان پر زرد چوغے والا جو پہلا سیوک ملا اس نے ہمیں بتا دیا کہ "کار والے" یعنی باڈی والا کا کوئی پتہ نہیں چلا...... استھان میں موجود عقیدت مند بھی کچھ حیران پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں ساری بات کا تو پتہ نہیں تھا لیکن اتنا ضرور جان گئے تھے کہ کوئی پاپی چھوٹے مہاراج کے سیوک کو زخمی کر کے بھاگ گیا ہے اور اب باقی کے سیوک اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

میں سیدھا اسی حجرہ نما کمرے میں پہنچا جہاں تھوڑی دیر پہلے مہاراج، اس کی سندر پتنی اور شاردا سے ملاقات ہوئی تھی۔ چھوٹا مہاراج اب مجھ سے دبا دبا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے بڑے

احترام کے ساتھ مجھے اپنے برابر جگہ دی۔ بلال شاہ اور جیون کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ ہمارے سامنے مٹھائی کا تھال اور دودھ کے گلاس رکھے گئے۔

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "مہاراج! ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔ ضروری بات یہ ہے کہ میں باڈی والا کی دھرم پتنی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت اور تنہائی میں۔"

میرے تاثرات دیکھ کر مہاراج جلدی سے اپنی زرد دھوتی سمیٹ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر مجھے بھی اس کمرے میں لے گیا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ بڑا سجایا گیا تھا۔ ایک مسہری پر مخمل کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر غالیچے تھے اور طاقدانوں میں دیوی دیوتاؤں کی نیم عریاں مورتیاں سجی ہوئی تھیں۔ ان میں کچھ مورتیاں خالص سونے کی تھیں اور ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس استھان کے کرتا دھرتا کتنے پیسے والے ہیں۔ کمرے میں لوبان کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ جونہی میں کمرے میں داخل ہوا ایک دوسرے دروازے سے شاردا اندر آ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور سوگواری نے حسن کو کچھ اور نکھار دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی احساس ہوتا تھا کہ اتنی پیاری اور کومل سی لڑکی باڈی والا جیسے "روڈ رولر" کے نیچے کچلے جانے کے لیے نہیں تھی۔

وہ اطمینان سے بیٹھ گئی تو چند رسمی باتوں کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ "شاردا دیوی! جو کچھ ہمیں اب تک معلوم ہوا ہے اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ باڈی والا تم سے بہت محبت کرتا تھا، بلکہ تمہاری محبت میں اس نے خاندان میں سب سے بگاڑ رکھی تھی۔ پھر ایک دم تمہیں اُس سے جان کا خطرہ کیوں لاحق ہو گیا؟"

وہ بولی۔ "انسپکٹر صاحب! میری سمجھ میں خود یہ بات نہیں آتی کہ ہمارے ہنستے بستے گھر کو اچانک یہ کس کی نظر کھا گئی ہے۔ پہلے ہیما گھر سے بھاگی، پھر بسوا جیت قتل ہوا اور اب مجھے لگ رہا ہے کہ میری باری آ گئی ہے۔"

"کون قتل کرے گا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ کس کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہی ہو تم؟"

وہ بولی۔ "مجھے خود معلوم نہیں تو آپ کو کیا بتاؤں۔ بس دل میں ڈر سا ہے کہ اُس گھر میں گئی تو میرے ساتھ کچھ ہو جائے گا۔" وہ گول مول انداز میں بات کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے سوتیلے بیٹے بسوا جیت کے قتل میں کس کا ہاتھ ہے؟"

اس سوال کا جواب شاردا کے لیے بہت مشکل تھا اور اس مشکل کا اندازہ اس کے

چہرے سے ہو رہا تھا۔ وہ کچھ شدید الجھن میں ساڑھی کا پلو مروڑتی رہی پھر بولی۔ ''مجھے کچھ پتہ نہیں انسپکٹر صاحب! میں گھر میں رہنے والی عورت ہوں۔ مجھے کیا پتہ گھر سے باہر کیا ہوتا رہا ہے۔ ویسے بھی میرا پتی اور سوتیلا بیٹا آپس کی باتیں میرے سامنے ظاہر نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کبھی میں نے اُن کی ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ پتی کی سیوا اور اُس کے بچوں کی دیکھ بھال میری ذمہ داری تھی اور میں یہ ذمہ داری پوری کر رہی تھی......''

میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری ذمہ داریوں کی بات نہیں کر رہا یہ پوچھ رہا ہوں کہ بسواجیت کے قتل کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے؟''

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھے لگتا تھا کہ باپ بیٹے میں کچھ اَن بن ہے۔ میں نے اپنے پتی سے کئی دفعہ پوچھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ڈانٹ کر کہا کہ میں اس معاملے میں دخل نہ دوں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے چھپانا چاہتے تھے۔ بسوا مجھ سے ہر بات کھل کر کرتا تھا لیکن اس معاملے میں اُس نے بھی زبان بند ہی رکھی۔ پچھلے دو دن کے لیے میں میکے گئی تو نوکروں سے پتہ چلا کہ بعد میں انہوں نے (باڈی والا نے) بسوا کو کسی بات پر بُری طرح ڈانٹا ڈپٹا تھا۔ اُن دنوں بسوا کی ٹانگ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ بیساکھیوں سے چلتا تھا۔ میں میکے سے واپس آئی تو بسوا اپنی بیساکھیوں کو توڑ کر پھینک چکا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ''آپو! میں نے بیساکھیاں توڑ دی ہیں، اب آپ لوگوں کو اپنے پاؤں پر چل کر دکھاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ باپ بیٹے میں وہی جھگڑا ہو جو اکثر گھروں میں ہوتا ہے۔ باپ سمجھتا ہے کہ بیٹا ہڈ حرام، غیر ذمے دار اور لاپرواہ ہے۔ بیٹے کا خیال ہوتا ہے کہ باپ سخت گیر ہے اور اُسے اپنے اوپر بوجھ سمجھتا ہے......''

شاردا بولی۔ ''میں آپ کو کیا بتاؤں جب مجھے خود بھی ٹھیک سے کچھ پتہ نہیں۔ ایسا جھگڑا اُن دونوں میں ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔ بسواجیت خاصا ذمہ دار تھا اور پڑھائی میں دلچسپی لیتا تھا۔ پچھلے سال وہ فیل ہوا تھا لیکن اس کی وجہ بیماری تھی۔ اُسے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اس دفعہ وہ ٹانگ کی وجہ سے امتحان میں ہی نہیں بیٹھ سکا۔''

میں نے کہا۔ ''شاردا دیوی! تم مجھے اپنے دل کی بات بتاؤ۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ باڈی والا اپنے بیٹے کو قتل کر سکتا ہے؟''

شاردا کا رنگ کچھ اور زرد پڑ گیا۔ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے جو کچھ پتہ تھا میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔''

اُس کے انکار میں بھی اقرار کی جھلک تھی۔ میں نے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم گھر چھوڑنے کے بعد اس استھان پر کیوں آ گئیں۔ تم اپنے والدین کے گھر بھی جا سکتی تھیں۔''

''والدین کے گھر جانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔'' شاردا نے جواب دیا۔ ''مجھے ڈر تھا کہ...... میرا پتی وہاں بھی پہنچ جائے گا۔ اُس کی ذہنی حالت بڑی خراب نظر آ رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی روز سے مسلسل شراب پی رہا تھا۔ کسی وقت مجھے ایسی غضب ناک نظروں سے دیکھتا تھا کہ میں سر تا پا کانپ جاتی تھی...... جس وقت میں گھر سے نکلی مجھے صرف شک تھا کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے لیکن اب تو شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ وہ میرے پیچھے ہی پیچھے یہاں تک آ گیا ہے۔ اگر گرو مہاراج کی پناہ مجھے نہ ملتی تو نہ جانے کیا حشر ہوتا میرا۔''

اب وہ قدرے کھل کر بات کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہاری بھی یہ دوسری شادی ہے، پہلے شوہر سے تمہاری علیحدگی ہوئی تھی یا......؟''

وہ بولی۔ ''نہیں...... وہ فوت ہو گیا تھا۔ شادی کے ایک ہی برس بعد سڑک کے ایک حادثے نے اُس کی جان لے لی۔'' اس ذکر نے ایک دم شاردا کو رنجیدہ کر دیا۔

میں نے کہا۔ ''اس کے بعد تمہاری شادی باڈی والا سے ہو گئی۔ اس شادی میں تمہاری رضامندی شامل تھی؟''

وہ بولی۔ ''راضی یا ناراضی ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ پہلی شادی کی طرح یہ شادی بھی والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ اپنے دوسرے شوہر کو تو میں نے شادی سے پہلے دیکھا بھی نہیں تھا لیکن شادی کے بعد میں نے ایک پتنی کے طور پر اپنا ہر فرض پورا کیا ہے۔ شوہر کو محبت دی۔ اس کے گھر کی اور بچوں کی پوری نگہداشت کی۔ چند ہفتے پہلے تک کوئی میرے شوہر سے میرے بارے میں پوچھتا تو وہ میری تعریفیں کرتے نہ تھکتا لیکن پھر چند ہفتوں کے اندر اندر اُسے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ سب کچھ بھول گیا اور اُس کی آنکھیں میرے لیے آگ برسانے لگیں۔''

میں نے کہا۔ ''اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔ یہیں رہو گی یا کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈو گی۔''

''میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''باڈی والا گرفتار ہو جاتا تو اور بات تھی۔ اب وہ فرار ہو گیا ہے۔ ایسے میں تمہیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ اس استھان میں مَیں جتنی حفاظت سے رہ سکتی ہوں کہیں اور نہیں رہ سکتی۔ یہاں مجھے کسی طرح کا خوف خطرہ نہیں۔ میرے علاوہ بھی چند بے سہارا

عورتیں یہاں موجود ہیں۔ مہاراج کی پتنی اُن کی دیکھ بھال کرتی ہیں ان کے رہنے اور سونے کے لیے علیحدہ جگہ ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ''گوارا'' میں میری والدہ کو میرے بارے میں اطلاع پہنچ جائے اور وہ یہاں آ کر مجھ سے مل جائے۔''

گوارا امرتسر کے نواح میں چھوٹی سی آبادی تھی جیسے لاہور کے نواح میں کوٹ لکھپت...... والدہ کا ذکر شاردا کی زبان پر آیا تو اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میں اسے ذرا چھیڑتا تو وہ باقاعدہ رونے لگتی۔ میں نے موضوع بدل کر کہا۔ ''تم اپنا اچھا برا اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔ میرے خیال میں تو ایک جوان جہان عورت کا اس طرح استھان میں پڑے رہنا ٹھیک نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ استھان کوئی اچھی جگہ بھی نہیں لگ رہی۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ باقی میری طرف سے یہ پابندی ضرور رہے گی کہ تم مقامی تھانے میں پیشگی اطلاع دیئے بغیر کہیں جاؤ گی نہیں...... مجھے ابھی تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے اور ہوسکتا ہے اس سلسلے میں بار بار تمہاری ضرورت پڑے۔''

وہ اقرار میں سر ہلانے لگی۔

☆======☆======☆

بلال شاہ کو وہیں جھمرہ میں چھوڑ کر امرتسر واپس آ گیا۔ باڈی والا کی بیوی سے بات چیت کے بعد ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ جوان بیٹے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد باڈی والا اب اپنی جوان بیوی کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟ کہیں یہ کوئی ناجائز تعلقات کا شاخسانہ تو نہیں تھا۔ یہ ہندو گھرانے کے لوگ تھے اور کافی ایڈوانس بھی۔ شرم وحیا، رشتوں کا احترام ان لوگوں کے نزدیک وہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ جو عام لوگوں کے نزدیک رکھتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق باڈی والا اپنی جوانی میں خود بھی کافی رنگین مزاج رہا تھا۔ اب اولاد کے مزاج میں بھی یہ رنگینی پائی جاتی تھی۔ بسواجیت کا تو پتہ نہیں تھا لیکن بسواجیت کی بہن ہیما اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو چکی تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک ایسی بات بھی سوچی جا سکتی تھی جو عام طور پر نہیں سوچنی چاہیے۔ شاردا' بسواجیت کی سوتیلی ماں تھی وہ اُس کی ہم عمر تھی اور وہ اُسے ''آپو'' کہتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ باڈی والا کو ان دونوں کے تعلق پر شبہ ہو گیا ہو اور اُس نے غضب ناک ہو کر بیٹے کو قتل کر دیا ہو۔ شاردا اپنی جان خطرے میں دیکھ کر بھاگ نکلی ہو اور باڈی والا اس کا پیچھا کرتے ہوئے جھمرہ کے استھان تک جا پہنچا ہو۔

جیسا کہ معلوم ہوا تھا کہ باڈی والا جوانی میں بڑا دبنگ شخص تھا۔ ساتوں شرعی عیب اُس

میں موجود تھے۔ مار دھاڑ کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ اب چونکہ وہ سیٹھ بن چکا تھا اس لیے کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ ویسے بھی عمر ڈھلنے کے ساتھ انسان میں دھیما پن آ جاتا ہے۔ مگر ایسا شخص اندر سے خطرناک ہی رہتا ہے۔ عمر کے کسی حصے میں چوٹ لگنے سے اُس کے اندر سویا ہوا زہریلا ناگ جاگ اُٹھتا ہے۔

امرتسر واپس آنے کے دوسرے روز میں نے ''گوارا'' جا کر شاردا کے والدین سے ملاقات کی۔ وہ اپنے چھ بچوں سمیت ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ اولاد جوان تھی اور اُن میں سے ایک دو کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ گھر کے در و دیوار سے غربت ٹپکتی تھی۔ ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک کمرے میں مَیں نے شاردا کے والد اور والدہ سے گفتگو کی۔ اُس کی والدہ بیمار تھی اور بات چیت کے دوران مسلسل ''ہائے...... ہائے'' کر رہی تھی۔

میں نے شاردا کے والد چوہان کمار سے پوچھا کہ شاردا اور باڈی والا کی شادی کن حالات میں ہوئی۔ جواب میں اُس نے جو کچھ بتایا وہ مختصراً یوں ہے۔ شاردا کی پہلی شادی اپنے ہی خاندان میں وجے نامی لڑکے سے ہوئی تھی۔ وہ اسکول ٹیچر تھا۔ نوکری کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا اور امید تھی کہ اپنا مستقبل سنوارنے میں کامیاب رہے گا لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ حادثے کا شکار ہو گیا۔ شاردا کے ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہ پڑی تھی کہ وہ بیوہ ہو گئی۔ وہ دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ کچھ عرصے بعد جب اس کے لیے باڈی والا کا رشتہ آیا اور گھر والوں نے بھی مجبور کیا تو وہ راضی ہو گئی۔ باڈی والا اُن دنوں زیادہ امیر نہیں تھا۔ بہرحال کھاتا پیتا شخص تھا۔ اُن دنوں وہ اسی علاقے میں رہتا تھا اور ابھی اُس کی ایشور کالونی والی کوٹھی بننا شروع نہیں ہوئی تھی۔

میں نے شاردا کے والد سے کہا۔ ''آپ کے خیال میں باڈی والا کیسا آدمی ہے؟''

وہ بولا۔ ''اسے اچھا سمجھ کر ہی بیٹی دی تھی لیکن اُس میں غصہ بہت ہے۔ وہ کب کس بات پر بھڑک اُٹھے گا کچھ نہیں کہا جا سکتا...... اب اگر وہ شاردا کے خلاف بھڑک گیا ہے تو اسے جلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ بھگوان کے بعد اب اس کی رکھشا آپ ہی کر سکتے ہیں۔ ہم تو مرے مارے لوگ ہیں۔ کہاں تک حفاظت کریں گے اس کی...... اُس نے اچھا ہی کیا ہے کہ یہاں آنے کی بجائے گرو مہاراج کے استھان پر چلی گئی ہے۔''

شاردا کی ماں روتے ہوئے بولی۔ ''تھانیدار صاحب! وہ کیوں پڑا ہوا ہے میری نردوش بیٹی کے پیچھے۔ کیا آپ کے قانون میں اتنی طاقت نہیں کہ اسے بچا سکیں۔ بھگوان کے لیے کچھ

کریں۔ اُسے پکڑ کر حوالات میں بند کریں یا اُس کے دماغ کا علاج کرائیں پہلے اُس کی سختی کی وجہ سے جوان بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔ پھر اپنے جوان بیٹے کو کھا گیا۔ اب میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

جونہی میں شاردا کے والدین سے مل کر گوارا سے واپس آیا تھانے میں ایک نہایت اہم اطلاع موجود تھی۔ اطلاع لانے والا چھوٹے مہاراج کا ایک سیوک تھا۔ اُس نے بتایا کہ باڈی والا کا سراغ لگ گیا ہے۔ وہ استھان سے قریباً دو میل کے فاصلے پر ایک شمشان گھاٹ میں موجود ہے۔ سیوک اپنے ساتھ چھوٹے مہاراج کی ایک چٹھی بھی لایا تھا۔ اس چٹھی میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں باڈی والا کی گرفتاری کے لیے فوراً استھان پہنچ جاؤں۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ چھ بجے کے قریب سورج غروب ہو جاتا تھا۔ استھان کا فاصلہ امرتسر سے قریباً اٹھارہ میل کا تھا۔ پچھلی مرتبہ ہم ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے۔ اس کا مطلب تھا ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے گہرا اندھیرا چھا جائے گا۔ بہرحال اب جانا تو تھا ہی۔ میں نے اے ایس آئی کے علاوہ دو رائفل مین ساتھ لیے اور جیپ پر جھمرہ روانہ ہو گیا۔ بڑی سرد اور خشک ہوا چل رہی تھی۔ مطلع بھی ابر آلود تھا۔ راستے میں اے ایس آئی نے باڈی والا کا ذکر چھیڑ دیا اور اُس کے بارے میں ایک بڑی عجیب بات بتائی۔ اُس نے کہا کہ باڈی والا کے بزرگ راجستھان کے رہنے والے تھے اور ان کا تعلق مواڑی خاندان سے ہے۔ مواڑی خاندان میں یہ بات مشہور ہے کہ اُن کی ہر پشت میں ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کے چھ بیٹے ہوتے ہیں۔ چھٹا بیٹا سال کے پہلے یا دوسرے مہینے میں سوموار کے روز پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑا خوش بخت ہوتا ہے۔ اُسے اپنے دشمنوں پر فتح نصیب ہوتی ہے اور وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالے تو سونا بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُس میں کئی خاص صلاحیتیں بھی ہوتی ہیں...... یہ باڈی والا بھی اپنے چھ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے اور باقی شرطوں پر بھی پورا اُترتا ہے۔

اے ایس آئی کو یہ باتیں باڈی والا کے پرانے ملازم رمضان علی نے بتائی تھیں۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ رمضان علی باڈی والا کے گھر میں خانساماں تھا۔ اس کا خانساماں ہونا بھی عجیب بات تھی۔ ہندو گھرانوں میں تو مسلمان کا سایہ بھی پلید سمجھا جاتا تھا کہاں یہ کہ کھانا پکانے والا مسلمان ہو۔ شاید ''باڈی والا'' نے خود کو بہت ماڈرن ثابت کرنے کے لیے ایسا کر رکھا تھا۔ باڈی والا کے بارے میں اے ایس آئی کی بتائی ہوئی باتیں دلچسپ ضرور تھیں لیکن اُن پر یقین کرنا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ایسی باتیں میں نے جب بھی سنی تھیں ایک

کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی تھیں اور تجربے نے ثابت کیا تھا کہ ایسی انہونی باتوں پر یقین نہ کرنا ہی ''تفتیش کرنے والے'' کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

ہم ساڑھے چھ بجے کے قریب جھمرہ میں پہنچ گئے۔ استھان کے دروازے پر بلال شاہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ یہاں خاصا مسرور نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے چوبیس گھنٹے پرشاد کا حلوہ تیار ملتا تھا۔ پھر یہاں اُس کی حیثیت بھی مہمانِ خصوصی کی تھی۔ اس نے زرد رنگ کا تہبند اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ اپنا لباس شاید دھونے کے لیے دیا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر جیپ کے قریب آیا اور بولا۔ ''خان صاحب! جلدی چلیے، شکار نکل نہ جائے۔''

زرد دھوتیوں والے دو موٹے تازے سیوک بھی اچک کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ اُن کی رہنمائی میں ہم تیزی سے جنوب کی طرف بڑھے اور ڈیڑھ دو میل کا کچا پکا راستہ طے کر کے اس ویران شمشان گھاٹ میں پہنچ گئے جسے تین طرف سے استھان کے سیوکوں نے گھیر رکھا تھا۔ ایک سیوک بھاگ کر ہماری جیپ کے قریب آ گیا۔ اسے میں نے استھان میں بھی دیکھا تھا' یہ دوسرے سیوکوں کا سرغنہ محسوس ہوتا تھا۔ اُس کی آواز بہت بیٹھی ہوئی تھی۔ بلند آواز میں بھی بات کرتا تھا تو لگتا تھا سرگوشیاں کر رہا ہے۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ باڈی والا پچھلے چھ گھنٹے سے شمشان گھاٹ کے اندر ہے۔ اُس نے درختوں کے پیچھے ایک ہیولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شمشان گھاٹ کا کوٹھا ہے۔ اس کی دیواریں سلامت ہیں مگر چھت کا ایک حصہ گر چکا ہے۔ باڈی والا اسی کوٹھے میں گھسا ہوا ہے۔ اس کے پاس پکی رائفل ہے اور آپ کے آنے سے پہلے وہ تین چار ''فیر'' بھی کر چکا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے جوابی فائر نہیں کیا؟''

وہ بولا۔ ''ہم تو جی سیوک لوگ ہیں۔ ہماری بھگتی ہمیں خون خرابے کی اجازت نہیں دیتی ورنہ اب تک اس مورکھ کو پکڑ نہ چکے ہوتے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اسلحہ وغیرہ نہیں ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں جی!'' وہ صاف مکر گیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا اُس نے اپنے کھلے چوغے کے نیچے ریوالور یا پستول وغیرہ لگا رکھا ہے۔ میں نے موقع محل کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ شمشان گھاٹ کی پچھلی طرف کھلا میدان تھا۔ کوئی اس طرف سے بھاگتا تو فوراً نظر میں آ جاتا۔ باقی تین اطراف میں جنتر، کیکر اور بیری وغیرہ کے گھنے درخت تھے۔ شمشان گھاٹ کا خستہ حال کوٹھا ذرا بلندی پر واقع تھا اور درختوں کے درمیان سے بھی صاف نظر آتا تھا۔ میگا فون تو

ہمارے پاس تھا نہیں۔ میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور باڈی والا کو پکار کر کہا کہ وہ ہتھیار پھینک کر خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ رات کے سناٹے میں میری آواز دور تک گونجی......لیکن جواب میں مکمل خاموشی طاری رہی۔

میں نے پھر پکار کر کہا۔ ''کرشن کمار (باڈی والا) باہر آجاؤ۔ تم چاروں طرف سے گھیرے میں ہو۔ میں صرف تین منٹ انتظار کروں گا۔ اس کے بعد اپنے نقصان کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔''

میں نے ٹارچ روشن کر کے رسٹ واچ دیکھنا شروع کی۔ بلال شاہ میری دائیں جانب اور اے ایس آئی باجوہ بائیں طرف کھڑے تھے......تین منٹ مکمل خاموشی سے گزر گئے۔ میں نے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ دونوں رائفل مین بھی رائفلیں سونت چکے تھے۔ بلال شاہ کے پاس بھی دیسی ساخت کا ریوالور تھا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ بلال شاہ سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اُس نے زندگی میں شاید پہلی بار تہبند باندھا تھا۔ تہبند کیا باندھا تھا خود کو مصیبت ڈال لی تھی۔ ہلکے پھلکے کپڑے کا تہبند تھا اور ہوا بھی خاصی تیز چل رہی تھی۔ وہ پیچھے سے سنبھالتا تھا تو آگے سے اُڑنے لگتا تھا۔ آگے سے ٹانگوں سے دباتا تو پیچھے پیراشوٹ سا بن جاتا تھا۔ مجھے خطرہ لاحق تھا کہ کہیں وہ سرِ عام تہبند سے محروم ہی نہ ہو جائے۔

ہم درختوں کی آڑ لیتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھے۔ کوٹھے کے بالکل پاس چند جھاڑیاں تھیں، اگر ہم ان تک پہنچ جاتے تو کام آسان ہو سکتا تھا لیکن ابھی ہم جھاڑیوں سے پندرہ بیس گز دور ہی تھے کہ تڑ تڑ گولی چلنے لگی۔ یہ خود کار رائفل کا برسٹ تھا۔ اکٹھی پانچ چھ گولیاں نکلی تھیں۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ گرومہاراج کے سیوکوں نے خود اس کام میں ہاتھ نہ ڈال کر یقیناً چالاکی کا ثبوت دیا تھا۔ فائرنگ ہوتے ہی ہم ایک دم زمین پر گر پڑے۔ میرے رائفل مینوں نے جوابی فائر کیے۔ دھماکوں کے ساتھ اندھیرے میں چنگاریاں سی چھوٹیں اور ایک دم پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ خود کار رائفل کا فائر کوٹھے کے عقب سے ہوا ہے۔ زمین پر لیٹے لیٹے میں سامنے کی طرف رینگنے لگا۔ ریوالور میرے داہنے ہاتھ میں تھا۔ میں نے قریباً پانچ چھ گز فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک دم بارہ بور رائفل کا فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی چیخا۔ چیخ اور فائر کی آوازیں کافی فاصلے سے آئی تھیں۔ مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ ملزم بھاگ رہا ہے۔ صرف دو سیکنڈ بعد اس خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ گرومہاراج کا کوئی سیوک زور سے چیخا۔ ''بھاگ گیا......وہ بھاگ گیا۔'' اس کے ساتھ ہی دھاچوکڑی کی آوازیں آئیں۔ ہم موقعے کی طرف لپکے۔ بلال شاہ بھی ساتھ تھا۔

اُس کا تہبند بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ آخر اُسے رکنا پڑا۔ نہ بھی رکتا تو کون سا تیر مار لیتا۔ ملزم تو بھاگ ہی چکا تھا۔ جنگل ہو اور گہری تاریکی بھی تو کسی بھاگنے والے کو تلاش کرنا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈی جائے۔ سوئی تو پھر بھی نقصان نہیں پہنچاتی لیکن مسلح شخص زبردست نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ہم نے احتیاط سے چند ایکڑ کا علاقہ دیکھا پھر اپنی ناکامی تسلیم کر کے واپس لوٹ آئے۔

شمشان گھاٹ کے کوٹھے میں پہنچے تو عجیب ہی نقشہ نظر آیا۔ مہاراج کے دو سیوک ایک لڑکی کی بندشیں کھول رہے تھے۔ اس لڑکی کو رسّی سے جکڑا گیا تھا اور وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ ایک کونے میں ایک مدقوق بوڑھا اوندھا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں آزار بند کے دو ٹکڑوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اُس کی پیشانی پر ایک زخم بھی تھا۔ کوٹھے کی دیواروں پر کوئلے سے کچھ لکھا گیا تھا۔ یہ ہندی کے اوٹ پٹانگ الفاظ تھے ناگن......عورت دغاباز......موت تیری سزا......اور پتہ نہیں کیا کچھ۔

معلوم ہوا کہ لڑکی کا نام پریما ہے اور بوڑھے کی بہو ہے۔ اُس کا شوہر امرتسر میں مزدوری کرتا تھا۔ بوڑھا پندرہ بیس برس سے اسی شمشان گھاٹ میں رہ رہا تھا۔ پہلے جب یہاں ارتھیاں آتی تھیں وہ مردے جلاتا تھا۔ اب اُسے چلم پینے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ یہ خستہ حال کوٹھا اس کے مختصر خاندان کا مسکن تھا۔

بوڑھے نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا۔ ''پرسوں رات وہ یہاں آیا۔ اُس کے پاس رائفل تھی اور بہت سی گولیاں بھی تھیں۔ اس نے کمبل لپیٹا ہوا تھا۔ قد کاٹھ اور شکل صورت سے وہ کوئی ڈاکو ہی لگتا تھا۔ اُس نے میرے سر پر رائفل کا دستہ مارا اور پھر باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ اُس نے میری بہو سے روٹیاں پکوائیں اور کھانا کھا کر ساری رات شراب پیتا رہا۔ کچھ عجیب سا آدمی تھا وہ۔ کبھی بیٹھا بیٹھا بڑبڑانے لگتا۔ کبھی مٹھیاں بھینچتا۔ کبھی فرش پر مکے مارنے لگتا......اُس نے ہمیں بار بار دھمکی دی کہ ہم خاموش بیٹھے رہیں اور کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کریں ورنہ وہ بری طرح پیش آئے گا......رات کے آخری پہر وہ نشے میں دھت ہو کر میری بہو پر جا پڑا اور میری آنکھوں کے سامنے اُسے ذلیل کرتا رہا۔ کاش میرے ہاتھ آزاد ہوتے اور میں اُس پاپی کو مار دیتا یا خود مر جاتا۔''

اس کوٹھے سے ہمیں گولیوں کے بہت سے خول اور شراب کی دو خالی بوتلیں بھی ملیں۔ پورے فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے...... بوڑھے نے بتایا کہ دیواروں پر کوئلے سے وہی لکھتا رہا ہے۔ نشے کی حالت میں وہ بالکل جنونی نظر آتا تھا اور لگتا تھا کہ کسی کا

بھی خون کر سکتا ہے......

باڈی والا کا یہ روپ ہم سب کے لیے حیران کن تھا۔ کہاں ایک بڑی فیکٹری کا مالک سیٹھ باڈی والا اور کہاں یہ جنونی مجرم۔ لگتا تھا اُس کی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب اُسے پھر آوارگی کے اسی راستے پر لے گیا ہے جس پر وہ دس پندرہ برس پہلے سرپٹ بھاگتا رہا ہے۔ یہ کیا انقلاب تھا۔ کیا اسے اپنی چہیتی بیوی پر بے وفائی کا شبہہ ہوا تھا یا کوئی اور ایسا صدمہ پہنچا تھا جس نے اُس کی ذہنی حالت غیر کر دی تھی۔

اب جھمرہ میں بلال شاہ کی ضرورت نہیں رہی تھی لہٰذا میں اسے اپنے ساتھ امرتسر واپس لے آیا۔ میں نے اسے اس کام پر لگایا کہ وہ باڈی والا کے گھریلو ملازموں سے سن گن لے تاکہ پتہ چلے کہ آخر وہ کیا تنازعہ تھا جس نے باڈی والا کو بیٹے کے قتل پر اکسایا اور اب وہ بیوی کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ ''صاحب ہوٹل'' والی لڑائی میں بسوا کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا اور وہ معذور ہو کر چار مہینے گھر میں پڑا رہا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اتنے دنوں کے لیے گھر میں رہا تھا۔ شاردا اُس کی تیمارداری کرتی رہی تھی۔ یوں انہیں قریب آنے کا موقع مل گیا تھا۔ ممکن تھا کہ اُن کی یہی ''قربت'' باڈی والا کے دل میں کوئی شک جگا گئی ہو اور اُس نے غضب ناک ہو کر بیٹے کو برا بھلا کہا ہو...... اور بعد میں بات بسوا کے قتل تک پہنچ گئی ہو۔

بلال شاہ اپنے کام میں لگا رہا۔ دوسری طرف پولیس بھی باڈی والا کو تلاش کرتی رہی۔ پانچ چھ روز بعد میں نے فیصلہ کیا کہ شاردا سے ایک اور ملاقات کرنی چاہیے اور اُسے سختی کے ساتھ کہنا چاہیے کہ وہ اپنے اور بسوا جیت کے بارے میں کھل کر بتائے۔ یہی ارادہ لے کر میں ایک روز دس گیارہ بجے کے قریب امرتسر سے جھمرہ کے لیے روانہ ہوا۔ بلال شاہ میرے ساتھ تھا اور جیپ بھی وہی تھی جس پر ہم پہلے دو مرتبہ وہاں جا چکے تھے۔ جھمرہ سے تین چار میل کے فاصلے پر جیپ کے انجن سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ بلال شاہ چہکا۔ ''بالکل میری بیوی جیسا حال ہو گیا ہے اس کا۔'' میں نے جیپ سڑک سے اتار کر قریبی درختوں میں روکی اور بونٹ اُٹھا کر پنکھا وغیرہ چیک کرنے لگا۔ پنکھے کا ایک پر تھوڑا سا ٹیڑھا ہو کر ریڈی ایٹر کی جالی سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے پر سیدھا کر دیا۔ جب میں بونٹ بند کر رہا تھا میری نگاہ سڑک کی طرف اُٹھی اور میں بری طرح چونک گیا۔ ایک خستہ حال لاری گزر رہی تھی۔ لاری میں چند ایک سواریاں تھیں۔ سب سے پچھلی کھڑکی میں مجھے ایک شناسا چہرہ نظر آیا...... یہ باڈی والا کا چہرہ تھا۔ میں نے اُس کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ اس کے ہونٹ سیاہ ہو رہے

تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور ایک خانے دار کمبل اُس کے کندھوں پر تھا۔ وہ اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔

لاری گزرتے ہی میں نے بونٹ کو زور سے بند کیا اور بلال شاہ سے کہا کہ وہ جلدی سے جیپ میں بیٹھ جائے۔ وہ ابھی ابھی جھاڑیوں میں پیشاب کر کے اُٹھا تھا۔ آزار بند اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسی طرح جیپ کی طرف لپک آیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی مجھے کھٹارہ لاری کی جھلک نظر آئی۔ کافی فاصلے سے ہم نے لاری کا تعاقب شروع کر دیا۔ قریباً ایک میل بعد اسٹاپ آ گیا۔ لاری ایک لمحے کے لیے رکی اور دو سواریاں چھلانگ لگا کر نیچے اُتر آئیں۔ اُن میں ایک باڈی والا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے جیپ سڑک سے اتار کر درختوں میں روک دی۔ بس سے اُترنے والی ایک سواری تو قریبی گاؤں کی طرف چلی گئی، دوسری سواری یعنی باڈی والا نے کچھ دیر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی پھر دھیمے قدموں سے خشک نالے کی طرف چل دیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا تھیلا تھا۔ کمبل کی بُکل دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کندھے سے رائفل لٹکی ہوئی ہے۔ بس سے اُترتے ہی اس نے چہرہ کمبل میں یوں چھپا لیا تھا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ جیپ وہیں چھوڑ کر ہم نے باڈی والا کا پیچھا شروع کر دیا۔ ہم دونوں سادہ لباس میں تھے اس لیے پہچانے جانے کا زیادہ خطرہ نہیں تھا۔

صرف ڈیڑھ دو فرلانگ چلنے کے بعد باڈی والا کا سفر ختم ہو گیا۔ گلِ عباسی کے بہت سے خود کار پودوں کے درمیان ایک ٹوٹا پھوٹا مندر تھا۔ مندر کے پہلو میں چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ جوہڑ کے ٹھہرے ہوئے شفاف پانی میں مندر کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ گلِ عباسی کے گھنے پودوں میں پہنچ کر باڈی والا نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا پھر تیزی سے مندر کے شکستہ دروازے میں داخل ہو گیا۔

اچانک مجھے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ بلال شاہ کی گردن بھی میرے ساتھ ہی گھومی تھی۔ ہمیں درختوں میں کم از کم چار افراد دکھائی دیئے۔ وہ بڑی آہستگی سے یہاں تک پہنچے تھے۔ میرا ہاتھ خود بخود اپنے سرکاری ریوالور کی طرف رینگ گیا لیکن پھر میرا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ آنے والوں میں لالو راجہ کو میں پہچان گیا تھا۔ یہ لالو راجہ وہی سیوک تھا جسے باڈی والا نے اشنان گھاٹ کے سامنے کنپٹی پر اینٹ مار کر بے ہوش کر دیا تھا اور فرار ہونے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ لالو راجہ اس وقت بھی زرد چوغے میں تھا۔ تاہم اس کے ساتھی جو شکل و صورت سے سیوک ہی نظر آتے تھے عام لباس میں تھے۔

''تم یہاں کیسے؟'' میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ہم سڑک سے گزر رہے تھے اُدھر درختوں میں آپ کی جیپ کھڑی دیکھی.....آپ کو دیکھتے دیکھتے اِدھر آ گئے۔''

میں نے کہا۔ ''چاروں ہو یا اور کوئی بھی ہے؟'' اس نے بتایا کہ وہ چاروں ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''باڑی والا کا کچھ پتہ چلا تم لوگوں کو؟''

نہیں جناب! ابھی تو نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے مہاراج نے ہر طرف بندے دوڑائے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''باڑی والا اس سامنے والے مندر میں ہے۔''

لالو راجہ اور اُس کے ساتھی بری طرح چونک گئے۔ بات تھی بھی چونکنے کی۔ جسے وہ دور تک تلاش کر رہے تھے وہ ان سے چند گز کے فاصلے پر موجود تھا۔

اب مسئلہ باڑی والا کو مندر سے باہر لانے کا تھا۔ وہ ایک خونی تھا اور اس کے پاس طاقتور رائفل تھی۔ برسٹ مارنے والا اسلحہ آج کل بھی خطرناک سمجھا جاتا ہے اور اُس دور میں تو ایسے اسلحے کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ اس موقعے پر لالو راجہ نے ایک جرأت مندانہ پیشکش کی۔ اُس نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! میں مندر کی عمارت کو اندر سے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے لیے آسانی رہے گی کہ اُس راکشس کو بے خبری میں جا پکڑوں۔ مندر کے درمیان والے کمرے میں ایک بغلی دروازہ بھی ہے۔ اگر وہ دروازہ مجھے مل گیا تو سمجھیں میں نے اُس پر قابو پا لیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر تم اپنی خواہش سے یہ کام کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو۔''

اُس نے کہا۔ ''اس کام کے لیے مجھے آپ کے ریوالور کی ضرورت ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو سرکاری ریوالور ہے میں نہیں دے سکتا.....ہاں بلال شاہ کے پاس دیسی پستول ہے۔''

بلال شاہ نے اپنا پستول لالو راجہ کو تھما دیا۔ اُس نے پستول کو خالی چلا کر چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر کُرتے کے نیچے لگا لیا۔ اس کے بعد وہ بڑے اعتماد سے مندر کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے دو سپاہیوں کو مندر کے اُس پہلو میں بھیج دیا جہاں جوہڑ نہیں تھا۔ میں اور بلال شاہ گلِ عباسی کے پودوں میں چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ اب اگر باڑی والا مندر سے بھاگنے کی کوشش کرتا تو اُسے آڑے ہاتھوں لیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی یہ دن تھا' رات نہیں تھی کہ اس کا داؤ چل جاتا۔

میری نگاہیں مندر کے بیرونی دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور انگلی ریوالور کی لبلبی پر تھی۔

دروازے سے میرا فاصلہ چالیس فٹ کے قریب تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری پہلی گولی ہی کام کرے گی۔''

قریباً دو منٹ بعد لالو راجہ کی صورت دروازے پر نظر آئی۔ اُس نے بلندی سے اردگرد نگاہ دوڑائی پھر بھاگتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے وہ پچھلے دروازے سے نکل گیا ہے۔ ابھی دور نہیں گیا ہو گا۔ آیئے دیکھیں۔'' وہ ہمیں ساتھ لے کر عقبی درختوں کی طرف بڑھا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہم تین تین کی دو ٹولیوں میں بٹ کر دو مختلف سمتوں میں باڑی والا کو ڈھونڈنے لگے۔ عجب تماشہ ہو رہا تھا ہمارے ساتھ۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ باڑی والا ہاتھ آتے آتے چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ مندر کے اردگرد کا سارا علاقہ کٹی پھٹی زمین' چھوٹے چھوٹے جوہڑوں اور خاردار جھاڑیوں سے اَٹا ہوا تھا...... ایک بار پھر باڑی والا کی تلاش بُری طرح ناکام ہو گئی۔ ہم خاک چھان کر اُس مندر میں واپس آ گئے جہاں سے ملزم فرار ہوا تھا۔

مندر صرف دو کمروں اور چھ ضرب چھ کے چھوٹے صحن پر مشتمل تھا۔ پچھواڑے کی طرف جا کر ہم نے مندر کا عقبی دروازہ دیکھا اور حیران رہ گئے۔ وہاں ایک موٹی کنڈی میں بہت موٹا قفل جھول رہا تھا۔ قفل اندر کی طرف تھا۔ اُس پر جالے لگے تھے اور مہینوں پرانی گرد پڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ قفل کو مہینوں سے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس دروازے کے علاوہ مندر میں کوئی ایسا رستہ تھا ہی نہیں جہاں سے فرار ہوا جا سکتا۔ ہم چکرا کر رہ گئے۔ دھیان فوراً کسی پوشیدہ گوشے یا تہہ خانے کی طرف چلا گیا۔ ایک بار پھر ہمیں پوری طرح چوکس ہونا پڑا۔ یہ کوئی بہت بڑی عمارت نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے دو کمرے تھے اور اس سے بھی چھوٹا صحن تھا۔ ان کمروں اور صحن کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں کوئی تہہ خانہ نہیں ہو سکتا۔ اگلے دس منٹ میں اس اندازے کی پوری پوری تصدیق ہو گئی۔ ہم نے ایک ایک انچ جگہ دیکھ لی۔ مندر میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں چھپا جا سکتا۔

یہ بڑی عجیب وغریب بلکہ پُراسرار صورتِ حال تھی۔ باڑی والا ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے داخل ہونے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی ہم غافل نہیں ہوئے تھے۔ کوئی ایسا راستہ تھا جہاں سے وہ نکل سکتا اور نہ ایسا تہہ خانہ تھا جہاں چھپ سکتا..... بلال شاہ کے چہرے پر زردی چھانے لگی۔ وہ لڑائی بھڑائی سے ڈرنے والا بندہ نہیں تھا۔ ہر اوکھلی میں سر دے دیتا تھا لیکن جہاں کہیں بھوت پریت اور آسیب وغیرہ کی بات ہوئی بلال شاہ کے پیٹ میں گڑگڑ ہونے لگی۔

''خاں صاحب! چلو چلیں یہاں سے...... مجھے تو ڈر سا لگنے لگا ہے۔'' وہ منمنایا۔

میں بلال شاہ کو کیا جواب دیتا۔ میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا اے ایس آئی کی بتائی ہوئی بات میں کوئی حقیقت نہیں لیکن نہ جانے کیوں وہ بات خواہ مخواہ میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اے ایس آئی نے کہا تھا۔ ''باڑی والا اپنے چھ عدد بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے اور سال کے پہلے دو مہینوں میں پیدا ہوا تھا۔ موواڑی خاندان میں ایسے افراد کو خاص صلاحیتوں کا مالک سمجھا جاتا ہے اور وہ قسمت کے دھنی ہوتے ہیں......''

قسمت کا دھنی تو یہ شخص واقعی تھا۔ وہ دو دفعہ گرفتاری سے صاف بچ گیا تھا اور تیسری دفعہ ایک بند چار دیواری سے یوں غائب ہو گیا تھا کہ عقل چکرا کر رہ گئی تھی اور بلال کے دماغ میں تو باقاعدہ ''موچ'' آ گئی تھی۔ لالو راجہ اور اس کے ساتھی بھی حیران نظر آتے تھے۔

ڈھائی تین بجے ہم جیپ میں سوار ہو کر جھمرہ کی طرف چل دیئے۔ لالو راجہ اور اس کے ساتھی بھی ایک تانگے پر سوار ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ استھان میں ہمیں چھوٹے مہاراج نے خوش آمدید کہا۔ میں یہاں شاردا سے پوچھ گچھ کرنے آیا تھا لیکن یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ وہ یہاں سے جا چکی ہے۔ مایوسی کے علاوہ یہ بات حیرانی کی بھی تھی۔ میں نے اسے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ وہ تھانے میں اطلاع دیئے بغیر کہیں نہیں جائے گی۔ اُس نے تھانے میں اطلاع دینا تو دور کی بات ہے استھان میں بھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔ معلوم ہوا کہ پرسوں دو پہر وہ خاموشی سے استھان چھوڑ گئی۔ استھان سے چند فرلانگ دور ایک سیوک نے اسے دیکھا۔ اس نے سیوک کو بتایا کہ وہ کسی کام سے قریبی قصبے میں جا رہی ہے ابھی ایک دو گھنٹے میں آ جائے گی۔ سیوک نے اسے کہا کہ اس کا شوہر ابھی گرفتار نہیں ہوا اور علاقے میں ہی کہیں گھوم رہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ اسے نقصان پہنچا جائے۔ وہ بولی کچھ نہیں ہو گا اور یہ بھی کہا کہ وہ چھوٹے مہاراج سے ''آ گیا'' لے کر آئی ہے۔

شاردا یہاں سے کیوں چلی گئی تھی جبکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ استھان سے باہر اس کے لیے شدید خطرہ ہے۔ مجھے یہ معاملہ کافی الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ چھوٹے مہاراج سے یہ بھی پتہ چلا کہ شاردا کی ماں اس سے ملنے استھان میں آئی تھی اور ایک شب یہاں رہ کر واپس چلی گئی تھی۔ میں نے چھوٹے مہاراج سے کہا کہ اس نے شاردا کے چلے جانے کی اطلاع تھانے میں کیوں نہیں دی۔

وہ بولا۔ ''جناب! مجھے کل شام تک امید تھی کہ وہ واپس لوٹ آئے گی۔ آج صبح میں اطلاع پہنچانا چاہتا تھا لیکن خراب موسم کی وجہ سے کسی کو بھیج نہیں سکا۔ دو پہر کو موسم ذرا ٹھیک

ہوا تو میں نے لالو راجہ کو بھیجا لیکن راستے ہی میں لالو کی ملاقات آپ سے ہو گئی اور وہ آپ کے ساتھ ہی پھر استھان آ گیا۔''

چھوٹے مہاراج اور دیگر افراد کے ساتھ بات چیت میں شام ہو گئی۔ شام ہوتے ہوتے موسم پھر خراب ہو گیا۔ تاریک بادل گھر آئے اور بارش کا سلسلہ جو دو پہر سے پہلے تھم گیا تھا اور ایک بار پھر زور وشور سے شروع ہو گیا۔ واپسی کا راستہ بہت خراب تھا اور ہماری جیپ بھی کوئی ایسی قابلِ بھروسہ نہیں تھی۔ ہم نے وہیں استھان میں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ بلال شاہ اس فیصلے پر بہت خوش تھا۔ یہ جگہ اور یہاں کی گہما گہمی اُسے کچھ زیادہ ہی پسند آ چکی تھی۔ وہ میلوں ٹھیلوں کا شوقین تھا اور استھان میں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ کھانے پینے کا سامان بھی بہت تھا۔ موسلا دھار برستی بارش میں کسی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر گرما گرم کڑاہ (حلوہ) کھانے کا مزہ بلال شاہ اچھی طرح جانتا تھا۔

جوں جوں اندھیرا گہرا ہوتا گیا بارش زور پکڑتی گئی۔ ہم سب کے لیے استھان میں ایک شب کا قیام ضروری ہو گیا۔ دور دراز سے آئے ہوئے عقیدت مند بھی مجبوراً استھان میں ہی رک گئے۔ چھوٹے مہاراج کے حجرۂ خاص کے پاس ہی مجھے بھی سونے کے لیے ایک کمرہ دے دیا گیا۔ کمرہ چھوٹا سا تھا لیکن خوب سجا ہوا تھا۔ فرش پر قالین تھا اور مسہری بھی بہت آرام دہ تھی۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا تھا۔ بستر پر گرتے ہی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ابھی مشکل سے اونگھ ہی آئی تھی کہ ایک آواز نے چونکا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے کی خواب ناک روشنی میں ایک سراپا قیامت میرے سامنے کھڑی تھی۔ یہ وہی چاندنی نامی لڑکی تھی جسے مہاراج کی پتنی کہا جاتا تھا۔ وہ مختصر لباس اور بھاری بھر کم گہنوں سے آراستہ تھی وہ اس انداز سے آگے بڑھی کہ گہنے آپس میں ٹکرا کر آواز پیدا نہ کریں۔ پھر بہ آہستگی ایک تپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔

کہنے لگی۔ ''انسپکٹر صاحب! چھوٹے مہاراج گہری نیند سو رہا ہے۔ میں چھپ چھپا کر آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

''کیوں خیریت ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ایک دو بہت جروری باتیں کرنی ہیں آپ سے۔ کئی روج سے موقع دیکھ رہی تھی۔ بھگوان کا شکر ہے کہ آج آپ ادھر رہ گئے۔''

''کیسی باتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس استھان اور یہاں کے رہنے والوں کی باتیں۔'' چاندنی نے روانی سے جواب

دیا۔ اُس کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ کہنے لگی۔ ''آپ تھانیدار ہیں اور آپ میں ہمت بھی ہے۔ میرا من کہتا ہے کہ آپ اس بارے میں کچھ نہ کچھ کر سکیں گے۔'' اُس نے محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''تھانیدار صاحب، چھوٹے مہاراج وہ نہیں جو اوپر سے نجر آتا ہے اور جو یہاں کے لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ چھوٹے مہاراج مجھے اپنی پتنی کہتا ہے لیکن میں اس کی پتنی نہیں رکھیل ہوں۔ وہ مجھے نجام آباد کے چکلے سے ساڑھے چھ سو روپے میں خرید کر لایا تھا۔ اُس کا کھیال ہے کہ لوگ شادی شدہ مرد پر جیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ اس لیے مجھے اپنی بیوی بتاتا ہے۔ اس استھان میں چوری چھپے ہر برا کام ہوتا ہے۔ میرا کھیال ہے آپ کو یہ سن کر جرور حیرانی ہوگی کہ شاردا کھود یہاں سے نہیں گئی۔ اسے مجبور کیا گیا ہے۔ یہ حرام جادہ چھوٹے مہاراج دو ہفتوں سے اُس پر رال ٹپکا رہا تھا۔ بڑے جال پھینکے ہیں اس نے شاردا پر۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ وہ شاردا سے کہہ رہا تھا وہ اس کے بغیر جندہ نہیں رہ سکتا...... وہ بیچاری اس کتے کے دانتوں سے اپنی عجت بچاتی رہی جس طرح بھی ہو سکا اُسے ٹالتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ استھان سے باہر اس کے لیے سکھت کھترہ ہے لیکن جب اسے اپنی عجت بچتی نظر نہ آئی تو وہ یہاں سے چلی گئی...... اور ایسا کچھ یہاں صرف شاردا کے ساتھ ہی نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کتنی عورتوں کو پناہ دے کر یہاں بعد میں کھراب کیا گیا ہے......''

تصویر کا یہ رخ میرے لیے سنسنی خیز تو تھا لیکن حیران کن نہیں تھا۔ میں پہلے دن جان گیا تھا کہ یہ استھان باہر سے کچھ اندر سے کچھ ہے...... ہاں شاردا کے بارے میں یہ سن کر ضرور حیرانی ہوئی تھی کہ اُس کے جانے کی وجہ چھوٹے مہاراج کی بدمعاشی ہے۔

چاندنی بولی۔ ''جرا آیئے میرے ساتھ میں آپ کو بڑے مہاراج کے درشن بھی کراؤں۔ وہ کمینہ ہر وقت اپنے کھاص کمرے میں پڑا رہتا ہے۔ مہینے میں شاید ایک دفعہ ہی باہر نکلتا ہو۔''

وہ مجھے ساتھ لے کر باہر نکلی اور ایک چور دروازے سے گزار کر ایک چھوٹی سی کھڑکی کے سامنے لے آئی۔ کھڑکی میں سلاخیں تھیں۔ اس نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر پٹ کو ذرا سا دھکیلا اندر موم بتی کی مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اندر جھانکتی رہی پھر بولی۔ ''سو رہا ہے حرام جادہ۔ آپ بھی جرا دیکھیں۔''

وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر کھڑکی میں جھانکا۔ آنکھیں کھلی رہ گئیں...... گوشت کا ایک پہاڑ ایک بہت بڑے پلنگ پر نظر آ رہا تھا۔ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا پھر بھی اس کی صورت دیکھ کر خوف آتا تھا۔ سفید چادر کے نیچے صرف وہی نہیں تھا

ایک جواں سال لڑکی بھی تھی۔ چادر لڑکی کی گردن تک کھچی ہوئی تھی اور اس کے بال تکیے پر دور تک بکھرے تھے۔ وہ بھی محوِ خواب تھی۔ ممکن تھا چھوٹی مہارانی چاندنی کی طرح یہ بڑے مہاراج کی بڑی مہارانی ہو...... میں نے دیکھا اس کمرے میں کئی ایسی اشیاء نظر آ رہی تھیں جو جن بھوت اتارنے والے عاملوں کے حجروں میں ہوتی ہیں۔ آسیب زدہ شخص پر تشدد کر کے اسے ادھ مُوا کر دیا جاتا ہے اور جب وہ بولنے کے قابل بھی نہیں رہتا تو اعلان کیا جاتا ہے کہ ''حضرت جن'' فرار ہو گئے ہیں۔ ان اشیاء میں دھونی دینے کے آلات، لوہے کے شکنجے، مارنے پیٹنے کے لیے لکڑی کے ایسے ڈنڈے جن کے سروں پر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ الٹا لٹکانے کے لیے رسے اور پانی میں غوطے دینے کے لیے بڑا سا ٹب۔ معلوم نہیں اس حجرے میں آسیب زدہ شخص پر کیا کیا بیت جاتی تھی۔

چاندنی سرگوشی میں بولی۔ ''اس کمرے میں یہ گنجا لوگوں کے بھوت بھی اتارتا ہے۔ دو دروازے ہیں یہاں۔ ایک سے عورتیں اندر آتی ہیں دوسرے سے مرد۔''

مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس کے سامنے میں نے ایک دن عورتوں کی طویل قطار دیکھی تھی۔ بیمار لڑکی کی چیخ و پکار اور آہ و زاری میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ کیسی ستم ظریفی تھی یہ۔ وہ مریض جن کو کسی اچھے دماغی یا جسمانی ڈاکٹر اور ہسپتال کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کمرے میں ہمدردی کی بجائے بے رحمی کے مستحق ٹھہرتے تھے۔ یہاں بیماری کو ختم کرنے کی بجائے ''بیمار'' کی ایسی تیسی کی جاتی تھی اور اسے نیم جان کر کے واپس بھیج دیا جاتا تھا۔

وہاں کھڑکی کے سامنے کھڑے مجھے ایک نیا خیال آیا۔ ایک دم دماغ میں روشنی سی ہو گئی۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ آج دوپہر یہاں سے چند میل دور ہمارے ساتھ کیا ڈرامہ ہوا تھا...... باڈی والا پرانے مندر میں داخل ہونے کے بعد گم کیوں ہو گیا تھا......

اچانک بجلی زور سے کڑکی۔ در و دیوار ہل گئے۔ اندر پلنگ پر سوئے ہوئے پہاڑ میں بھی زلزلہ پیدا ہوا۔ اس نے بڑی مشکل کے ساتھ کئی قسطوں میں کروٹ بدلی اور منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لینے لگا۔ چاندنی نے میرا بازو تھاما اور اُسی کمرے کی طرف چل دی جہاں سے ہم آئے تھے۔ چور دروازے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک سلاخ دار کھڑکی سے باہر جھانکا...... بارش تابڑ توڑ برس رہی تھی۔ مجھے میرے کمرے میں چھوڑ کر چاندنی جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میں بستر پر چت لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ وہ اسرار جس نے آج دوپہر ہمیں چکرا کر رکھ دیا تھا اب میرے لیے اسرار نہیں رہا تھا...... باڈی والا

ہمارے سامنے مندر میں گھسا تھا اور اس وقت بھی مندر میں ہی تھا جب لالو راجہ نے مندر سے باہر آ کر ہمیں بتایا تھا کہ وہ مندر میں نہیں ہے۔ بات بالکل سیدھی سادی تھی۔ چھوٹے مہاراج اور اس کے کارندے اب قابلِ بھروسہ نہیں رہے تھے۔ چند روز تک وہ ضرور باڑی والا کے خلاف تھے لیکن اب نہیں۔ اب وہ شاردا کے خلاف تھے اور اس کی وجہ وہی تھی جو ابھی چاندنی نے بتائی تھی...... شاردا نے چھوٹے مہاراج کی خواہش کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا تھا اور نتیجے میں اسے نہ صرف اپنی پناہ گاہ سے محروم ہونا پڑا تھا بلکہ پناہ دینے والا بھی اس کا دشمن ہو چکا تھا۔ یقیناً لالو راجہ بھی یہ بات جانتا تھا کہ اب اس کا مالک کس کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ہماری بے خبری کا فائدہ اُٹھایا تھا اور باڑی والا کو ہماری گرفت سے صاف بچا لیا تھا۔

بات اب کھل چکی تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ پوری قوت سے...... چھوٹے مہاراج پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔ اس کے کارندے لالو راجہ کو بھی پکڑ لیا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ باڑی والا اب کہاں ہے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ بارش بند ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں اور مقامی تھانے میں پہنچ کر چند ہوشیار مخبروں کو استھان کی نگرانی پر لگا دوں۔ یقینی بات تھی کہ اب لالو راجہ دوبارہ باڑی والا کے پاس پہنچے گا۔ یہ عین ممکن تھا کہ مندر میں اس باڑی والا کو وہ ٹھکانہ بھی بتا دیا ہو جہاں دوبارہ ان کی ملاقات ہونا تھی۔

سوچ بچار کے بعد میں نے دوسری ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے تیسے رات استھان میں کاٹی اور صبح نو دس بجے کے قریب جیسے ہی بارش رکی، اپنے عملے کے ساتھ استھان سے نکل آیا۔ بلال شاہ کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ پیٹ بھر کر حلوہ کھانے کے باوجود ساری رات نہیں سو سکا۔ میں نے پوچھا تو یہ اندازہ درست نکلا۔ وہ بولا۔ ''ساری رات برے برے خیال آتے رہے ہیں جی۔ بڑے بوڑھے ٹھیک ہی کہتے ہیں پکی جگہیں خطرناک ہوتی ہیں۔ ہوائی چیزیں بندے کے پیچھے لگ جاتی ہیں۔''

پکی جگہ سے بلال شاہ کی مراد ''پرانا مندر'' تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایک بار پھر اس مندر کا جائزہ لینا چاہتا ہوں تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ ''رہنے دیں خان صاحب! کیوں ہمیں ''جن چڑھانے'' کا پروگرام بنا لیا ہے آپ نے...... کچھ نہ کچھ ضرور ہے وہاں...... بلکہ میرا تو خیال ہے بہت کچھ ہے۔''

''تمہارا خیال غلط ہے'' میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں ہے وہاں...... بس ہم ہی ذرا چکر میں آ گئے تھے۔''

پھر میں نے بلال شاہ کو تمام تفصیل بتائی اور اس کا خوف کسی حد تک کم کیا۔ بلال شاہ یہ جان کر حیران ہوا کہ چھوٹے مہاراج نے شاردا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور ناکام ہو کر اب اس کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ مندر راستے ہی میں پڑتا تھا۔ ہم نے جیپ مندر کے قریب روکی اور محتاط نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید باڑی والا اب بھی وہاں موجود ہو لیکن یہ امید بر نہیں آئی۔ باڑی والا اب اتنا بھی پاگل نہیں تھا کہ چھاپہ پڑنے کے باوجود مندر کو ٹھکانہ بنائے رکھتا۔ کل دوپہر پیش آنے والی صورتِ حال واضح تھی۔ لالو راجہ نے مندر میں داخل ہو کر باڑی والا کو بتا دیا تھا کہ پولیس اس تک پہنچ گئی ہے اور پولیس والے باہر گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ باہر آ کر اس نے ہمیں چکر دیا کہ ملزم پچھلے دروازے سے نکل گیا ہوگا۔ جب ہم جھاڑیوں میں اسے تلاش کر
''وہ سچ مچ مندر سے نکل کر غائب ہو گیا۔

مدر میں گھوم پھر کر ہم مقامی تھانے میں آ گئے۔ میں نے ایس ایچ او کو ساری حقیقت بتائی اور اسے کہا کہ وہ فوراً استھان کی خفیہ نگرانی کا انتظام کرے۔

☆======☆======☆

یہ تیسرے روز کی بات ہے جھمرہ کا ایس ایچ او بیدی خود میرے پاس امرتسر پہنچا اور اس نے بتایا کہ باڑی والا کا کھوج لگ گیا ہے۔ وہ خاصا پُر جوش نظر آ رہا تھا۔ بتانے لگا کہ استھان کی مسلسل نگرانی کی جا رہی تھی۔ لالو راجہ بھی زیرِ نگرانی تھا۔ آج صبح سویرے لالو راجہ استھان سے نکلا اور جھمرہ کے قصبے کے ایک مشکوک پان فروش دلبر جانی سے ملاقات کی۔ یہی دلبر جانی بارہ بجے کے قریب باڑی والا کو لے کر استھان پہنچ گیا۔ باڑی والا نے اپنا منہ سر ایک کمبل میں لپیٹ رکھا تھا اور اس کے پاس آٹومیٹک رائفل بھی موجود تھی۔ وہ نشے میں دُھت نظر آتا تھا...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مندر سے بھاگنے کے بعد جھمرہ قصبے میں چلا گیا ہو اور اب تک اسی پان فروش کے پاس چھپا ہوا ہو۔ میں نے ایس ایچ او بیدی سے پوچھا۔ ''اب کیا ارادے ہیں؟ استھان پر چھاپہ مارا جائے۔''

وہ سکھ ہونے کے باوجود سگریٹ پیتا تھا ایک طویل کش لے کر بولا۔ ''یار نواز خاں! کیوں نہ اس موقعے سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم نے ابھی باڑی والا کی پتنی کا کھوج بھی لگانا ہے۔ مجھے تو شک پڑتا ہے کہ یہ حرامی کیا نام ہے اس کا چھوٹے مہاراج...... اس کو پتہ چل گیا ہے کہ گُڑی (شاردا) کہاں ہے۔ اب یہ باڑی والا کو اس کا اتہ پتہ بتائے گا اور پوری طرح بھڑکا کر اس کی طرف بھیج دے گا۔ میں ان ''استھان کے سیوکوں''

کو اچھی طرح جانتا ہوں‘ یہ حرام کے تخم خود دنگا فساد نہیں کرتے......خون خرابے سے بھی بچ کر رہتے ہیں۔ یہ سارے کام وہ دوسروں سے کرواتے ہیں اور اگر خود کریں تو بہت ہاتھ پاؤں بچا کر کرتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔’’تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔‘‘

وہ بولا۔’’مطلب یہ ہے کہ ہم جیتے ہوئے گھوڑے پر دوبارہ شرط لگائیں۔ یعنی جس طرح ہم نگرانی کر کے باڈی والا تک پہنچے ہیں‘ ایسے ہی باڈی والا کی نگرانی کر کے شاردا تک پہنچ جائیں۔‘‘

’’لیکن یہ پُر خطر کام ہے۔‘‘ میں نے فوراً جواب دیا۔’’باڈی والا کے سر پر خون سوار ہے۔ ہمیں اسے اتنا موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ شاردا تک پہنچ کر اسے نقصان پہنچا سکے...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری نگرانی سے سارا کام ہی چوپٹ ہو جائے۔ ملزم ہوشیار ہو کر نکل بھاگے۔ شاردا بھی نہ ملے اور باڈی والا بھی مفرور ہو جائے۔‘‘

’’پھر کیا کرنا چاہیے؟‘‘ بیدی نے پوچھا۔

’’میرے خیال میں تو وقت ضائع کیے بغیر فوراً باڈی والا کو اس کے ساتھ چھوٹے بڑے مہاراج کو چھاپ لینا چاہیے......نو نقد نہ تیرہ ادھار۔‘‘

دیگر عملے سے صلاح مشورے کے بعد ہم نے فوراً جھمرہ پہنچنے کی ٹھانی لیکن ابھی تھانے سے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جھمرہ سے فون آ گیا۔ فون کرنے والا بیدی کا سب انسپکٹر تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے باڈی والا استھان سے قریبی گاؤں ’’کالی پورا‘‘ کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ لالو راجہ بھی ہے۔ دونوں ایک تانگے پر سوار ہیں اور بغیر رکے سفر کرتے رہے تو ڈیڑھ گھنٹے میں کالی پورا پہنچ جائیں گے۔ سب انسپکٹر نے مخبر کے حوالے سے بتایا کہ ان کے ارادے خطرناک نظر آتے ہیں......اور یہ عین ممکن ہے کہ شاردا ’’کالی پورا‘‘ میں ہو اور وہ اسی کی طرف جا رہے ہوں (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ مخبر کو یہ اہم اطلاع دینے والی چھوٹے مہاراج کی رکھیل چاندنی تھی)۔

یہ بڑی کارآمد اطلاع تھی اور بہت بروقت پہنچی تھی۔ امرتسر کے تھانے سے کالی پورا کا فاصلہ ایک گھنٹے کا تھا (جیپ پر) ہم ابھی روانہ ہو جاتے تو لالو راجہ کے تانگے سے پہلے ’’کالی پورا‘‘ پہنچ سکتے تھے۔ ہم تیار تو پہلے سے تھے۔ فوراً جیپ میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ پنجابی کی ایک مثال مشہور ہے ’’کالیاں اگے ٹوئے‘‘ یونہی جلدی کا کام خراب ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کالی پورا جاتے ہوئے یہی کچھ ہوا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے ہماری کھٹارہ جیپ بیچ

رستے کہ ناراض ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ اگر باڈی والا واقعی اپنی پتنی کی طرف گیا تھا تو ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ بڑے جتنوں کے ساتھ نصف گھنٹے میں ہم نے جیپ کو منایا اور دوبارہ ’’کالی پورا‘‘ کی طرف روانہ ہوئے۔

کالی پورا اس ڈیک نالے کے کنارے واقع ہے جو امرتسر والی نہر کے متوازی واہگہ کی طرف آتا ہے اور پھر آگے جا کر راوی میں داخل ہو جاتا ہے۔ چند گلیوں سے گزر کر ہماری جیپ گاؤں کے بڑے چوراہے میں داخل ہوئی۔ نہ جانے کیوں چوراہے میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم لیٹ ہو چکے ہیں۔ وہ سنگین واقعہ جس کے رُونما ہونے کا خدشہ تھا‘ رُونما ہو چکا ہے۔ مجھے کچھ حیران پریشان چہرے نظر آئے جو ایک تنگ گلی میں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ ایسے ہی چہروں والے لوگ گلی سے باہر بھی نکل رہے تھے۔ بہت سے لوگ اِدھر اُدھر ٹولیوں میں کھڑے چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ پولیس جیپ دیکھ کر لوگ دائیں بائیں کھسکنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں چوراہے کی رونق آدھی رہ گئی۔ ایک شخص بھاگ کر جیپ کے قریب آیا اور بولا۔

’’میں نمبردار کا چھوٹا بھائی ہوں جی......گلی میں قتل ہو گیا ہے۔ قاتل چھت پر ہے‘ آپ جلدی آئیں جی۔‘‘

میں جانتا تھا کہ باڈی والا کے پاس نہایت خطرناک رائفل ہے۔ ضروری تھا کہ ہم جو کچھ کریں بہت احتیاط سے کریں۔ اس بات کا علم تو ہمیں جائے واردات پر پہنچ کر ہوا کہ قتل کرنے والا مرد نہیں عورت ہے۔ یہ ایک پختہ مکان تھا۔ دیوار پر اُپلے لگے ہوئے تھے۔ بھدے سے دروازے کی دوسری جانب ڈیوڑھی میں بھینس بندھی تھی۔ مکان کے گرد لوگ جمع تھے اور چھت کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا ’’وہ کھڑی ہے‘‘ کوئی پکار رہا تھا ’’وہ دیکھیں، وہ پرلی طرف گئی ہے۔‘‘ آوازوں میں دہشت تھی اور چہرے خوف و ہراس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے بتایا کہ نیچے کمرے میں دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں قتل اس عورت نے کیے ہیں۔ یہاں تک لانے والا نمبردار کا بھائی بولا۔’’اس نے چھری ماری ہے جی دونوں کو۔ ان میں سے ایک تو مر گیا ہے دوسرا شدید زخمی ہے۔ چھری مار کر وہ بھاگنے لگی تھی۔ پڑوسیوں نے پیچھا کیا تو سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی۔ انہوں نے نیچے آنے والا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اب وہ چھت پر ہی پھنسی ہوئی ہے۔‘‘

میں نے دیکھا‘ یہ مکان گاؤں میں ہونے کے باوجود شہری مکانوں سے ملتا جلتا تھا۔ دیواروں پر پلستر کیا گیا تھا اور برے بھلے بیل بوٹے بنے تھے۔ چھت اس طرح کی تھی کہ

عورت جنگلہ پھلانگ کر کسی دوسری چھت پر بھی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ اوپر قید ہو کر رہ گئی تھی۔ دفعتاً جنگلے میں سے مجھے اس کی جھلک نظر آئی۔ اس کے سر پر کالی چادر تھی۔ میں پہچان گیا۔ وہ شاردا ہی تھی۔ میں نے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور بھاگتا ہوا مکان کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ سیڑھیوں کی دیوار پر مجھے خون کے دھبے صاف نظر آئے۔ سیڑھیوں کا بالائی دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر سن گن لی۔ کوئی آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ یقیناً یہ شاردا تھی۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور کنڈی کھول کر چھت پر چلا گیا۔ شاردا چھت کے وسط میں کھڑی تھی۔ خون آلود چھری اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔

”خبردار...... میرے قریب مت آنا۔“ وہ خوفناک آواز میں بولی۔

”مجھے گولی چلانے پر مجبور مت کرو شاردا!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت مجھے اپنے اے ایس آئی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ سامنے والے رخ سے چھت پر چڑھ آیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جنگلے پر تھے اور وہ بازوؤں کے زور پر اوپر اُٹھتا آرہا تھا۔ اس کی آہٹ سن کر شاردا نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔ یہ ایک لمحہ بڑا قیمتی تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور قریباً پانچ قدم کا فاصلہ سیکنڈ کے چوتھے حصے میں طے کر کے شاردا پر جا پڑا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی دائیں کلائی پر پڑا۔ وہ بڑے زور سے ٹائیلوں کے فرش پر گرتی...... لیکن میں نے گرتے گرتے اسے اپنے اوپر کر لیا۔ یوں وہ شدید چوٹ سے محفوظ رہی۔ گرنے کے بعد وہ بری طرح مچلی لیکن اس دوران اے ایس آئی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اسے دبوچ لیا۔

شاردا پر جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ہم اسے کھینچ تان کر نیچے لائے۔ وہ بری طرح چیخ چلا رہی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس ہی ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں اب لوگوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ میں نے باڑی والا کو دیکھا۔ چند افراد اسے اُٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ پیٹ پر سے اس کی قمیص خون سے تر تھی۔ اسے ایک ننگی چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ اسے فوری طور پر ہسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت ہے۔

اسے دیکھ کر شاردا چلائی۔ ”کتے! تجھے جان بوجھ کر چھوڑا ہے...... جان بوجھ کر چھوڑا ہے تجھے۔ تیری جان اتنی آسانی سے نہیں نکلے گی۔ تیری بیٹی ہیرا منڈی کے چکلے میں ناچے گی۔ تیرے نواسیاں نواسے خاندانی کنجر کہلوائیں گے۔ تُو جدھر جائے گا لوگ تیرے منہ پر

تھوکیں گے اور تجھے جوان بیٹے کا قاتل کہیں گے۔ دن رات انگاروں پر لوٹے گا تُو اور جل جل کر مرے گا...... تُو نے میرا سہاگ اجاڑا تھا۔ میں نے تیری زندگی اجاڑ دی ہے۔ نسل ختم کر دی ہے تیری......“ وہ حلق کی پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ لگتا تھا ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔

☆======☆======☆

تھانے میں پہنچ کر شاردا کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے ایک طویل بیان دیا۔ اس بیان سے یہ اہم انکشاف ہوا کہ پانچ سال پہلے شاردا کا پہلا شوہر ہلاک نہیں ہوا تھا۔ اسے قتل کیا گیا تھا اور قتل کرنے والا وہی تھا جو بعد میں اس کا دوسرا شوہر بنا' یعنی باڑی والا...... (دیکھا جائے تو یہ کہانی شہنشاہِ جہانگیر' نور جہاں اور علی قلی کی مشہور و معروف کہانی سے ملتی جلتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کہانی کے مطابق مظلوم عورت نے ظالم کے سامنے سر جھکا کر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا جبکہ یہاں مظلوم عورت نے اپنی مانگ اجاڑنے والے سے بدلہ لیا اور اسے انتقام کی آگ میں جلا کر عبرت نگاہ بنا دیا) یہ کہانی اس دن ہی شروع ہو گئی تھی جب چند سال پہلے شاردا دلہن بن کر ”گوارا“ نامی بستی میں اُتری تھی۔ باڑی والا تب تک بدمعاشی چھوڑ چکا تھا اور اس کا شمار علاقے کے کھاتے پیتے معتبر لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ ویسے بھی وہ مواڑی خاندان میں بڑا بھاگوان سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے والدین کی چھٹی اولاد تھا اور سال کے دو پہلے مہینوں میں پیدا ہوا تھا۔ مواڑی برادری کے بعض لوگ اسے شادی بیاہ میں خاص طور پر بلاتے تھے اور وہ دلہن یا دلہا کے ہاتھ پر چاندی کا روپیہ رکھ کر ایک پرانی رسم پوری کرتا تھا۔ اس روز باڑی والا نے شاردا کی گوری ہتھیلی پر بھی چاندی کا روپیہ رکھا اور ساتھ ہی ساتھ اس پر اپنی آنکھ بھی رکھ لی۔ شاردا کا چمکتا دمکتا نوخیز حسن اس کے سینے میں تیر کی طرح لگا اور وہ شیطانیت جو کچھ عرصے سے اس کے اندر سو رہی تھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ وہ دن رات شاردا کے بارے میں سوچنے لگا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ شاردا جیسی عورت کے بغیر زندہ رہنا کوئی زندہ رہنا نہیں۔ وہ جوانی کی عمر گزار چکا تھا لیکن حسین عورت کے لیے اس کی بھوک اب بھی جوانوں جیسی تھی۔ اس بھوک نے اسے اس طرح تڑپایا کہ وہ ہر حد پھلانگنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ ایک خرانٹ اور پختہ کار شخص تھا۔ منزل تک پہنچنے کے لیے اس نے بڑی احتیاط سے جال پھیلایا۔ کسی کو شبہ تک نہیں تھا کہ باڑی والا وجے کی پتنی پر دانت تیز کیے بیٹھا ہے۔ لہٰذا جب ایک روز وجے ٹریفک کے حادثے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو کسی نے نہیں سوچا کہ یہ ایک قتل ہے اور اس قتل میں باڑی والا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ وجے ٹیچر تھا۔ اسکول میں پڑھا کر

واپس آرہا تھا کہ ایک ٹیکسی کار اسے روندتی ہوئی گزر گئی۔

وجے کی ناگہانی موت کے بعد باڈی والا نے چند مہینے صبر و سکون سے انتظار کیا۔ وہ ایک ماہر شکاری تھا اور ماہر شکاری انتظار کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ جب وجے کی موت کا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور بیوی کی بہتی آنکھیں بھی خشک ہونے لگیں تو باڈی والا نے بڑی شرافت کے ساتھ شاردا کے لیے پیام بھجوا دیا۔ شاردا ایک ہندو لڑکی تھی اور اکثر ہندو گھرانوں میں بیوہ کی دوسری شادی ایک ناپسندیدہ کام ہوتی ہے۔ شاردا کے سلسلے میں بھی یہ رکاوٹ سامنے آئی۔ دوسری طرف شاردا خود بھی اس شادی پر رضامند نہیں تھی...... لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ وہ رضامند ہو گئی...... اُس کے اچانک رضامند ہونے کے پیچھے ایک راز تھا اور وہ راز یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہونے والے ظلم سے آگاہ ہو چکی تھی۔ عورت کی چھٹی حِس کئی معاملوں میں مرد سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی طرف اُٹھنے والی بدنظر کو بہت جلدی بھانپ لیتی ہے۔ شاردا کے ذہن میں بھی پہلے روز سے ایک شبہہ تھا۔ پھر جب باڈی والا کی طرف سے اس کے لیے ''پیام'' آیا تو یہ شبہہ ایک کونپل سے درخت بن گیا۔ شاردا نے اپنے طور پر جستجو کی اور ایک روز اس پر وہ خوفناک ''انکشاف'' ہو گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ باڈی والا کا ایک پرانا ساتھی شاردا کے حسنِ دلفریب کے جال میں الجھ گیا اور اس نے بتایا کہ شاردا کے پتی وجے کو کچلنے والی ٹیکسی نہیں تھی۔ بلکہ وہ ہوس تھی جو بدکردار مرد کے ذہن میں اَزل سے پیدا ہوتی رہی ہے اور پروان چڑھتی رہی ہے۔

شاردا کے اندر انتقام کا جوالا مکھی بھڑک چکا تھا۔ اس نے باڈی والا سے شادی کی ہامی بھر لی۔ جس روز اس کی مانگ میں دوسری بار سیندور بھرا گیا اور وہ باڈی والا کے گھر واقع ایشور کالونی میں اُتری اس روز وہ ایک عورت نہیں ناگن تھی۔ جو اپنے ''جوڑے'' کی موت کا بدلہ لینے ایک شکاری کے آنگن میں اُتری تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آگ تھی۔ اس کے سینے میں دل نہیں دہکا ہوا انگارہ تھا۔ وہ سراپا قہر تھی لیکن اس کا قہر پہاڑی ندی کی طرح پُرشور نہیں تھا۔ وہ ایک نیلا سمندر تھا جو اوپر سے پُرسکون اور نیچے سے بلاخیز ہوتا ہے۔

شاردا کے انتقام نے سب سے پہلے باڈی والا کی جوان بیٹی ہیما کو ڈسا۔ اس نے ہیما کے ناپختہ جذبات کو بھڑکایا اور محلے کے ایک نوجوان پریتم سے اس کی یاری لگوا دی۔ وہ خود اُن کے رقعے ایک دوسرے کو پہنچاتی رہی اور ان کے مل بیٹھنے کا انتظام کرتی رہی...... یہاں تک کہ باڈی والا کی لاڈلی ہیما اس کے منہ پر بدنامی کی کالک مل کر گھر سے بھاگ گئی۔ یہ باڈی والا کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ ہیما کے بعد

شاردا کی نگاہِ انتقام باڈی والا کے جواں سال بیٹے بسواجیت پر لگ گئی۔ ایک موقعے پر اس نے بسواجیت کو ان لڑکوں کے ہاتھوں قتل کروانے کی کوشش کی جنہوں نے اس کی بہن کو اغوا کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پریتم کبھی کبھار ''صاحب ہوٹل'' میں آ کر بیٹھتا ہے۔ ایک روز جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں موجود تھا شاردا نے بسواجیت کو اطلاع دے دی۔ بسواجیت ''صاحب ہوٹل'' جا کر ان لڑکوں سے لڑ پڑا۔ اسے چاقو کے زخم لگے اور میں نے اسے شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا۔ بدلے کی آگ نے شاردا کے اندر کی عورت کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اب وہ صرف ایک ناگن تھی۔ ''صاحب ہوٹل'' کی لڑائی میں بسواجیت کا ٹخنہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ گھر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی قید کے دوران شاردا نے ایک ایسا کھیل کھیلا جو اس واردات میں سب سے گھناؤنا اور خطرناک تھا۔ اس نے ایک ناگن کی طرح اپنی آنکھیں نوجوان بسوا کی آنکھوں میں ڈال دیں اور اسے اپنے جلوؤں سے مسحور کر کے گمراہی کی طرف کھینچنے لگی۔ وہ سرتاپا گناہ تھی اور کسی ہوائی مخلوق کی طرح بسوا کے اعصاب پر سوار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گو وہ بسوا سے دور تھی لیکن ان کا سایہ ہر وقت بسوا کو ڈھانپے رکھتا تھا۔ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ ''رستم اور سہراب'' کی طرح باپ بیٹے کو اک دوجے کے خون کا پیاسا کر دینا چاہتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ گھر کے آنگن میں بکھرتی ہوئی چنگاریاں گھر کے مالک کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکیں۔ باپ بیٹے کے درمیان شکوک و شبہات کی دیوار کھڑی ہونے لگی اور پھر ایک روز یہ لاوا پھٹ پڑا۔ باڈی والا نے نوجوان بیٹے کو بدترین ناموں سے پکارنے کے بعد گھر سے نکال باہر کیا۔ سرد رات' سینے میں گرم خون جوش مارتا ہوا' دماغ میں زہریلا دھواں۔ بیٹا گھر سے نکل کر ایک چوک میں جا بیٹھا اور اپنا لائحہ عمل سوچنے لگا......

اس طویل سوچ بچار کا جو نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ آدھی رات کے بعد بیٹا دیوار پھاند کر پھر گھر میں گھسا اور باپ کی کار میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ علی الصبح باڈی والا حسبِ معمول سیر کے لیے نکلا...... راستے میں چلتی کار کے اندر باپ بیٹے میں جنگ ہوئی اور بسواجیت اپنے ہی ریوالور کی گولی لگنے سے جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس لڑائی کے ثبوت میں باڈی والا کے کچھ بال بسواجیت کی مٹھی میں رہ گئے تھے۔ شاردا ایک ناگن تھی اور اس ناگن کا انتقام پورا ہو چکا تھا۔ باڈی والا کی بیٹی گھر سے بھاگ چکی تھی۔ چھوٹی بیٹی کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ بیٹا باپ کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا اور باپ بیٹے کے قتل میں پھانسی کا حقدار ٹھہر چکا تھا...... اس انتقام کو آگے بڑھانے میں اور باڈی والا کے انجام کو مزید عبرتناک کرنے میں حالات نے بھی شاردا کا ساتھ دیا۔ ہیما جو گھر سے بھاگ گئی تھی شرافت کی آخری سیڑھی سے بھی گر گئی۔ ''صاحب

ٹل'' میں ہونے والی لڑائی کے بعد پریتم خوفزدہ ہو کر کراچی بھاگ گیا اور ہیما جالندھر کے
ب سیکنڈ کلاس ہوٹل میں بے آسرا پڑی رہ گئی۔ وہاں وہ ایک بے ضمیر پراپرٹی ڈیلر کے ہتھے
ھ گئی۔ جس نے کئی روز اسے اپنے پاس رکھنے اور بے آبرو کرنے کے بعد ایک غنڈے کے
ھ فروخت کر دیا۔ یوں وہ بکتی بکاتی اسی جگہ پہنچ گئی جہاں اکثر گمراہ لڑکیاں پہنچتی ہیں......
ردا اور باڈی والا کی گرفتاری کے دو روز بعد ہم نے ہیما کو لاہور کے ایک چکلے سے بری
لت میں برآمد کیا۔ وہ ایک ایسے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح تھی جو ہوا کے ذرا سے
و نکے سے بکھر سکتا تھا۔

یہ انجام تھا اس شخص کا جو خود کو باتدبیر سمجھتا تھا اور اپنی عقل کے زور پر اس نے ایک
رت کو ہوس کی زنجیر پہنانے کی کوشش کی تھی...... یہ انتقام تھا اس عورت کا جس نے ہوس کی
بر توڑی تھی اور قہر بن کر ظالم کو خاکستر کر دیا تھا۔

کالی پورا کے مکان میں لالو راجہ شاردا کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ اس کے سینے اور پیٹ
ہری کے پانچ زخم آئے تھے۔ یہ حقیقت تھی کہ شاردا نے باڈی والا کو جان بوجھ کر چھوڑا تھا
، وہ جس طرح اچانک ایک تاریک کمرے سے نکل کر ان دونوں پر حملہ آور ہوئی تھی' ان
ں کی جان لے سکتی تھی۔ وہ دونوں شاردا کی جان لینے آئے تھے لیکن الٹی چھری ان پر چل
ھی۔ ایک جان سے گیا تھا اور دوسرا جان لیوا طور پر زخمی ہوا تھا۔ نہ ان کی مردانگی کام آئی
اور نہ وہ طاقتور رائفل جسے ماضی کا نامور بدمعاش ''باڈی والا'' بڑے غرور سے اُٹھائے
تھا۔

اس کیس کے گرفتار شدہ مجرموں میں استھان کے چھوٹے اور بڑے مہاراج بھی شامل
۔ طویل عدالتی کارروائی کے بعد دونوں ''مہاراجوں'' کو مختلف دفعات کے تحت سات
ت برس قید بامشقت کی سزا ہوئی اور ان کے استھان کی زمین سرکاری کنٹرول میں دے
ی۔ لالو راجہ کے قتل اور دیگر جرائم میں شاردا کو بارہ سال قید بامشقت اور باڈی والا کو عمر
ا سزا ہوئی۔ یہ واقعی عمر قید تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جیل سے زندہ سلامت نکل بھی آیا
ز پچھتاوے کی دہکتی زنجیروں نے اسے ساری عمر جکڑے رکھا ہوگا۔

☆=====ختم شد=====☆